اسلام اور مستشرقین

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

دارالمصنفین ، شبلی اکیڈمی ، اعظم گڑھ (۲۷۶۰۰۱)

اسلام اور مستشرقین

جلد سوم

فروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے بعد اب اسی موضوع پر ارباب علم کے جو مقالات موصول ہوئے یا یہاں کے رفقا نے لکھے وہ اس میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو، پی)

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر: ۱۵۸

نام کتاب	:	اسلام اور مستشرقین (جلد سوم)
مصنف	:	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
صفحات	:	۳۶۴
ایڈیشن	:	۲۰۱۲ء
مطبع	:	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
ناشر	:	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو، پی) انڈیا
قیمت	:	۱۵۰/روپے
باہتمام	:	عبدالمنان ہلالی

ISBN: 978-93-80104-93-5
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O. Box No : 19
Shibli Road, Azamgarh - 276 001 (U.P.)
e-mail: shibli_academy@rediffmail.com
website : www.shibliacademy.org

فہرست مقالات

اسلام اور مستشرقین

جلد سوم

دیباچہ

اس وقت ہمارے ناظرین کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے وہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے سلسلۂ اسلام اور مستشرقین کی تیسری جلد ہے جو بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس سلسلہ کی چوتھی اور پانچویں جلد کے بعد شائع ہو رہی ہے، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی میں ۱۹۸۲ء میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا اس میں جو مقالات پڑھے یا پیش کیے گئے تھے، وہ تو دوسری جلد میں شائع کر دیے گئے ہیں لیکن اس سمینار کے بعد جو مقالات معارف میں چھپنے کے لیے آئے یا معارف کے لیے ہمارے رفقا نے لکھے، وہ اس تیسری جلد میں جمع کر دیے گئے ہیں، ان کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم نے حضرت ابراہیمؑ اور مستشرقین کے عنوان سے قصص القرآن میں جو مضمون لکھا تھا وہ بھی اس میں ہے، ایک بار پھر یاد دلا دیں کہ ان جلدوں کی ترتیب کے وقت یہ خیال آیا کہ اس موضوع پر اردو اور عربی میں جو اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں ان کو جمع کر کے الگ الگ جلدوں میں شائع کر دیا جائے تو یہ ایک مفید کام ہوگا، اس سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے جو کچھ لکھا تھا وہ چوتھی جلد میں ہے اور اس کی پانچویں جلد میں وہ مضامین ہیں جو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مستشرقین کے متعلق لکھے تھے، اس کی چھٹی جلد بھی زیر طبع ہے، اس میں وہ مضامین ہیں جو ہندوستان کے اندر اردو میں لکھے گئے یا جو عربی سے خاص طور پر ترجمہ کرائے گئے اور اسی طرح ساتویں جلد کی اشاعت کا بھی خیال ہے اور اگر ممکن ہوا تو ان جلدوں میں اور اضافہ کیا جائے گا۔

اب تک اردو میں ایسے لٹریچر بہت کم تھے، ان جلدوں میں کافی مواد آ گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ مستشرقین نے اسلام کے خلاف اپنی زہریلی تحقیقات کا ایک انبار لگا دیا ہے اور مستقبل میں بھی وہ اس سے زیادہ ڈھیر لگا دیں گے، ان سب کا تو جواب دینا ممکن نہیں، گو ایک بیدار اور ترقی کرنے والی قوم کا یہی شیوہ ہونا چاہیے کہ اس کے معاند اور ناقد اس کے مذہب کے خلاف جو زہر پھیلائیں اس کا تریاق پیش کرتے رہیں، مگر ان مستشرقین کے لٹریچر کے انبار سے گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں، کیوں کہ پرانے مستشرقین جو کچھ لکھ گئے ہیں انہی کو نئے مستشرقین اپنے خاص ماہرانہ انداز میں دہراتے رہتے ہیں، اگر ہمارے ناظرین ان کے گمراہ کن معلومات، دوراز کار تاویلات اور متضاد و متناقض تلبیسات کی دو چار باتوں سے بھی واقف ہو جائیں تو ان کے انداز فکر، طریقۂ بیان اور طرز تحریر کے مکروفریب سے اپنے ذہن کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہیں گے، دارالمصنفین سے جو یہ جلد شائع ہو رہی ہے ان سے ہمارے ناظرین کو اسی قسم کی مدد ملے گی، امید ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو مستشرقین کی بظاہر پراز معلومات تحقیقات سے متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے ان جلدوں کا مطالعہ بڑا کارآمد ہوگا۔

اس سلسلہ کی ترتیب میں ہمارے رفقا مولوی ضیاء الدین اصلاحی، مولوی عبیداللہ کوثی ندوی، حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی اور مولوی عبدالباری مصحح سے ہر طرح کی مدد ملی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

یکم دسمبر ۱۹۸۶ء
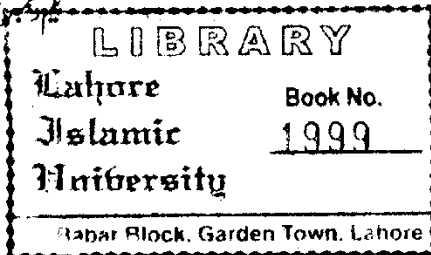
ہدایات ربانی

اور کافر لوگ ناحق کی باتیں پکڑ پکڑ کر جھگڑے نکالتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ سے حق بات کو نیچا دکھائیں اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا تھا، اس کو دل لگی بنا رکھا ہے اور اس سے زیادہ ظالم کون ہو گا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے، پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور جو کچھ اپنے ہاتھوں (گناہ) سمیٹ رہا ہے، اس (کے نتیجہ) کو بھول جائے، ہم نے اس حق بات کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اور اس کے سننے سے ان کے کانوں میں ڈاٹ (دے رکھی) ہے اور اگر آپ ان کو راہ راست کی طرف بلائیں تو ایسی حالت میں وہ ہرگز راہ راست پر نہیں آئیں گے۔ (کہف: ٥٦-٥٧)

اور آپ سے یہود و نصاریٰ کبھی خوش نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) ان کے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جائیں، آپ صاف کہہ دیجیے کہ حقیقت میں تو ہدایت کا راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے۔ (البقرہ: ١٢٠)

تم یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بنانا، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا تو وہ ان ہی میں سے ہو گا۔ (مائدہ: ٥١)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روسی استشراق

از

جناب محمد اسد شہاب صاحب جدہ سعودی عرب
مترجمہ: مولوی عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنّفین

جب استشراق اور مستشرق کے الفاظ کو مطلقاً بولا جاتا ہے تو ذہن مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کی جانب منتقل ہو جاتا ہے، حالانکہ استشراق پر کسی قوم یا حکومت کی اجارہ داری نہیں ہے، مشرقی یورپ کی کمیونسٹ حکومتوں اور روس کا بھی اس میں نمایاں حصہ ہے، یہاں کے لوگوں نے اسلامی امور و مسائل کی جانب جس قدر اعتنا کیا ہے وہ کسی طرح مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین سے کم نہیں ہے۔

بہت سے عرب اور مسلمان مصنفین نے یورپی استشراق و مستشرقین کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں مگر روس یا مشرقی یورپ کے استشراق اور مستشرقین کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس مضمون میں روسی استشراق کی ابتدا اور نشو ونما کا ذکر کیا جائے گا۔

استشراق کا دائرۂ کار اور طریقِ عمل جدا جدا ہوتا ہے مگر اس کا خاص رخ اور مطمح نظر مخصوص مصالح و مقاصد پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اس کا معاملہ کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی ہوتا

ہے، نیز کبھی وہ کسی حکومت کے زیر سایہ اپنے فرائض انجام دیتا ہے، ایسی صورت میں اس کے لیے مخصوص بجٹ بنایا جاتا ہے اور وہ کبھی اپنی حکومت کی ملکی و سیاسی مصلحتوں سے بے تعلق نہیں رہتا۔

پہلے زار روس اور اب کمیونسٹ روس کی وسط ایشیا میں کئی نوآبادیاں ہیں، جیسے ازبکستان، تاجکستان، قزاقستان، ترکستان، کریمنستان وغیرہ، یہ سب مسلم ریاستیں ہیں جن کی مجموعی آبادی ایک سو بیس ملین سے کم نہ ہوگی، یہ تمام ریاستیں معدنی ذخائر، پٹرول اور زرعی پیداوار سے مالا مال ہیں، موجودہ روسی سامراج کی اہمیت ان ہی زرخیز ریاستوں سے وابستہ ہے، اگر یہ اس کے قبضہ سے نکل جائیں تو پھر روس کا کوئی سیاسی وزن باقی نہیں رہ جائے گا۔

روس ایک سامراجی حکومت کی طرح ان ریاستوں پر حکومت کر رہا ہے، اس نے اپنی داخلی و خارجی سیاست کے استحکام کے لیے ان ریاستوں کو زیادہ اہمیت دینے کی پالیسی وضع کی ہے، اس لیے وہ ان ریاستوں کے مسلمانوں کی جانب خاص توجہ مبذول کیے ہوئے ہے اور ان کے عقائد و افکار، تہذیب و ثقافت اور جذبات و میلانات کا بھی برابر مطالعہ کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی استعمار پر مبنی سیاست بھی مضبوط و مستحکم رہے اور کسی بیرونی یا اندرونی مسلم مداخلت کا اندیشہ بھی نہ رہے۔

روسی استشراق میں سیاسی مصالح کے تحت تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے تاکہ وہ اپنی ان وسیع و عریض اور شاداب و زرخیز نوآبادیوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھاتا رہے، دراصل روس استشراق کے معاملہ میں وہی طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے جس پر ہالینڈ گامزن رہ چکا ہے، اس بنا پر وہ اپنی تحقیق و مطالعہ و علمی اداروں کو ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے جن سے اس کے اصل مقاصد پر پردہ پڑا رہتا ہے اور کہیں سے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ان علمی و تحقیقی کاموں کے پس پشت کچھ دوسرے اغراض بھی ہیں، ہالینڈ نے تو استشراق کا لفظ بھی باقی نہ رکھا اور اس کے بجائے "اسلامی امور کی کونسل کا دفتر" نام رکھ کر اپنی استشراقی سرگرمیاں

جاری رکھیں، ناموں کے انتخاب میں روس نے بھی اسی اصول کو اپنایا ہے، اس کے مختلف اداروں کے کچھ نام ملاحظہ ہوں:

(۱) **معهد فنون شرقية** (انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل آرٹس) (۲) **مكتب شئون اسلامية** (آفس آف اسلامک افیرز) (۳) دارالافتاء (۴) مشرقی علوم کے ادارے (۵) **جمعية اتحاد العلوم** (۶) روس عرب فرینڈشپ سوسائٹی (۷) **معهد الدراسات العليا للشئون الاسلامية** (انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسٹڈیز فار اسلامک افیرز) (۸) ادارہ دینیہ برائے امور اسلامیہ۔

اسی طرح کے خوبصورت اور جاذب نظر ناموں کے پردے میں مستشرقین اور اسلامی امور کے ماہرین اپنے کارنامے انجام دینے میں مصروف ہیں۔

۱۸۵۲ء میں زار روس نے روسی مستشرقین اور عربی زبان کے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل کی جس کے بیشتر اراکین یہودی تھے، اس کمیٹی کا بنیادی اور اولین مقصد ان ضروری و لازمی وسائل کی فراہمی تھا جن کے ذریعہ بیت المقدس کو آزاد کرایا جا سکے اور فلسطین میں یہودی مہاجرین کو آباد کرا کے روسی وفد کے زیر انتظام ان کے مریضوں کے لیے شفا خانے قائم کیے جائیں، روسی نمائندوں نے بیت المقدس کو اپنا مرکز یہ کہہ کر بنایا کہ وہ وہاں روسی گرجا گھروں کی دیکھ بھال کریں گے، کیوں کہ وہاں ایسے مسیحی بھی تھے جو روسی آرتھوڈکس مسلک کے پیرو تھے نیز ان کی زیر نگرانی مختلف انسٹی ٹیوشن تھے۔

۱۸۶۴ء میں روس نے اس کمیٹی کے ممبروں کا ایک وفد خفیہ طور پر فلسطین بھیجا تاکہ یہ لوگ وہاں کے یتیم خانوں (آشرم) دواخانوں اور ان یہودی زائرین کی رہائش گاہوں کا جائزہ لیں جو دیوار گریہ کی زیارت کے لیے پوری دنیا سے وہاں آتے ہیں۔

۱۸۸۲ء میں یہ کمیٹی ایک خودمختار سوسائٹی میں تبدیل ہوگئی، اس کا ایک بنیادی ضابطۂ اصول بھی مرتب ہوا، اس طرح ارتقا کا ایک مرحلہ طے ہوا، یہ تبدیلی محض نام کی تبدیلی

نہیں تھی بلکہ اب دائرہ کار بھی وسیع تر ہوا اور ایک معینہ مدت میں اس سوسائٹی نے فلسطین اور بعض دوسرے عربی ممالک میں سو سے زیادہ اسکول قائم کر لیے، ان کے دروازے گو سب نو واردوں کے لیے کھلے تھے لیکن اکثریت یہودیوں ہی کی تھی، ان اسکولوں کے نام قومی اور وطنی ناموں پر تھے، ان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد اس وقت دس ہزار سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

۱۸۸۳ء میں اس سوسائٹی نے سوسائٹی آف اسلامک اسٹڈیز کی حیثیت اختیار کر لی اور اپنا تعلق ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات (اسلامک اسٹڈیز) سے قائم کر لیا، سوسائٹی نے اس مقصد کے لیے ایک خاص علمی باڈی کی تشکیل کی جس میں اسلامی تحقیق و مطالعہ سے شغف رکھنے اور عربی و اسلامی تاریخ و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو شامل کیا گیا۔

۱۸۹۱ء میں اس سوسائٹی نے ارکیولوجک مشن (بعثت اثریہ) کے نام سے عرب ملکوں کی زیارت کے لیے ایک وفد بھیجا تا کہ یہ فلسطین میں قیام کر کے وہاں کے آثار قدیمہ کا جائزہ لے۔

اس وفد نے دمشق، بیروت، حمص، حلب، حماۃ، مشرقی طرابلس، بیت المقدس اور خلیل کا دورہ کیا اور ایک لمبی مدت تک بیت المقدس میں ان آثار علمیہ کی تحقیق و مطالعہ میں مصروف رہا جن کا تعلق یہودیوں سے تھا، یہ یہودیوں کے قومی وطن کو منصۂ شہود پر لانے اور اسے تاریخی دلائل سے ثابت کرنے کی تمہید تھی، وفد اس موضوع پر اپنی مکمل رپورٹ اور دستاویزات کے ساتھ ماسکو واپس آیا اور آنے کے ساتھ ہی اس نے اسلامیات کے فضلا و ماہرین کا ایک اجتماع کیا، اس میں روسی مستشرقین کی ایک سوسائٹی کی تجویز منظور کی گئی، اس سوسائٹی کو روس کی اکاڈمی آف سائنسز کا تعاون بھی حاصل ہوا، اس سوسائٹی میں مندرجہ ذیل روسی مستشرق شریک ہوئے:

(۱) ایف، ایس سیکوروف (۲) جے جے کراسکوفسکی (۳) اے، این بوتشیف (۴) ایس، بی ٹالسٹوف (۵) ایف، ایف، بیلیفو مینکایا، مؤخر الذکر دونوں حضرات اکاڈمی

آف سائنسز کے بھی ممبر تھے۔

روسی مستشرقین کی یہ پہلی سوسائٹی تھی جو سرکاری طور پر اکاڈمی آف سائنسز کے تابع تھی، اس سوسائٹی کا پہلا خاص مقصد عرب ممالک اور عرب قوموں سے متعلق ہر ہر چیز کا مطالعہ تھا، اس کے بعد پھر مسلمانوں کا دینی، معاشرتی، ثقافتی، تاریخی اور اقتصادی جائزہ لینا تھا۔

اکاڈمی آف سائنسز کے اہم فرائض میں یہ بھی تھا کہ وہ علوم اسلامیہ کے خصوصی ماہرین کو تیار کرے، تاکہ وہ آئندہ روسی مستشرقین کی سوسائٹی میں داخل ہو سکیں اور ان کے اغراض ومقاصد میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔

ان امور ومسائل کو روس نے جن مختلف اسباب وعوامل کی بنا پر اس قدر اہمیت دی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ روس اور استنبول کی خلافت اسلامیہ کے درمیان پشتینی عداوت اور دیرینہ آویزش جس کی وجہ سے ترکی وروس میں مسلسل جنگ برپا تھی۔

۲۔ روس کی اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں کی جانب سے بغاوت کا خطرہ۔

۳۔ روس کے توسیع پسندانہ عزائم جس نے اسے پڑوس کے دولت مند علاقوں کا حریص بنا دیا تھا اور وہ بحر ابیض، متوسط، خلیج عرب اور بحر عرب تک پہنچ جانے اور عالمی بحری گزرگاہوں پر قابو پانے کی فکر میں لگ گیا تھا۔

۴۔ وسط ایشیا میں مسلمانوں کو دبائے رکھنا تاکہ وہ بغاوت نہ کر بیٹھیں۔

۵۔ روسی سیاست کی طرف عالم اسلام کو متوجہ کرکے اس کے لیے ہمدردی اور تائید حاصل کرنا، ان اغراض کے پیش نظر روس نے عرب مسلمانوں سے متعلق ایک ایک چیز کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

یہ سوسائٹی ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی، اس لیے اس نے ۱۹۷۲ء میں اپنے قیام کے نوے برس گزر جانے کا جشن منایا، یہ جشن انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے مرکز میں

یکم مئی کو منایا گیا، یکم مئی کو روسی مزدوروں کی عید کے دن کی حیثیت حاصل ہے، اس موقع پر مستشرق ایس، ایل، میتھفسکی نے جو سوسائٹی کے صدر بھی تھے ایک جامع رپورٹ پیش کی، جس میں اس سوسائٹی کی نوے سالہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا تھا، اس رپورٹ میں جو چیز نہایت اہم ہے وہ اس بات کا اقرار ہے کہ اس سوسائٹی نے فلسطین میں یہودیوں کے تاریخی آثار کی حفاظت اور مرمت میں نمایاں خدمات انجام دیں سوویٹ روس نے روسی مفاد کے پیش نظر معاشی ترقی میں عربوں کے ساتھ قربت اور ہم آہنگی میں جو پیش رفت کی، اس میں اس سوسائٹی کے کردار کو بھی اہمیت حاصل رہی، اس تقریب میں مستشرق کے، بی اسٹارکوفا نے عالم اسلام کو اپنا موضوع بنایا، مستشرق ایم، اے کورسٹوفتسیف نے ''مصر میں قدیم فرعونی مذاہب اور توریت وزبور سے ان کا تعلق'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا، مستشرق ایل، وائی، ناری راوزی نے ''عرب وروس تعلقات، تاریخ اور واقعات کی روشنی میں'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

یہ سوسائٹی مختلف اوقات میں سمیناروں، کانفرنسوں اور کانگریسوں کا اہتمام کرتی رہتی ہے، ان موقعوں پر پڑھے جانے والے تمام مقالات کی طباعت واشاعت کا انتظام بھی اسی سوسائٹی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

چند روسی مستشرقین کے نام اور عہدے: (۱) یوبوجان غوروف، ہیڈ آف دی انسٹی ٹیوٹ ماسکو (۲) بوغولوف ماہر فقہ اسلامی (۳) یوبی، کایا، ماہر ادب عربی (۴) کریز بیفنیج، ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف لینن گراڈ اور ماہر ادب عربی وتاریخ اسلامی (۵) غالیدوف، ماہر ادب عربی (۶) غرونفسٹ ماہر بلاغت ونحو (۷) میخائیلوف ماہر ادب عربی (۸) بیوتوفسکی، ماہر تاریخ یمن (۹) یوشاکوف، ماہر سیاسیات ومعاشیات (۱۰) سفقیلا فا ماہر ادب عربی ومذاہب (۱۱) بردودروف ماہر ادب عربی، مذاہب اسلامیہ وسیاسی تحریکات (۱۲) شوموسکی، ماہر جغرافیہ وعلم البحار (۱۳) کلیموش، ماہر فقہ وتاریخ اسلامی (۱۴) نشانوف، ماہر فقہ اسلامی (۱۵) کلیموفتیش،

سوسائٹی کے ترجمان کے مدیر اعلیٰ (۱۶) سیلیا بیف، اسی ترجمان کے علمی مدیر (۱۷) اسلی نیفیاد (۱۸) پاریوسکایا (۱۹) نالیری ٹارسیس، ادیب ونقاد (۲۰) الیکز نڈر سٹین ودلپین، فلسفی وشاعر (۲۱) یوری بشین (۲۲) یوری غلاسوف، عربی زبان کے ادیب وانشا پرداز (۲۳) یوری بسوف (۲۴) فلادیمیر میکسی موف، عربی زبان کے انشا پرداز (۲۵) اغناز یوسیلوف (۲۶) ایلینا عروس (۲۷) غیانزکار یوفیغوریلی (۲۸) تخفیسکی صدر سوسائٹی (۲۹) کوروسغنیتسیف، ماہر تاریخ عربی (۳۰) نادرادیزنی، علوم وتاریخ اسلامی کے پروفیسر (۳۱) سافاروف (۳۲) اسارکووا (۳۳) میخائل بیڈروف (۳۴) گریگوری سرباٹوف۔

یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مستشرق میخائل بیڈروف جو ایک یہودی الاصل اور صہیونی العقیدہ مستشرق ہیں، اصل میں کون ہیں؟ یہ دوسری جنگ عظیم میں روسی فوج کے ایک کیپٹن تھے، بعد میں یہ چیکوسلواکیہ میں فوج کو ترتیب دینے چلے گئے، دوسری جنگ عظیم کے بعد روس نے ان کو ایک عرب ملک میں اپنا سفیر مقرر کیا، یہ انتہائی متعصب صہیونی مستشرق ہیں، روس سے یہودیوں کو فلسطین کی جانب منتقل کرنے کے پیچھے اصل دماغ ان ہی کا تھا، ۱۹۳۵ء میں انہوں نے ارقون زوامی لومی نامی ایک جماعت قائم کی جو بعد میں اسرائیلی فوج کا ایک حصہ بنی۔

ادارۂ اقوام ایشیا: اس ادارہ کا مقصد بھی وہی ہے جو سوسائٹی کا ہے، البتہ یہ ادارہ ان تمام مقالات کو جو مستشرقین روس کا حاصل مطالعہ اور نتیجۂ تحقیق ہوتے ہیں، جانچنے اور پرکھنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور انہی مقالات کی روشنی میں عرب اور اسلامی ممالک کے بارے میں روس کی خارجہ پالیسی اپنا طریقہ کار اختیار کرتی ہے اس ادارہ کو نامور روسی مستشرقین کے تحت رکھا جاتا ہے، مثلاً افنی بلیلیف، فلاڈیمیر ٹوسکی، گریگوری سربانوف، بورس دالسنیغ فلاڈیمیرتس بیولیسکی، فرونیکا فوروتیسا، اس ادارہ نے عرب ممالک سے متعلق چند کتابیں بھی شائع کی ہیں، مثلاً سوریا ولبنان (۱۹۶۴ء) جزیرۂ عرب وخلیج

(۱۹۶۵ء) لیبیا (۱۹۶۵ء) عراق (۱۹۶۶ء) مصر (۱۹۶۷ء)، ان کتابوں میں مذکورہ ممالک کا انتہائی تفصیل وتحقیق سے جائزہ لیا گیا، اس جائزہ کی ابتدا ان ممالک میں اسلام کے داخلہ کے وقت سے ہی شروع ہوتی ہے، ان کتابوں میں مذہبی رجحانات، فقہی مسالک، عام عقائد، مذہبی اختلافات، لوگوں پر ان کے اثرات، حکومت اور سیاسی تعلقات پر ان مذہبی اختلافات کا اثر، حکومتوں کی خوبیاں اور خامیاں وغیرہ مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، اسلامی حکومتوں کے کمزور پہلوؤں پر روس اپنی سیاست کو مرکوز کر دیتا ہے، مذہبی اختلافات کے پردہ میں روس کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ وہ مذہبی جذبات اور دینی احساسات کو برانگیختہ کرنے والے پروگرام اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی آگ شدید ہو، یہ سب اس خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کی خبر تک نہیں ہو پاتی، باہمی اختلافات اور دشمنی بڑھنے کی وجہ سے روس کے لیے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے حلقوں میں اپنا اثر ورسوخ بڑھائے اور بزعم خود نئے انقلاب پسند طبقہ اور رجعت پسندوں کے مخالف افکار کو ان حلقوں کے فکر وعمل کی زینت بنائے۔

لینن گراڈ کا کتب خانہ: روس میں جتنے کتب خانے ہیں وہ سب استشراقی سوسائٹی سے تعاون کرتے ہیں، مشہور کتب خانوں میں لینن گراڈ کا کتب خانہ ہے، یہ اسلامیات کے بارہ ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے، خوش قسمتی سے یہ کتب خانہ کمیونسٹوں کے قبضہ کے وقت ان کے دست برد سے محفوظ رہا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب بربادی کے بعد اتنی بڑی تعداد محفوظ رہی تو وہ کس قدر نایاب اور وافر ذخیرۂ کتب رہا ہوگا جسے سپرد آتش کر دیا گیا، مخطوطات کے علاوہ مطبوعات کی بھی ایک بڑی تعداد اس کتب خانہ میں ہے جن میں عالم اسلام اور غیر عالم اسلام کی ہر زبان میں چھپنے والی کتابیں شامل ہیں، روسی قوم کو ان کتابوں کے مطالعہ کی اجازت نہیں ہے لیکن مستشرقین کو ان کتابوں سے مراجعت و استفادہ کا حق حاصل ہے۔

مستشرق گریگوری سرباٹوف کے بیان کے مطابق تاشقند کے کتب خانہ میں اس وقت اسی ہزار اسلامی کتابیں ہیں جن میں مخطوطات اور مطبوعات دونوں شامل ہیں، یہ کتابیں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں ہیں، صرف عربی کتابوں کی تعداد پندرہ ہزار سے کم نہیں، روسی مستشرقین کی محنت اور اسلامیات سے ان کے گہرے شغف کے نتیجہ میں سوسائٹی کی ازبکستان شاخ نے کئی اسلامی کتابوں کو ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۱ء تک روسی زبان میں منتقل کیا اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں روس کی پالیسی دوہری ہے، اندرون ملک مقبوضہ مسلم ریاستوں کے بارہ میں اس کا طرز عمل اس طرز عمل سے قطعی مختلف ہے جو وہ دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ روا رکھتا ہے، اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں میں وہ تشدد اور بیخ کنی کا رویہ اپناتا ہے لیکن ان اسلامی ممالک میں جہاں اس کا نفوذ اور غلبہ نہیں وہ حکومت وقت کے خلاف ہر تحریک کی تائید کرتا ہے، تخریبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے وہ ان تحریکوں کو مادی فلسفہ سے نہ صرف روشناس کراتا ہے بلکہ گرویدہ بھی بنا دیتا ہے، مذہبی اختلافی مسائل کو نمایاں کر کے وہ نئی نسل کو جو ان اختلافات کی سطحیت سے تنگ آ چکی ہوتی ہے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے پرانے نظریات، قومی و وطنی مصلحتوں کے لیے ضرر رساں ہیں، اسلامی نظریات کو جامد اور بے جان ثابت کرنے کی کوشش کے بعد نئی نسل کے سامنے اشتراکیت اور سعادت کی ضامن قومیت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، سوویت روس کی ایسی آماجگاہیں ایشیا اور افریقہ دونوں جگہ ہیں، روس کو یقین ہے کہ اپنے سارے امکانات اور وسائل کے ساتھ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا، اس کے ان سارے منصوبوں کی بنیاد دراصل انہی جائزوں پر ہوتی ہے جن کو روسی مستشرق پیش کرتے ہیں۔

خوبصورت اور شہد آگیں ناموں کے لیبل کے ساتھ سوسائٹی اپنے ان کاموں کو

پیش کرتی ہے، مثلاً کلمة البحث العلمی، الدراسات التطبیقیة وغیرہ، علمی تحقیقات اور معروضی مطالعات کے یہ لیبل محض فریب کے لیے ہوتے ہیں، حقیقت میں یہ اسلامی قوموں کے لیے زہریلے اور خطرناک مواد سے پر ہوتے ہیں، مثلاً مستشرق کلیمووش کی کتاب جس کا نام ''الاسلام نشوءہ ومستقبلہ'' ہے، اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''قرآن کی وہ رائیں جو کائنات، زمین اور آسمان کے بارہ میں ہیں، بالکل ابتدائی ہیں اور سائنس کے منافی ہیں۔''

اس قسم کے بے بنیاد دعوؤں سے لبریز ان تحقیقات میں صرف الفاظ کی کھتونی ہوتی ہے، علمی متانت سے بے نیاز، استہزاوتحقیر، آسمانی مذاہب پر بہتان اور عیب جوئی اور خوردہ گیری کی کثرت ہوتی ہے اور اسلامی شخصیتوں کے لیے صرف حقارت آمیز الفاظ ہوتے ہیں۔

روس کی اکاڈمی آف سائنسز نے مشرقی ادب کے مطالعہ میں تخصیص کے لیے بھی ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس ادارہ میں مشرق کے قصوں، کہانیوں، افسانوں، دیومالائی واقعات، قومی روایات اور فنون لطیفہ کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس ادارہ کے ذمہ دار یہی مستشرق ہوتے ہیں، یہ ادارہ روسی مستشرقین کی تالیفات کو روسی مفاد کے مطابق ترکی، عربی، فارسی، ہندی، اردو اور چینی اور دوسری زبانوں میں شائع کرتا ہے، کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص ملک کے حالات کے مطابق صرف اسی ملک کی زبان میں وہ کتاب شائع کی جاتی ہے، دوسری زبانیں اس کتاب کی قدر و قیمت سے محروم رکھی جاتی ہیں، کلیموچ کی کتاب جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اسی ادارہ نے شائع کی ہے۔

روسی استشراق کی سیاست منزل بہ منزل: روسی استشراق نے اپنے محدود منصوبوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنی سرگرمیوں کو تیز کرنے کا پروگرام بنایا اور مختلف سمیناروں، کانفرنسوں کے ذریعہ انہوں نے اپنی اشاعت کے نئے طریقے اپنائے، یہ سمینار وغیرہ وسط ایشیا کے شہروں میں خاص طور سے منعقد کرائے گئے کہ وہاں اسلام کا نام اب بھی باقی ہے۔

صدی کی سترہویں دہائی میں ماسکو میں ایک عالمی مذاہب کانفرنس ہوئی جس میں تمام مذاہب کی ممتاز شخصیتوں کو مدعو کیا گیا، مقصد یہی تھا کہ دنیا والوں کے سامنے جو یہ کہتے ہیں کہ روس آسمانی مذاہب سے برسرپیکار ہے، یہ ثابت کیا جائے کہ روس مذاہب سے جنگ نہیں کرتا بلکہ وہ آسمانی مذہبوں کی حمایت کرتا ہے جس کی دلیل یہ کانفرنس ہے، اس کانفرنس کے بعد تاشقند میں ایک اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی، ۱۹۷۲ء میں ازبکستان میں مشہور مسلمان فلسفی فارابی کی یاد میں ایک بڑا جشن منایا گیا، ایک جشن ابن سینا کی یاد میں بھی منایا گیا، قزاقستان میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کے دینی ادارہ کی تاسیس کے تیس سال گزر جانے پر بھی ایک جشن کا اہتمام ہوا، امام بخاری کی یاد میں بھی محفل جشن منعقد ہوئی، ان تمام جلسوں، کانفرنسوں اور سیمناروں میں روس کی دعوت پر عالم اسلام کی ممتاز اور مایۂ ناز شخصیتیں شریک ہوتی رہیں، سوسائٹی کی ہدایات پر عمل پیرا روس نے بعض مسلمانوں کا اعتبار بھی حاصل کرلیا تھا کہ اسلام کمیونسٹ نظام حکومت کے سایۂ عاطفت میں خیروعافیت سے ہے اور یہ کہ مسلمان روس میں آزاد و خود مختار ہیں، کانفرنسوں میں شریک ہونے والے مندوبوں سے بھی اس کی شہادت دلائی گئی، روس ان موقعوں پر یہ بھی اعلان کرتا رہا کہ وہ اسلامی آثار و باقیات کی نگہبانی و حفاظت کر کے روس میں اسلام کا نام زندہ کیے ہوئے ہے، نیز وہ مساجد و مقابر کی مرمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا، چنانچہ امام بخاری اور امام ترمذی کی قبروں کی دیکھ بھال بھی اسی نے کرائی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ سائنس اور مذہب کے نام سے شائع ہوتا ہے، اسے روسی مستشرقین کی اکثریت کا قلمی تعاون حاصل ہے، اس رسالہ کے پہلے شمارہ میں اس اسلامی انسٹی ٹیوٹ کے دستور و اغراض و مقاصد یہ تحریر کیے گئے ہیں: (۱) مسلمانوں کے درمیان سے روحانی معنویت کو کمزور کرنا، ان کو ان کے عقائد سے دور کرنا اور ایسے افکار و نظریات کو نشو و نما دینا جو ان کے دین میں شک و شبہ پیدا کردیں

(۲) مسلمانوں میں دلکش مادی چیزوں کو خوبصورت اور جاذب اسلوب میں پیش کر کے فساد پیدا کرنا اور ایسی صورت حال پیدا کر دینا کہ وہ اشتراکیت کے حلقہ بگوش ہونے کے لیے خود بخود آمادہ ہو جائیں، ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے جو اسباب و وسائل اختیار کیے وہ مندرجہ ذیل ہیں: (ا) اسلامی تعلیمات و نظریات کو قدیم، افسردہ اور بوسیدہ ثابت کیا جائے اور اس طرح یہ ظاہر کیا جائے کہ سائنس کے دور میں ان نظریات کا زمانہ کے قدم بقدم چلنا ممکن نہیں رہا، اشتراکی نظریہ اور اس کے مادی فلسفہ کی تائید میں خود مسلمان علما و زعما کے اقوال پیش کیے جائیں کہ تنہا یہی فلسفہ انسان کی خوشحالی کا ضامن ہے اور ان مذہبی اختلافات سے بچاتا ہے جو انسانیت کے لیے مضر اور مسلمانوں کو پسماندگی کی جانب لے جانے والے ہیں، اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کا احیا اس طرح کیا جائے کہ اس تہذیب پر فخر کیا جا سکے اور ہر اس شخص کی تائید کی جائے جو اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کے احیا کا کام کرتا ہو، ایسے مصنّفین کی کتابیں خرید کر انہیں تقسیم کے لیے دوسری جگہوں میں بھیج دیا جائے۔

ان مقاصد اور ان وسائل کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کی یہ کوششیں کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں، ایک روسی صحافی شارلوٹ سایکوسی کا بیان ہے کہ سوویٹ یونین نے سوسائٹی کی تجویز کے مطابق بیرون ملک کے اسلام پر کام کرنے والے غیر مسلم ریسرچ اسکالروں میں مفت تقسیم کرنے کے لیے تو قرآن مجید کے نسخے شائع کیے مگر خود روس کے اندر انہیں تقسیم نہیں کیا گیا، استاذ یوسف فراج لکھتے ہیں:

> ”اسلام کے بارے میں سوویٹ روس کی پالیسی دورخی ہے، اندرون ملک مکمل دشمنی اور بیرون ملک وقتی دوستی، مثلاً تاشقند کے ایک اسلامی ادارہ نے ایک عمدہ کتاب شائع کی جو روس میں اسلام کی زندۂ جاوید یادگاروں کی رنگین تصویروں سے مزین تھی، یہ کتاب بیرون ملک کے ممتاز مسلمانوں

میں تقسیم کی گئی، اس میں ایک مسجد اور مشہور مسلمان احمد یاسفی یا شلیفان
محمد کی قبروں کی تصویریں بھی شامل تھیں لیکن روس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ
دونوں شاندار عمارتیں اب کمیونسٹوں کے لیے بطور ڈاک بنگلہ استعمال ہو رہی
ہیں، روس میں پروپیگنڈہ کے لیے جو لٹریچر شائع کیا جاتا ہے، وہ بجز چند
استثنائی صورتوں کے اکثر روس میں ناپید ہوتا ہے، چنانچہ قرآن مجید کا ایک
نہایت عمدہ ایڈیشن شائع کیا گیا جو غیر ملکوں کے مسلمان فضلا کے پاس
بھیجا گیا مگر وہ خود روس میں عنقا ہی رہا۔"(۱)

قرآن مجید کا یہ نسخہ باوجود تلاش بسیار کے ماسکو میں نہیں مل سکا، قرآن مجید کی طباعت واشاعت ماسکو کے پروپیگنڈے کا محض ایک جزو تھا، قرآن مجید کے بارے میں روسی مستشرقین کے خیالات کا اندازہ اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

"قرآن اپنی ترکیب کے لحاظ سے ایک پیچیدہ کتاب ہے جس میں
عربوں، یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے قصے اور دیو مالائی کہانیاں
بڑی تعداد میں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ، حضرت یوسفؑ، حضرت
یونسؑ اور حضرت عیسیٰ مسیح وغیرہم کے قصے ہی اس کتاب کا بڑا جزو ہیں۔"

"دارنوکا": یہ ادارہ مطالعات آداب شرقیہ کے شعبہ کے ماتحت ہے، یہاں بھی ایشیا کے قصے، کہانیوں، اساطیری روایات اور کلاسیکی ادب پر داد تحقیق دی جاتی ہے اور عربی واسلامی ادب پر ہی خاص طور پر عنایت کی نظر مرکوز کی گئی ہے، لینن گراڈ کے مستشرقین اس ادارہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ۱۹۶۴ء کے بعد سے اس ادارہ نے کئی عربی وفارسی کتابوں کو روسی زبان میں منتقل کیا ہے، تونس، الجزائر، مصر، عراق بلکہ تمام عرب ممالک اور ہندوستان، افغانستان اور ایران کے اہل قلم کی نئی کتابوں کو جن کا تعلق افسانہ، کہانی اور شاعری سے ہو،

---

(۱) انتصار الاسلام، ص ۴۹۔

یہ ادارہ روسی زبان میں منتقل کرتا ہے، عرب مصنفوں میں احسان عبدالقدوس اور توفیق الحکیم کی کتابیں خاص طور سے روسی زبان میں منتقل ہوئی ہیں، ان کتابوں سے روسی مستشرقین اور استشراق نواز طلبہ نے بڑی رغبت کا اظہار کیا ہے، یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ محض ان کتابوں کی علمی وفنی قدر و قیمت ہی ان کی مقبولیت کا سبب نہیں ہوتی بلکہ ان کتابوں کے صفحات کے دریچوں سے جس معاشرہ کی جھلک نظر آتی ہے، افراد کے جو خط و خال سامنے آتے ہیں اور قوموں میں ان قصوں، کہانیوں اور اشعار کا جو ناگزیر اثر ہوتا ہے وہ ان مستشرقین کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے، اسی پر روسی مطالعہ اور تجزیہ کا دارومدار ہوتا ہے۔

بیرونی کتابوں کی حوصلہ افزائی: یہ ادارہ بیرون ملک کے مصنّفین کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دیتا ہے جن میں اشتراکیت کی روح جلوہ گر ہو، مثال کے طور پر انڈونیشیا کے مارکسی ادیب براموِدیا اناننتاتور کی کتابیں شائع ہوتے ہی مکتبوں سے چند مہینوں میں غائب ہوجاتی ہیں، اخباروں اور رسالوں میں ان کتابوں کی مقبولیت پر مضامین لکھے جاتے ہیں، ایک جائزہ کے مطابق یہ معلوم ہوا کہ روسی دائرۂ اثر کے تحت کام کرنے والا ایک ادارہ مکتبوں سے تمام کتابیں خرید لیتا ہے، پھر مؤلف وناشر کے علم کے بغیر جسے مناسب سمجھتا ہے ان کتابوں کو بطور ہدیہ پیش کرتا ہے، ظاہر ہے کہ مؤلف کو اپنی کتابوں کی اس قدر مقبولیت پر فخر ہوتا ہے اور ناشر کو مزید ایڈیشن شائع کرنے کا حوصلہ ملتا ہے، اس طرح ماسکو کو ادبی وسیاسی فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس قسم کی مثالیں دوسری زبانوں کی مطبوعات مثلاً سریانی، کردی، آرمینی، ترکی، عربی وغیرہ میں بھی ملتی ہیں۔

مسلم ممالک کے موجودہ اور مسلسل بحران پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ہر واقعہ اپنے پیش رو واقعہ سے جڑا ہوا ہے اور واقعات کے اس تسلسل میں متعلقہ زبانوں کے رسائل اور اخبارات کا بڑا ہاتھ نظر آتا ہے جو قومیت، مقامی تہذیب اور قدیم تمدن کے تازہ خداؤں کی حمد وثنا کی دعوت دیتے ہیں، پاکستان میں بنگالی قومیت اور

بنگلہ زبان پر حد سے زیادہ فخر کیا گیا، بالآخر بنگلہ تحریک کے زیر اثر بغاوت پھیلی اور ایک ملک دونیم ہوگیا، عرب دنیا میں ہر عرب ملک اپنے محدود و مختصر خطۂ زمین کے گن گا رہا ہے اور ایک زبان، ایک ثقافت اور ایک تمدن ہونے کے باوجود ایک مکمل عربی اکائی کا وجود دشوار نظر آتا ہے۔

جب مسلمانوں میں کوئی رخنہ پیدا ہوتا ہے یا کسی ترقی پذیر قوم میں کوئی دراڑ پڑ جاتی ہے اور اگر یہ رخنے دینی عقائد و مسائل سے متعلق ہوں تو روسی مستشرقین کی نگاہ ان موقعوں کو منتخب کرلیتی ہے اور اپنا اثر دکھانے لگتی ہے۔

۱۹۵۱ء میں روسی مستشرقین کی ایک کانفرنس میں مستشرق سرکوف نے کہا تھا کہ ہماری حکومت کو چاہیے کہ وہ تیسری دنیا یعنی غیر وابستہ ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کو زیادہ اہمیت دے، ظاہر ہے تیسری دنیا کے اکثر ممالک اسلامی ہی ہیں اور ہوا بھی یہی کہ روس نے اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے سازگار ماحول اسی تیسری دنیا کا پایا۔

۱۹۶۹ء کی ایک کانفرنس: جنوری ۱۹۶۹ء میں اکاڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام روسی مستشرقین کی ایک اہم کانفرنس ماسکو میں منعقد ہوئی، اس کا موضوع دینی نفسیات تھا، اس میں عالم نفسیات مستشرق بلاٹونوف نے کہا:

> ’’تدین (مذہب پرستی) کے نفسیاتی مظاہر میں کسی بھی مظہر کی کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ فرد کی ذاتیات باہمی کے حتمی نتیجہ کی صورت میں نمو پاتا ہے، مذہب کا وجود انسانوں میں خوف کا شعور پرورش کرتا ہے اور بیکاری یا فرصت واقعیت سے بعید خیالات کی تخلیق کرتی ہے حالانکہ خیالات کو پاک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس شعور سے لاشعور پیدا ہوتا ہے، یہ نہایت اہم ہے کہ ان عناصر کا سائنسی تجزیہ کیا جائے تاکہ انسان میں مذہبی شعور کی موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا جاسکے۔‘‘

انسان کی طبیعت میں بنیادی مذہبی جذبات کے بارے میں ایک اور ماہر نفسیات مستشرق فوتجیل لکھتے ہیں:

”مذہبی اعتقادات کو ایک ضروری حاجت بنانے میں مذہبی احساسات کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔“

لینن گراڈ کے ماہر نفسیات باؤڈ تجین کا قول ہے کہ:

”مذہب پرستی کا مظہر انتہائی جذباتیت اور ذہنی فساد کے نتیجہ میں صادر ہوتا ہے۔“

کیف کے مستشرق بی، اے، لوبونک کا خیال ہے:

”مذہبی ذہنیت کا انسان دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک تو عالم طبیعی، دوسرا عالم مافوق الطبیعی، ایسے انسان کی مددیوں کی جاسکتی ہے کہ اس کے طبیعاتی تصورات کو تقویت دی جائے اور خیالات کی اصلاح کی جائے۔“

لینن گراڈ کے ایک اور مستشرق ڈی، ڈی ابتکمان کہتے ہیں:

”بنیادی طور پر ایک غیر مذہبی شخص ماحول کے اثرات سے مذہبی ہوسکتا ہے۔“

آر، بوکین کا اعتقاد ہے کہ:

”مذہبی احساسات گرچہ شاذ ہیں لیکن اصل بنیاد یہی ہیں اور انہی پر مذہبی تصورات کی بنیادیں استوار ہیں جو محض وہم اور فریب ہیں، چونکہ دینی احساسات کا مقابلہ احساسات ہی سے کیا جاسکتا ہے، اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس مذہبی شعور کی جگہ دوسرے احساسات کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ بدل دیا جائے۔“

مسلمانوں کے بارے میں مستشرق جاکوبنسکی کے مبلغ علم کا اندازہ اس قول سے ہوسکتا ہے:

''اس دنیا میں جو لوگ ہمیشہ خدا کے وجود کے معتقد رہے، گو اس اعتقاد میں مذہبی روایات وخرافات کا اثر کار فرما رہا، مسلمان بھی انہی لکیروں پر چل رہے ہیں جن کو قرآن نے ابھارا ہے، ان روایات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مہینہ بھر جسے وہ رمضان کہتے ہیں کھانے پینے سے باز رہتے ہیں۔''

مشہور مستشرق کلیموفتیش جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے، کہتے ہیں:

''کسی بھی مذہب پرست قوم کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کو بالکلیہ نہ ختم کردے اور انسانیت کو گمراہ کرنے والے اپنے بوسیدہ افکار کو ترک نہ کردے، مذہب کا خاتمہ ترقی کا تقاضا ہے اور اس کے لیے یہ کار واجب ہے۔''

جمال الدین افغانی کی ''پان اسلامزم'' تحریک کے بارہ میں کلیموفتیش کا خیال ہے کہ:

''انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پان اسلامزم تحریک کی فکر مشرق میں ظاہر ہوئی، یہ تحریک رجعت پسندانہ سیاسی تحریک تھی۔''

اسلام کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

''اسلام کی اپنی خاص تاریخ ہے، اس کے عقائد، روایات اور خاص رسم ورواج ہیں، اسلام کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کا مطالعہ کیا جائے جن میں اسلام کی نشو ونما ہوئی۔''

عرب سے باہر اسلام کے پھیلنے کی وجہ مسلمانوں کے فوجی حملے اور ان کی فتوحات ہیں، ایشیا وافریقہ کے تہذیب یافتہ ممالک کے باشندوں کو غلام بنالیا جانا بھی اسلام کے

پھیلنے کی ایک وجہ ہے۔

عرب کے لشکر جب شہروں اور بستیوں پر قبضہ کرتے تو بربادی و پامالی میں جلدی کرتے ، لوٹ کھسوٹ ، مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کو غلام بنالینا اور ان باشندوں کی اکثریت کو برباد کردینا ان کا شیوہ تھا، مسلمانوں کا خلیفہ جو ایک بڑی حکومت کا صدر ہوتا تھا اس کی ذات میں دینی، فوجی اور شہری اقتدار اعلیٰ بیک وقت جمع ہو جاتا۔

اسلام کے کاہنوں (علما) کا فرض سب سے پہلے یہ ہوتا کہ وہ لوگوں کو خلیفہ کی اطاعت پر آمادہ کریں اور اس طرح وہ کھلے مالی استحصال کے لیے وجہ جواز قائم کرتے جو اس دور میں عام تھا۔

چونکہ خلافت کے عہد میں اسلام حکومت کا سرکاری مذہب ہوتا تھا، اس لیے حالات خود بخود ان کاہنوں (علما) کو ممتاز مقام دینے میں معاون ہوتے۔

کلیموفتیش نے اپنی کتاب ''اسلام، ماضی اور مستقبل'' کو جس کے اقتباسات اوپر پیش کیے گئے اس مشہور فقرہ پر ختم کیا جاتا ہے، یہ جملہ کتاب ''مارکس وانجلیز'' سے نقل کیا گیا ہے:

> ''مذہب ایک وہمی سعادت ہے اور حقیقی سعادت کے حصول کے لیے اس کا خاتمہ بہت ضروری ہے، مارکس کا قول ہے کہ مذہب ایک تاریخی مظہر ہے جس کی جڑیں طبقاتی معاشرہ میں پیوست ہیں اور پنپتی ہیں۔''

اس جائزہ کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ روسی استشراق اپنے حقیقی رجحانات و مقاصد میں اسلام کے خلاف علانیہ اور پیہم برسرپیکار ہے۔

☆☆☆

اسلام اور مستشرقین

از

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ

حرف آغاز: اسلام، اسلامی تاریخ اور امت مسلمہ کی رہبری کا سرچشمہ چونکہ قرآن مجید یعنی کلام الٰہی رہا ہے، اس لیے اسلام اور مستشرقین کے مطالعہ میں بھی اگر اسی مرجع ومصدر کی جانب رجوع کیا جائے تو زیادہ مفید ثابت ہوگا، لفظ مستشرق کی لغوی ونحوی تفسیر وتحلیل کی جاسکتی ہے اور باب استفعال سے خواص کی تعیین کے بعد استشراق پر جرح وتعدیل بھی ممکن ہے، مگر راقم الحروف اس پورے مسئلہ کو نئے زاویہ سے حل کرنے کی تائید میں ہے اور وہ قرآنی زاویہ ہے، اگر آج بھی قرآن کریم، امت مسلمہ کی فکر کا نقطۂ آغاز اور منتہائے پرواز بن جائے جس طرح قرون اولیٰ کے مومنین باصفا اور مخلصین لہ الدین کا تھا، تو نہ صرف سیاسی وسماجی، معاشی وثقافتی میدانوں میں فتح وفیروزمندی کا غلغلہ مچ سکتا ہے بلکہ علوم وفنون اور سائنس میں بھی شادمانی وکامرانی کا مژدۂ جانفزا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ لاسکتا ہے، بعض احباب کو یہ تجویز عجوبہ معلوم ہوسکتی ہے اور وہ یہ سوال بھی کرسکتے ہیں کہ ''قرآن کریم اور مستشرقین کا باہمی ربط کیا ہے؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اسی ربط کے انکشاف کے بعد ہمارا سارا مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور آج جو خلفشار علمی دنیا میں مستشرقین نے مچا رکھا ہے یا ان کے شاگردان رشیدان مسلم اعتذاریوں نے برپا کر رکھا ہے اس کا علاج بھی ممکن ہے۔

اگر قرآن کریم اسلامی نظام حیات کا منشور ازلی ہے تو اسے اس مسئلہ کو حل کرنا

چاہیے، قرآن میں امت مسلمہ کی ہدایت کے لیے بہت سے احکام نازل ہوئے، مسلم حکمرانوں اور دانشوروں نے جب جب ان احکام سے روگردانی کی خسارہ میں رہے اور زمانہ اس پر شاہد ہے، ''وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ'' امت مسلمہ کی حکومتوں کے لیے جو خارجہ پالیسی قرآن نے متعین فرمائی تھی وہ ہمیشہ برحق ثابت ہوئی اور آج تو اظہر من الشمس ہے، علم و دانش، ریسرچ و تحقیق کے میدان میں بھی یہی پالیسی ازلی وابدی حیثیت رکھتی ہے، مسلم حکمرانوں نے ان احکام الٰہیہ کو نظر انداز کیا اور اس کی سزا پائی، علم و دانش کے میدان میں بھی احکامِ الٰہیہ کی سرتابی کے نتائج مختلف نہیں ہو سکتے۔

اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ امت مسلمہ کو یہ فرمان دیا تھا:

(الف) وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (بقرہ:۱۲۰)

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو، صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتلایا ہے، ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔

(ب) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (مائدہ:۵۱)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستشرق یا مستشرقین کون ہیں اور ان کی نسل کہاں سے چلی ہے؟ اس کا جواب بھی اظہر من الشمس ہے، مستشرقین روز اول سے آج تک یہود و نصاریٰ رہے ہیں، خواہ مشرق میں ہوں، خواہ مغرب میں، آٹھویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۲ء تک مستشرقین کی تاریخ محض مذکورہ بالا آیات کریمہ وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی کی تفسیر و تعبیر رہی ہے، بلکہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ انہی آیات کی تعبیر کر رہی ہے، سیاسی میدان ہو یا علم و دانش و ثقافت کا میدان، اسلام دشمنی مستشرقین کی پالیسی کا جزو اعظم رہا ہے، مسلم اعتذاری اسکول کے فیاض اراکین خواہ کسی قدر مستشرقین کے کارناموں کی تحسین پیش کریں، ان کی تقصیرات کو دامن عفو میں جگہ دے کر ان کو صدارت کی کرسی پر بٹھا کر انہیں ہار پہنائیں مگر وہ وَلَنْ تَرْضٰی کے معنیٰ میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، انہیں حق ہے کہ ہمیں متقشف، متعصب اور غیر منصف قرار دیں مگر قرآن کے معنیٰ میں تبدیلی کا انہیں حق نہیں، جس کی وسعتوں میں ازلیت ہے اور ابدیت بھی، قرآن کریم کے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہمیں اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی پڑے گی، اس کے بغیر معنیٰ لَنْ تَرْضٰی کی تشریح ممکن نہیں۔

اسلام اور مستشرقین، ابتدائیہ: فرمانِ الٰہی یعنی اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ عقائد اسلامیہ کا نقطۂ آغاز رہا ہے اور منتہائے پرواز بھی، یہ تحریک حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۵۷۰-۶۳۲ء) پر ختم ہوئی، ایک طرف تکمیل دین (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ) کا منشور جاری ہوا، دوسری طرف یہ اعلامیہ بھی جاری کر دیا گیا کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں، یعنی وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (آل عمران: ۸۵) نیز ہر مومن کا شعار ہے کہ من حیث مسلم اپنے خالق اور باری کے دربار میں واپس ہو یعنی وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران: ۱۰۲) اسلام کی یہ داخلی اور خارجی پالیسی یہود و نصاریٰ کے

لیے ہمیشہ نا قابل قبول رہی، اسی لیے وہ اسلام دشمنی پالیسی کے سربراہ رہے۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد سے خلفائے راشدین کے دور تک یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمن پالیسیاں اظہر من الشمس رہی ہیں، تاریخ اسلام کا ہر طالب علم ان سے واقف ہے، ان تفصیلات سے یہاں بحث نہیں کی جائے گی، یہ مقالہ یہود و نصاریٰ کے علمی و فکری، ذہنی و نفسیاتی رجحانات کی اکسرے رپورٹ ہے جو ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک علیٰ حالہٖ قائم ہے، نیز ان علمی روایات کی سراغ رسانی مقصود ہے جو یہود و نصاریٰ بالفاظ دیگر مستشرقین کی اسکالرشپ ریسرچ تالیفات و تصنیفات کا طرۂ امتیاز ہے۔

جدید مستشرقین کا نسب نامہ یا شجرۂ نسب جان آف دمشق (۷۰۰ یا ۷۴۹ء) سے جا ملتا ہے جس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی تحریک کا آغاز کیا اور تحریری مناظرات کا منفیانہ دور شروع کیا اور بزنطینی تاریخی روایات کا مصدر اول تسلیم کرلیا گیا، دمشقی نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت اسلام کے خلاف تحریک چلائی، اس نے اسلام کو وثنی (Pagan) مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت سے تعبیر کیا، چونکہ اسلام کی تمسیخ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، شخصیت و دعوت کی تمسیخ ضروری تھی، اس لیے اس نے آپ کی حیات طیبہ اور سوانح پر حملہ شروع کیا، آپ کی نبوت کا انکار کر کے آپ کو دیو مالائی قصوں کا ہیرو بنا دیا، داستان سازی کے اس صنعت خانہ میں آنحضرتؐ کے بارے میں طرح طرح کے افسانے اور مضحکہ خیز وثنی خرافات گھڑے گئے، یہی کہانیاں لاطینی یا بیزنطینی تاریخ اور بعد میں چرچ کی اسلامی تاریخ کا حصہ بن گئیں اور مستشرقین کی اسکالرشپ کا مصدر اصلی بھی، جان اور اس کے پیروؤں نے آنحضرتؐ کو بے دین قرار دیا، نیز نبی کاذب کا خطاب دے کر اسلام کو ایک فاسد دین قرار دے دیا، اس نے آنحضرتؐ پر الزام لگایا کہ آپؐ نے ایک پادری کی معیت میں بائبل کو مسخ کر کے اسلام نام کا ایک نیا مذہب ایجاد کیا، اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی ہے۔

جان وہ پہلا مسیحی مشرقی مشنری تھا جس نے آنحضرتؐ کی مقدس شخصیت پر جنسی اتہامات کا طومار کھڑا کیا، جو بعد میں مغربی اسکالرز کی تحقیق وریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گیا، اس نے زینبؓ بنت جحش اور زیدؓ بن حارثہ کے واقعہ کو ایک افسانہ بنا دیا، یہی افسانے یورپ میں کلاسیکی موضوعات بن گئے اور آج تک مستشرقین کے محبوب عناوین ہیں، ساتھ ہی جان نے متعدد ازدواج، طلاق اور اس قسم کے دیگر مسائل کو اچھالا جو اس کی کتاب (De haere sibus) کے آخری باب کے اہم موضوعات ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جان کے پیرووں نے ان ہی بنیادوں پر اسلام دشمن لٹریچر کا انبار کھڑا کر دیا، یہی منفیانہ لٹریچر مغربی اسکالرشپ کے لیے حوالجات کا کام دینے لگے، بلکہ مڈل ایجز (ازمنۂ وسطیٰ) سے لے کر مغربی نشاۃ ثانیہ اور نشاۃ ثانیہ سے لے کر انتہائے بیسویں صدی عیسوی تک مستشرقین کے لیے مصادر کا کام دیتے رہے، اسلام دشمن ادب کے اسی انبار میں ایک نامی گرامی رسالہ قابل ذکر ہے، یہ رسالہ عبدالمسیح بن اسحٰق الکندی کی طرف منسوب ہے، چونکہ اس کا اثر مستشرقین پر آج تک موجود ہے، اس لیے مغربی اسکالرز نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، انیسویں صدی عیسوی میں ولیم اس کا عربی متن پروٹسٹنٹ مشنری اسکول کے استعمال کے لیے ۱۸۸۰ء میں لندن سے شائع کیا گیا، ولیم میور نے اس کا تلخیصی ترجمہ زیر عنوان (The Apology of Al kindi) لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا، یہ رسالہ مڈل ایجز میں رہنما اصول کا کام دیتا رہا، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، رسالہ کے مرکزی مضامین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار قرآن کا مذاق (اسے خبط خیالات کا غیر مربوط مجموعہ قرار دیا) سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنس اور جنگ سے ملوث کرنا اور دیگر خرافات شامل تھے، یہ رسالہ یورپ میں مڈل ایجز اسکالرشپ کو غذا فراہم کرتا رہا، آج بھی رسالہ کا آسیب مستشرقین کے سر پر سوار ہے، یہی رسالہ بیزنطینی مؤلفین کا مصدر بھی رہا ہے، بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی کی

اسکالرشپ اپنی بھاری بھرکم تنقیدی اصطلاحات، معروضی اور سائنسی جرح و تعدیل کی زبان دوراز دعووں کے باوجود اس رسالہ کی گرفت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر اور نویں صدی عیسوی کے اوائل میں عروج اسلام پر تھیوسوفین (۷۵۸ء-۸۱۸ء) نے کرانکل لکھی، اس تاریخ (The Chronicles of theo-sophane, the confessor) کو اناسٹیس (Anastasius) نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنالیا اور یہ دونوں کتب مستشرقین کے مصادر (Sources of reference) بن گئے، کرانکل درحقیقت مڈل ایجز میں شائع شدہ خرافات کا مجموعہ ہے، اس کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں آنحضرتؐ کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے، مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ محمدؐ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ان کو امی کہنا کذب ہے، اس کا بدیہی مقصد یہ تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ثابت کر دیا جائے تو منطقی طور پر یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا کہ انہوں نے یہودی اور عیسائی الہامی کتب اور مصادر کا بغور مطالعہ کیا اور انہی معلومات کی مسخ شدہ صورت کا نام اسلام ہے، یہ کہانی اس لیے وضع کی گئی کہ اسلام کی اصلیت (یہودی الاصل یا عیسائی الاصل (Origins of Islam) کو ثابت کیا جائے اور مغربی امریکی جامعات، (یونیورسٹیوں) کا محبوب ترین موضوع درس اصلیت اسلام ہے جس میں انہی قدیم مضامین کی تجدید کی جاتی ہے، اسی کرانکل میں آنحضرتؐ کے جنونی دورے (Epileptic fits) کی داستان بھی گھڑی گئی، اس قسم کے بے شمار افسانے مذکور ہیں، جن کے اعادہ کی گنجائش نہیں۔

نویں صدی عیسوی میں شاہ بیسل (۸۶۷ء-۸۸۶ء) کی فرمائش اور حکم پر ایک بیزنطینی مؤلف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک کتاب (Refutation Mohammad) لکھی جس میں آپؐ کو نبی کاذب کے علاوہ ابن ابلیس (العیاذ باللہ) بھی قرار دیا، قرآن کو کذب اور خرافاتی داستانوں کا مجموعہ قرار دے کر غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی اور اسلام کے اساسی عقیدہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کا شدید مذاق اڑایا، مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ اصل خدا

کی پرستش سے دور ہیں، اسلام چونکہ عیسیٰؑ بن مریمؑ کے عقیدہ کا حامی ہے اور عیسیٰ ابن اللہ کی شدت کے ساتھ تردید کرتا ہے، اس لیے مؤلف کی نظر میں یہ مذہب اور اس کے پیامبر و داعی سب کاذب ہیں، دسویں اور گیارہویں صدیاں انہی افسانوں کی بازگشت ہیں۔

مستشرقین کا جو گروہ اس دین کی سرزمین سے اٹھا وہ انہی مصادر کا پروردہ تھا، اسلامی علوم و فنون، تہذیب و ثقافت کا سکہ تقریباً نو سو سالوں تک اندلس میں قائم رہا، مگر مستشرقین اسپین نے کبھی اس بات کی سعی نہیں کہ بزنطینی مصادر کے بجائے براہ راست اسپین کی اسلامی تہذیب کا مطالعہ کریں، انہوں نے کرانکل کے افسانوں پر اپنی اسکالرشپ کی بنیاد ڈالی، دو مثالیں کافی ہیں، قرطبہ کا پوپ (St Eulogius) جو عرصہ دراز تک مسلم کلچر کا مطالعہ کرتا رہا اور مسلم علماو فضلا کے ساتھ رہا، اپنی تالیف (Liber Apologetics Malirum) کی بنیاد کرانکل اور لاطینی مسودات و مخطوطات پر رکھی، جس کا اعتراف خود بھی کیا ہے، اس نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف شدت نفرت کا مظاہرہ بھی کیا ہے، بلکہ حیوانی زبان تک استعمال کی ہے، یہ کتاب بھی دیومالائی قصوں سے سجائی گئی، کچھ افسانے تو خود ساختہ ہیں اور کچھ کرانکل وغیرہ کے رہین منت ہیں، اسی طرح سان پرڈو پاسکل (San pardo pascal) نامی دوسرے اندلسی اسکالر کی تالیف (Sobre Elseton Mahometana) کندی کے رسالہ کا چربہ ہے، ان دونوں مؤلفین کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت کا آوہ سلگ رہا ہے، ان کے خیال میں اسپین پر اسلامی حکومت عیسائیوں کے لیے عذاب الٰہی تھی، اسلام ان کی نظر میں عیسائیت کا بدترین جانی دشمن تھا، اس سلگتی آگ کو چرچ کی تاریخ نے مزید شعلہ بداماں بنا دیا، چونکہ یہی کتب، تالیفات و مصادر، عام قاری، علما اور اسکالرز کے مراجع تھے، اس لیے نفرت و حسد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی، ونسنٹ ڈی بیوس (Vincent de Beauvais) متوفی ۱۲۶۴ء نے ان تمام داستانوں کو اپنی تالیف (Speceulom Historicale) میں جمع کر دیا اور آنحضرتؐ کو وثنی (pagan) اور ذلیل (Low born) ثابت کیا، ان کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ

نے تلوار کے زور سے طاقت حاصل کی اور وحی کے نام پر دھوکا دے کر اس کو برقرار رکھا۔

کارزار صلیب اور مستشرقین: اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی اس کا نقطۂ عروج کارزار صلیب تھا، مسلمانوں اور اسلام کو مٹانے کے لیے صلیبی جنگیں تقریباً پانچ سو سالوں تک جاری رہیں اور پانچ صدیوں میں وقفہ وقفہ سے یورپ کی مشترکہ عسکری قوت مسلم شرق اوسط پر زندگی کے لیے موت اور آبادی کے لیے ویرانی کے دیو کی طرح منڈلاتی رہی، ۱۰۹۹ء میں پہلی خون آشام جنگ ہوئی، دوسری صلیبی جنگ ۱۱۴۷ء میں لڑی گئی اور تیسری معروف صلیبی جنگ سلطان صلاح الدین اور شہنشاہ انگلستان رچرڈ کے درمیان ۱۱۸۹ء سے ۱۱۹۳ء تک جاری رہی، چوتھی صلیبی جنگ ۱۲۰۳ء اور ۱۲۰۴ء کے درمیان لڑی گئی اور ۱۲۱۷ء میں پانچویں صلیبی جنگ پیش آئی، چھٹی صلیبی جنگ کا واقعہ ۱۲۲۸ء میں پیش آیا، جب یہ تمام کاوشیں ناکام ہوگئیں تو مسلمانوں کی تاراجی کے لیے اہل صلیب نے منگول قوت کے ساتھ عسکری اتحاد ۱۲۴۹ء اور ۱۲۵۰ء کے درمیان قائم کیا، اسی اتحاد کا نتیجہ تھا کہ زوال بغداد کا واقعہ ۱۲۵۸ء میں پیش آیا، آٹھویں صلیبی جنگ ۱۲۷۱ء میں پیش آئی، نویں صلیبی جنگ ۱۳۶۵ء اور آخری دسویں صلیبی جنگ ۱۴۶۴ء میں پیش آئی، ان صلیبی جنگوں اور خون آشامیوں کا تعلق مستشرقین سے بڑا گہرا ہے، کیوں کہ پانچ صدیوں میں یورپ کے مفکرین، مؤلفین اور شعرائے اسلام کے خلاف مسیحی جذبات کو گدگداتے، اسلام اور مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتے اور ان کے اندر شہادت کا جذبہ پیدا کر کے آمادۂ پیکار ہونے کی روح پھونکتے رہے، جنگ صلیبی پر اسٹی ون رنسی مان (Steven Runciman) کی تین جلدیں قابل مطالعہ ہیں، ہلاکو کی زوجہ خاصہ (Chief Wife) ایک عیسائی خاتون تھی جو ہلاکو کی افواج کو مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتی رہی، بلکہ حملۂ بغداد کے موقع پر وہ خود ہلاکو کے ساتھ معرکہ میں شریک تھی، ہلاکو کا سب سے زیادہ معتمد علیہ کمانڈر (Kutabuga) بھی نستوری عیسائی تھا اور بغداد کی مہم میں شریک تھا، جب بغداد برباد ہوا تو اسی ہزار افراد قتل کیے

گئے، (ملاحظہ ہو رنسی مان کی جلد دوم، صفحات ۲۴۶ تا ۳۷۰، نیز ملاحظہ ہو راقم الحروف کی فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات باب چہارم ص ۱۷۶ تا ۲۸۳)

صلیبی جنگوں کی پانچ سو سالہ تاریخ (۱۰۹۹ء-۱۴۶۴ء) کے دوران یعنی گیارہویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو لٹریچر پیدا کیا، اس کا سرسری جائزہ لن ترضی...... کی تشریح کے لیے ضروری ہے۔

تمام صلیبی جنگوں میں یورپ کی مشترکہ عسکری قوت کا دیوالہ نکل گیا، اسی شکست فاش کی بنا پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت کی نئی لہر دوڑ گئی، نثری ادب کے ساتھ شعری ادب بھی پوری قوت کے ساتھ میدان مبارزہ میں اتر آیا، شعرا نے اسلام کی تنقیص میں پوری قوت صرف کر دی، اس میں دانتے کا نام بھی قابل ذکر ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کی تمسیخ کی نئی تحریکیں چل پڑیں،

۱۱۴۱ء میں پیٹر (Peter the Venerable) نے چند عربی کتب کے تراجم لاطینی زبان میں کرائے، رابرٹ (Robert) اور ہرمن (Herman) نامی مؤلفین نے چار عربی کتب کے تراجم کیے جن پر پیٹر نے مقدمے لکھے، یہ مقدمے خرافات سے مزین تھے، رابرٹ نے قرآن کا ترجمہ کیا اور پیٹر نے اس کی تردید کی، نیز یہ بھی ثابت کیا کہ اسلامی عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز ہیں، پیٹر کی تحریرات اور تالیفات نے یورپ میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی کا دور شروع کیا، یہی تالیفات مستشرقین کے معصوم مصادر بنے رہے، اب اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں لاطینی زبان کے علاوہ یورپ کی دیگر زبانیں بھی صف آرا ہو گئیں، نثر کے ساتھ نظم بھی صف آرا ہوئی، فرانسیسی اور لاطینی نظم نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا، یہاں پر چند امہات الکتب کا ذکر کافی ہوگا۔

والٹر (Walter of Sens) نے لاطینی زبان میں اور الکزنڈر (Alexander Dupont) نے فرانسیسی زبان میں آنحضرتؐ کے خلاف دل کھول کر لکھا، ایک شعری مرثیہ

گیارہ سو بیالیس اشعار پر مشتمل زیر عنوان (Avila Muhamitt) لکھا گیا اور اسے بارہویں صدی کے شاعر امبری کو (Embrico of Maint) کے نام سے منسوب کر دیا گیا، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نفرت کا امنڈتا ہوا ایک طوفان تھا، ہر قسم کے غلیظ القابات استعمال کیے گئے، بعضوں نے اسی مرثیہ کو ہائلڈ برٹ (Hildebert of Tours) نامی شاعر (متوفی ۱۱۳۴ء) کی طرف منسوب کر دیا، یہ مرثیہ گویا آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کا شعری مجموعہ تھا، اسی قسم کی شعری سیرت زیر عنوان اوٹیو دی محمد (Otio de Machomet) جو ۱۱۰۹ر اشعار پر مشتمل تھی، والٹر نے وسط بارہویں صدی میں لکھی جو پہلے مرثیہ کا نقش ثانی تھا، حروب صلیبیہ پر تالیفات کا زور ہوا، معروف مؤلف گلبرٹ (Guilbert of Nogent) نے پہلی صلیب پر ایک کتاب زیر عنوان گیستا (Giesta dei der Fraheoos) لکھی اور ۱۱۱۲ء سے قبل ہی مکمل کر لیا، اس تالیف میں آنحضرتؐ کی سیرت پر ایک باب ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کا چربہ ہے، آنحضرتؐ کے نام تک کو مسخ کرنے کی سعی کی ہے اور محمدؐ کے بجائے ماتھومس (Mathomus) لکھا ہے، اس میں راویوں کی زبانی داستانیں نقل کی گئی ہیں، سب سے دلچسپ افسانہ جو مؤلف نے درج کیا ہے وہ لائق سماعت ہے، مذہب اسلام کے وجود کے سلسلہ میں مؤلف رقم طراز ہے کہ الکنڈریا (Alexandria) کے پیٹریارک (Patrarch) کا الکشن ہونے والا تھا، اس انتخاب میں حصہ لینے والا امیدوار پادری اپنے انتخاب سے مایوس ہو گیا تو اس نے چرچ کے خلاف انتقامی کارروائی کا منصوبہ تیار کیا، اس مقصد کی خاطر اس نے محمدؐ کے ساتھ سازباز کیا اور عیسائیت میں پھوٹ ڈالنے کے لیے محمدؐ کو زبردست تربیت دی اور آپ کی شادی ایک مالدار عورت خدیجہؓ سے کروا ڈالی، پادری مذکور نے محمدؐ کی حمایت کی اور ان کی نبوت کا اعلان کیا تاکہ مسیحیت پر ضرب کاری پڑ سکے، چنانچہ محمدؐ اس طرح نبی بن گئے اور مذہب اسلام کی دعوت دینی شروع کر دی، اس طرح مذہب مسیحیت میں تفرقہ پڑ گیا جو ہنوز باقی ہے۔

اس سے زیادہ دلچسپ داستان گھڑی گئی کہ محمدؐ خود پادری (Cardinal) تھے اور پوپ (Pope) کے مرتبہ پر ترقی پانے کے امیدوار بھی مگر جب انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ روم سے بھاگ کر عربیہ گئے اور وہاں نبوت کا دعویٰ کر دیا، ایک روایت کے مطابق یروشلم کے بشاپ سرگیس (Sergius) نے محمدؐ کو نبوت کے دعویٰ پر اکسایا اور ان کے لیے قرآن نامی کتاب لکھی۔

بارہویں صدی عیسوی کی خرافات نویسی میں دو ایسے مؤلفین ضرور نظر آتے ہیں جنہوں نے مستشرقین کی ڈگر سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کرنی چاہی مگر ان کی حیثیت آٹے میں نمک کی تھی، ولیم نامی مؤلف (William of Molmesbury) نے اسلام اور وثنیت (Paganism) میں فرق پیدا کیا اور لکھا کہ اسلام چونکہ توحید کا دعویٰ کرتا ہے، اس لیے وہ وثنی نہیں ہوسکتا، ۱۱۲۰ء میں اس نے یہ بھی لکھا کہ مسلمان محمدؐ کو نہ تو خدا مانتے ہیں نہ ہی ان کی پوجا کرتے ہیں، اس کے برخلاف وہ محمدؐ کو محض خدا کا نبی تسلیم کرتے ہیں، دوسرا مؤلف الفونسو (Alfonso) تھا جو اصلاً یہودی تھا مگر ۱۱۵۶ء میں مصلحۃً عیسائیت قبول کر چکا تھا، عیسائیت اور یہودیت کی باہمی رقابت وتصادم محتاج تعارف نہیں، دو ہزار سالہ رقابت کے باوجود آج وہ قرآن کی تصدیق کے مطابق بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ہیں، آج یہ حقیقت جس طرح عیاں ہے، شاید تاریخ کے کسی زمانے میں اس طرح آشکار نہ تھی، الفونسو نے یہودیت اور عیسائیت کے درمیان ایک افہامی ڈائیلاگ لکھا جس میں اسلام کے متعلق بہتر خیالات کا اظہار کیا، شاید مسیحی دنیا کو جو یہودیوں کی جانی دشمن تھی غیرت دلانا مقصود ہو، تیرہویں صدی عیسوی سابقہ ڈگر پر چلتی رہی، ۱۲۷۱ء میں ولیم (William of Tripol) نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی، تاکہ مشنری اپنی تبلیغ کے لیے استعمال کرسکیں، اس سوانح میں مؤلف خرافات کے علاوہ کچھ پیش نہ کرسکا، اس نے قرآن کریم کے بارے میں ایک دلچسپ افسانہ گھڑا، اس کے خیال میں قرآن مجید کی ترتیب وتالیف آنحضرتؐ کے وصال کے پندرہ سال بعد ہوئی،

اس کی تدوین کا کام ایک کمیشن کے حوالہ کیا گیا تھا، چونکہ آنحضرتؐ کی تعلیمات میں کوئی نئی اور مفید بات اراکین کمیشن کو نظر نہیں آئی، لہٰذا انہوں نے خود ہی قرآن نامی کتاب کی تدوین کر ڈالی، یہ تمام خرافات لاطینی روایات کے اجزائے ترکیبی بنتے چلے گئے، مستشرقین نے آنحضرتؐ کی کامیابی کے دو اہم رازوں کا انکشاف کیا، ایک تو جادو تھا اور دوسرا عیاری تھا، مؤلفین نے اصرار کیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، نبوت کے انکار کے لیے یہ دلیل پیش کی گئی کہ آنحضرتؐ نے خود اپنے آپ کو ایک عام آدمی قرار دیا ہے اور کوئی معجزہ نہیں دکھایا، لہٰذا وہ نبی نہیں ہو سکتے۔

ازمنۂ وسطیٰ سے نشاۃ ثانیہ تک مستشرقین کا سفر: دانتے اٹلی کا معروف شاعر، ازمنۂ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، دانتے (۱۲۶۵ء سے ۱۳۲۱ء) نہ صرف اٹلی کی نشاۃ ثانیہ کا جد امجد ہے، بلکہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا پیامبر بھی ہے، اس کی معروف وشہرۂ آفاق نظم (The Divine Comedy) کو نشاۃ کا چراغ راہ تصور کیا جاتا ہے، اس نظم کی تدوین وتاسیس میں دانتے نے آنحضرتؐ کی احادیث معراج سے استفادہ کیا ہے، میڈرڈ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاد پلاسیوس (Placious) نے ۲۵ سالہ ریسرچ اور جانکاہ اور دیدہ ریز محنت کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ دانتے نے اس نظم کی تدوین میں نہ صرف معراج کی احادیث سے استفادہ کیا ہے بلکہ ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور المعری کی رسالۃ الغفران سے بھی استفادہ کیا، دانتے نے علوم اسلامیہ اپنے اطالوی استاد برونیولو (Brunell-olatini) سے جو عربی زبان کا ماہر تھا، حاصل کیے، نظم کی ترتیب میں فتوحات مکیہ کی نقل کی، یورپ میں احادیث معراج پر خاصا مواد موجود تھا، پیرس کی لائبریری میں احادیث معراج پر مخطوطات بھی موجود تھے، پروفیسر منارٹ نے اپنی کتاب زیر عنوان ''بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں مطالعۂ اسلام'' میں ان فرانسیسی مسودات کے نام تک گنائے ہیں جہاں تک دانتے کی رسائی ممکن تھی، غزالی کی الدرۃ الفاخرۃ اور معراج نامہ تک دانتے کی رسائی تھی،

کتاب المعراج کے لاطینی اور فرانسیسی تراجم اس وقت موجود تھے اور دانتے کی پیدائش (۱۲۶۵ء) سے پچاس سال قبل ۱۲۱۶ء میں شائع ہو چکے تھے (Professor Cerulli) کا اصرار ہے کہ نظم کی تدوین میں دانتے نے ان ہی مصادر سے استفادہ کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس مستشرق شاعر نے جو علوم اسلامیہ میں دخل رکھتا تھا، اسلام اور آنحضرتؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے پیغمبر اسلامؐ کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اس لیے کہ انہوں نے عیسائیت میں پھوٹ ڈالی، وہ تفریق مذہب کے مجرم بنے، شاعر کی دریدہ دہنی کا یہ عالم ہے کہ آنحضرتؐ کو مثلہ کردہ زیر عذاب دکھلاتا ہے، یہ اصحاب قدسیہ مسخ شدہ صورتوں میں زیر عذاب ہیں اور ان کا جرم کبیر یہ تھا کہ انہوں نے مذہب میں افتراق پیدا کیا، انفرنو (Inferno) کے کینٹو ۲۸ (Canto 28) میں دانتے رقم طراز ہے:

(نقل کفر کفر نہ باشد)

Benold, how miutliated is Mohamet.

in front of me the weeping Ali goaos.

His face cleft through from forelock to the chin,

And all others that you see about.

Fomenters Were of discord and of schism.

And that is why they are so glashed as under.

(دی ڈوائن کمیڈی، ترجمہ ال، گرانٹ وہائٹ، نیویارک ۱۹۴۸ء، کینٹو ۲۸)

دانتے پر صلیبی جنگوں کی ناکامی وشکست کا ایسا اثر تھا کہ اس نے سارے یورپ کو اپنی شعری قوت سے ہلا دیا، ایک طرف پیغمبر اسلام کے ساتھ بدسلوکی کا مظاہرہ کیا، دوسری طرف فاتح قدس صلاح الدین ایوبی کو بھی اس نے جہنم میں منافقین کے ساتھ مبتلائے عذاب دکھایا، (ملاحظہ ہو کینٹو ۴) (Inferno) اسلام دشمنی کے اس مظاہرہ کے بعد دانتے نے

صلیبی شہسواروں اور شہدا کو جنت میں فرحاں اور شاداں دکھایا، کیونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو فنا کرنے کے لیے شہید ہوئے تھے، جنت (Paradise) کینٹو ۱۸ میں دانتے ان کی شادمانی کا ذکر کرتے ہوئے نام بہ نام خراج تحسین پیش کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

Ansinen my eyes saw passing on the cross William of orange and stout Renoat Duke godfrey,de Bool illon and Robert guj scrard. (۱)

ان اشعار اور نظموں نے مغربی جذبات میں آگ لگا دی اور نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب رواداری، اخوت اور روشن خیالی کی تحریکات سر اٹھا رہی تھیں، دیگر مذاہب کے ساتھ انصاف کا مطالبہ ہو رہا تھا، مستشرقین کا رویہ اسلام کی جانب علیٰ حالہ قائم رہا، ۱۳۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کا زمانہ نشاۃ ثانیہ کا ابتدائی زمانہ تھا، نشاۃ کے بعد دوسری طاقت ور تحریک جو یورپ میں اٹھی وہ رومانی تحریک (۱۷۵۰ء سے ۱۸۳۰ء) تھی جس نے یورپ کی روایات کہنہ کو چیلنج کیا اور زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا، نئے خیالات پر مبنی انقلاب انگیز تحریکیں چلتی رہیں، رومی اور یونانی تہذیب سے آزادی حاصل کر کے خود مغربی تہذیب کی

(۱) دانتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید معلومات کے لیے راقم حروف کی دو کتابیں پیش نظر رہیں:

(الف) فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات (جامعہ کراچی ۱۹۷۶ء) صفحات ۵۶۱ تا ۵۹۱، اس حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ معراج اور یروشلم جزو لاینفک ہیں، یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر معراج کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ دانتے نے ابن عربی سے کیا کچھ لیا ہے؟ اس کا نصی تقابل، کامیڈی میں جنت وجہنم وغیرہ کے نقشے ابن عربی سے مستعار لیے گئے، ان کا نقشہ جاتی تقابل وغیرہ وغیرہ۔

(ب) فکر وفن (جامعہ ڈربن) ۱۹۸۱ء (اردو، عربی اور فارسی مقالات کا مجموعہ) ملاحظہ ہوں صفحات از ۵۸ تا ۸۳، زیر عنوان دانتے کی کامیڈی پر اسلامی اثرات، ص ۹۵ تا ۱۱۲ بھی ملاحظہ ہوں، زیر عنوان جرمن شاعر لسنگ کا منظوم ڈرامہ ”ناتھن دانا“۔

داغ بیل ڈالنے کی زبردست تحریک چلی، مذہبی تقشف وتعصب کے خلاف نئے مکاتب فکر وجود میں آئے مگر اسلام کے متعلق مستشرقین کے رویہ میں بال برابر فرق نہیں آیا، نشأۃ ثانیہ کا پورا دور مڈل ایجز یعنی ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کے زیر اثر رہا، وہی افسانوی اور دیومالائی تعبیر وتفسیر اسلام کا مقدر تھا، چونکہ نشأۃ ثانیہ کے مصادر لاطینی مصادر (Latin Chronicles) تھے، اس لیے ان سے رستگاری ممکن نہ تھی، ہر روایت پر صلیبی اور بزنطینی چھاپ پڑی ہوئی تھی، یہی مصادر آخری سند کی حیثیت رکھتے تھے، سوانح محمدؐ میں یہی لکھا گیا کہ آپ الحاد وبے دینی کے ملزم تھے، آپ نے عیسائیت میں تفریق پیدا کی، آپ کو کاذب قرار دے کر اسلام کو عیسائیت کا ازلی دشمن تصور کیا گیا، خود مسیحی طبقات میں کشمکش شروع ہوگئی، رومن کیتھولک چرچ نے پروٹسٹنٹ چرچ پر اسلام دوستی کا الزام لگایا اور انہیں اسلام کا ہمدرد قرار دیا، دونوں فرقوں کے درمیان یہ مسئلہ موضوع نزاع بن گیا، اس پورے عہد میں آنحضرتؐ اور اسلام کے لیے نجس الفاظ استعمال کیے گئے، جو مڈل ایجز کا امتیازی نشان تھا، آنحضرتؐ کے لیے رذیل الفاظ مثلاً کاذب

(Cunnina Imposter, Lying deceiver, Blasphemsus emjssoay of satan)

وغیرہ عام تھے، بعض مستشرقین نے علوم اسلامیہ کے مطالعہ کو تضییعِ اوقات قرار دیا، بعض نے لکھا کہ محمدؐ کا نام سنتے ہی خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

سترہویں صدی کے بعد مغربی استعمار کا ظہور اور مصلحت بینی کی تحریک، مستشرقین کے مصادر میں نئے اضافے:

سترہویں صدی عیسوی نے مستشرقین کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کردیے، یہ صدی عروج استعمار کی صدی تھی، عالم اسلام عموماً انگریز فرنچ ڈچ وغیرہ کے پنجۂ استبداد میں آچکا تھا، اس طرح مغربی اقوام براہ راست عالم اسلام سے ٹکرائیں، مسلم کلچر اور علوم اسلامیہ سے ان کا سابقہ ہوا، مستشرقین سیاح ان ممالک کا دورہ کرنے لگے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ تمام لاطینی اور بزنطینی روایات کی ضد تھی،

اس تضاد نے مستشرقین کے سامنے سوالیہ نشانات کھڑے کر دیے، اس اثنا میں استعماری قوتوں نے مثلاً برطانیہ، فرانس اور ڈچ وغیرہ نے سیاسی، معاشی لوٹ مار کے ساتھ اسلامی علوم وفنون، مسودات ومخطوطات کے نادر نسخوں کی بھی لوٹ مار کی اور تمام عالم اسلام سے اسلامی گنجینہائے گراں مایہ اور صدیوں کی علمی وفکری کاوشات کے خزینے اڑا کر لندن اور پیرس اور ہالینڈ لے گئے اور اپنے کتب خانوں اور میوزیم کی زینت بنا ڈالی، آج بھی ان نوادرات کی نمائش یورپ میں ہو رہی ہے جہاں ناظرین صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

پیرس میں ۱۹۷۳ء کی بین الاقوامی مخطوطات کی نمائش دیکھ کر راقم سطور انگشت بدنداں تھا۔

مستشرقین اب نئے مصادر اسلامی سے دوچار ہوئے، عربی زبان پڑھنے اور پڑھانے کی تحریک چلی، کیونکہ اس کے بغیر ان مصادر تک رسائی ممکن نہ تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ کیمبرج، آکسفورڈ، پیرس اور لندن میں عربی کے شعبے کھلے، ۱۶۴۹ء میں قرآن کریم کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ شائع ہوا، سترہویں صدی کی سب سے طاقتور تحریک روشن خیالی کی تحریک تھی جس میں غیر عیسائی مذاہب وعقائد کے منصفانہ مطالعہ پر زور دیا گیا، ان تحریکات کے دباؤ میں بعض مستشرقین نے بھی اسلام پر نظر ثانی یا از سر نو تجربہ کی دعوت دی اور اسلام کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی، اب مستشرقین کے سامنے تین اہم مصادر تھے (۱) ازمنۂ وسطیٰ (مڈل ایجز) کا روایتی مواد (تاریخ وسوانح وغیرہ) نیز لاطینی مصادر (کرانکل وغیرہ) (۲) اسلامی اور عربی مصادر جو استعمار کے ذریعہ دستیاب ہوئے اور (۳) مغربی سیاحوں کے سفرنامے جو انہوں نے مسلم ممالک کے دورے اور سیاحت کے بعد مرتب کیے۔

مستشرقین کی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی یہ دیکھ کر حیرت زدہ اور ششدر رہ جاتا ہے کہ ان تمام تحریکات اور نئے مصادر کا کوئی اثر مستشرقین کے رویہ پر نہیں پڑا، نہ ہی ازمنۂ وسطیٰ کی روایات سے گلوخلاصی ہو سکی، وہ اب بھی لاطینی روایات کے اسیر رہے، یورپ میں

اب مزید انتشار پھیلا، کیونکہ سیاحوں کے سفر نامے لاطینی اسکالرشپ کے خرافاتی نقشے سے بالکل مختلف تھے، آنحضرتؐ کے بارے میں ایک دوسرا اور مضحکہ خیز افسانہ گھڑا گیا، یعنی محمدؐ ہرقل کی فوج میں باغی تاجروں کے قائد تھے اور عربوں کے باغی گروہ کے کیپٹن بھی تھے، مگر ایران پر حملے کے وقت محمدؐ نے ہرقل کی فوج کا ساتھ دیا، انگریز فلسفی راجر بیکن (R.Becon) نے آنحضرتؐ کو من حیث جادوگر پیش کیا اور اپنے مقالات بالخصوص (of Boldness) میں آنحضرتؐ کے بارے میں خرافات وضع کیں۔

زمانہ سفر کرتا گیا، وقت آگے بڑھتا گیا مگر مستشرقین رجعت قہقری کرتے رہے، یورپ میں جدید دور کا آغاز ہوا ”جاگو ہوا سویرا“ کی اذان دی گئی، مارٹن لیوتھر کی قیادت میں چرچ اور خرافاتی رسم ورواج کے خلاف ایک قیامت برپا ہوئی، خیال تھا کہ جدید یورپ میں اصلاحات کا مفکر اعظم مارٹن لیوتھر اسلام کے بارہ میں شاید نرم رویہ اختیار کرے، اس کے بالکل برعکس اس نے اسلام اور مسلمانوں کو حق کا دشمن گردانتے ہوئے اسلام کو ترکوں کا مذہب قرار دے دیا، چونکہ مارٹن کا سارا حملہ چرچ اور پوپ کے خلاف تھا، اس لیے اس نے آنحضرتؐ کو پوپ سے بھی زیادہ بدتر قرار دیا، اس نے مطالبہ کیا کہ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس امر کی تحقیق کی جائے کہ آیا اسلام اور محمدؐ حضرت عیسیٰؑ کے آخری دشمن تھے، تاکہ یہ مسئلہ حتمی طور پر طے ہو جائے کہ اسلام اور محمدؐ ہی مارٹن کے خیال میں مذہب عیسائیت کی بربادی کے ذمہ دار تھے، لیوتھر نے آنحضرتؐ کو گاگ اور میگاگ کا خطاب دیا۔

چونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ کا پروردہ تھا، (یہ روایت ہنوز جاری ہے) اس لیے مذہبی نفرت ان کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز تھا، اس کو اسکالرشپ کہنا اسکالرشپ کی توہین ہے، یہ سارا ریسرچ مواد درحقیقت مشنری پروپیگنڈا تھا، چند مثالیں کافی ہیں، سترہویں صدی کے نامی مؤلف بڈول (Bedwel) متوفی ۱۶۳۲ء نے اپنی تالیف ”محمد کاذب“ (Mohammad is Impotures) میں آنحضرتؐ کے ساتھ نہایت گستاخی کی، جیسا کہ کتاب

کے نام سے واضح ہے (Genebard) نامی کیتھولک مؤلف کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ محمدؐ نے قرآن کی تالیف کسی مہذب زبان مثلاً لاطینی، عبرانی اور یونانی میں نہیں کی بلکہ ایک وحشی زبان میں کی، چونکہ محمدؐ خود (العیاذ باللہ) جانور (Beast) تھے اس لیے قرآن کو بھی جانوروں کی زبان میں تحریر کیا۔

اینڈری (Andredu Ryer) نے چند عربی کتب کے انگریزی ترجمے کیے، ساتھ ہی ۱۶۴۹ء میں قرآن کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ بھی پیش کیا۔

جدید تحریکات کے زیر اثر سترہویں صدی میں اسلام کو سمجھنے کا جذبہ ضرور پیدا ہوا، مگر لاطینی خرافاتی روایات سے گلوخلاصی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بعض روشن خیال اسکالرس نے وقتاً فوقتاً روایتی ڈگر سے ہٹنے کی ناکام کوشش کی، ان میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر پیکاک (Edward Peacoke) متوفی ۱۶۹۱ء تھا، موصوف نے چند عربی کتب کے ترجمے کیے، نیز حقیقت اور افسانہ یا تحریفات کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوشش کی، اس نے سیرتِ محمدؐ پر نظر ثانی کی اور بعض افسانوں کو مسترد کر دیا، اٹلی کا پادری مستشرق (Abb, Lou-ismaracci) نے قرآن کا لاطینی ترجمہ کیا اور اپنی تالیف پروڈمس (Prodomusad, Ra-futationem) میں اسلام پر زبردست حملے کیے، آنحضرتؐ کو واضح الفاظ میں نبی کاذب قرار دیا، سترہویں صدی میں الیکزنڈر راس (Alexander Ross) نے اپنی تالیف پنڈیلیا (Pandeblia) ۱۶۵۳ء میں جو تقابل ادیان پر لکھی گئی تھی، لاطینی خرافات سے ہٹ کر ایک راہ نکالی اور اسلام کے بارے میں پہلی بار چند اچھے کلمات استعمال کیے، انگریزی چپلین یا پادری (Chaplain) مسمی ایڈیسن (Lanolot Addison) نے حیات وموت محمدؐ (Life and death of Muhammad) کے زیرعنوان اپنی کتاب ۱۶۷۸ء میں لندن سے شائع کی، مگر اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرتؐ کے خلاف مؤلف کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انہوں نے خود اپنی زندگی میں اپنی کتاب قرآن کو شائع نہیں کیا،

۱۶۹۷ء میں ناروچ کا ڈین (Dean of Norwich) مسمی ہمفری (Humphery Prideaux) نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی اور آپ کو نبی کاذب (Imposter) قرار دیا، مؤلف نے اعتراف کیا کہ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے مؤلف رکاڈو (Ricado) سے بے حد متاثر ہوا تھا، ہمفری کی کتاب تقریباً ایک صدی تک مستشرقین کے لیے حوالہ کا کام دیتی رہی، کتاب کا مرکزی مضمون اسلام کو فراڈ ثابت کرنا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں سیاسی مفادات کے زیر اثر نام نہاد اسلامی لٹریچر کی افزائش: سابقہ صدیوں کے مقابلہ میں اٹھارہویں صدی میں اسلام پر زیادہ لٹریچر تیار ہوا، اس میں سیاسی مفادات کا دخل زیادہ تھا، مگر مجموعی طور پر اٹھارہویں صدی بھی لاطینی روایات اور ازمنۂ وسطیٰ کے عقائد کی زد میں رہی، سب سے پہلا ڈچ مستشرق ایچ، ریلان (H.Relan) نے آنحضرتؐ کی جانب رویہ میں تبدیلی پیدا کی، اپنی معروف تالیف "مذہب محمدؐ" (Dereligion Mohommadica) ۱۷۰۴ء میں اس نے ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات سے رہائی کی کوشش کی اور اسلام اور محمدؐ کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا، غالباً یہ پہلا مستشرق تھا جس نے رواداری (Tolerance) کا مطالبہ کیا، اس نے پہلی بار یہ تحریک چلائی کہ مشرق کو اس کے اپنے مصادر و مراجع کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا، یہ مطالبہ یقینی طور پر پہلا مطالبہ تھا کہ اہل مغرب کے بجائے خود مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب و کلچر کی تفسیر و تشریح پیش کریں اور اہل مغرب کے افہام و تفہیم کا ذریعہ بنیں، مذہب کو اس کے مخالفین ہمیشہ مسخ کرتے ہیں، مؤلف نے واضح الفاظ میں تحریر کیا کہ یورپ میں اسلام کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس قدر تمسیخ کا شکار ہوا ہو، مؤلف نے اس امر پر بھی اصرار کیا کہ اصل اسلام کو کما حقہٗ سمجھنے میں خود عیسائیت کا فائدہ ہے اور یہ افہام و تفہیم دوستی کے ذریعہ ممکن ہے، دشمنی کے ذریعہ نہیں، عیسائیوں کا غرور اسی طرح کم ہوسکتا ہے اور ان کے اندر شکر ایزدی کا جذبہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ اس نے عیسائیت جیسے مذہب کی نعمت سے ہمیں سرفراز کیا، ریلان

درحقیقت پہلا مستشرق تھا جس نے اسلام کے ساتھ تاریخی انصاف کا مطالبہ کیا۔

اس تحریک کا اثر دیرپا نہ تھا، بعض مؤلفین ان خیالات سے متاثر ضرور ہوئے، مثلاً کانٹ (Count de Boulainrilliers) نے اپنی کتاب (Vie de Mohomet) (لندن ۱۷۳۰ء) میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا لیکن اس کے خلاف حملے شروع ہوگئے اور اس پر مسیحیت کی تخفیف کا الزام بھی لگایا گیا، ناقدین کے مطابق یہ کتاب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب پہلی دوستانہ کاوش تھی جو مسیحی یورپ میں ظاہر ہوئی، مؤلف نے اسلام کو پہلی بار ایک عقلی مذہب (Rational Religion) قرار دیا اور آنحضرتؐ کو نبی تسلیم کیا، یہ اقدام تمام سابقہ مسیحی اور یہودی مستشرقین کے عقائد و مزاج کے خلاف تھا، اس میں نہ صرف مڈل ایجز اور لاطینی خرافات کی نفی تھی، بلکہ نشاۃ ثانیہ جیسے روشن خیال دور کی اسلام دشمنی کے خلاف بھی پہلی صدائے بازگشت تھی، یہ رویہ مستشرقین کے لیے ناقابل قبول تھا، اس کے خلاف تحریک چلانے کی ضرورت پڑی تاکہ یہ خیالات یورپ میں جڑ نہ پکڑ سکیں، چنانچہ یہی ہوا، جارج سیل (George Sale) اور راڈول (J.M.Rodwell) کے معاندانہ جذبہ میں شدت پیدا ہوئی، سیل نے بڑی چستی کے ساتھ آنحضرتؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب (False Religion) قرار دے دیا، جین گگنیر (Jean Gagnier) نے دو کتابیں تالیف کیں، ایک کتاب ۱۷۳۳ء میں اور دوسری ۱۷۴۸ء میں منظر عام پر آئی، ان دونوں کتب کا مقصد بولین ولیر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ بولین ولیر کی تالیف کے مقابلہ میں ایک نئی تالیف محمد (Vlede Mohomet) پیش کی جو اسٹرڈم سے ۱۷۴۸ء میں نمودار ہوئی، کتاب کے مقدمہ میں بدبخت مؤلف نے آنحضرتؐ کو نہ صرف انسانیت کا بدترین دشمن، بلکہ خدا کا دشمن بھی قرار دیا، چونکہ روشن خیالی، انصاف اور جدت پسندی کا دباؤ یورپ پر بڑھتا جارہا تھا، اس لیے بعض مؤلفین نے ان سے متاثر ہوکر چند کلمات خیر عرض کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا، اس ضمن میں سیوری (Savery) نامی

مؤلف کا ذکر کافی ہے، موصوف نے ۱۷۵۲ء میں قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا اور اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح بھی لکھی، آنحضرتؐ کے لیے نرم الفاظ استعمال کیے اور آپ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت بھی قرار دیا، مگر ازمنۂ وسطیٰ کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرا سکا، اسی لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور قدیم نظریہ کی تائید کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیت اور عیسائیت سے عقیدۂ توحید کو مستعار لے کر مذہب اسلام کی داغ بیل ڈالی۔

ایڈورڈ گبن (Edwerd Gibbon) کا نام محتاج تعارف نہیں، زوال روما کی تاریخ پر چھ جلدیں لکھ کر موصوف نے آفاقی شہرت حاصل کی اور انگریزی تاریخ نویسی کے معمار بن گئے، ۱۷۸۰ء میں کتاب مذکور کے پچاس ویں باب میں اسلام اور محمدؐ کے بارے میں نہایت دل سوز رائے کا اظہار کیا، رواداری کے دعویٰ کے باوجود آنحضرتؐ کو نبی کاذب (Imposter) کا خطاب دیتے ہوئے لکھا کہ آنحضرتؐ آخری ایام میں شہوت اور لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی (Just and ambition) سے مغلوب ہو گئے، محمدؐ ظلم، فراڈ اور ناانصافی کا مجسمہ تھے، اسلام ان ہی ذرائع سے پھیلا، یہ تھی اس روشن خیال مؤلف اور مورخ کی رائے جس نے رومۃ الکبریٰ کی تاریخ نویسی پر ربع صدی صرف کی اور نہ صرف روما بلکہ اس سے متعلق تمام معلوم اقوام کے احوال لکھے جن کا تعلق رومی حکومت سے رہا تھا، اس میں اسلام اور مسلمان سب سے نمایاں تھے، کیونکہ اہل روما سے ان کا ٹکراؤ ہوا تھا۔

اٹھارہویں صدی کی دوسری عظیم شخصیت جو انقلاب فرانس کے بانیوں میں سے ایک ہے، وہ والٹیر (Valtaire) کی شخصیت ہے، (۱۶۹۴ء-۱۷۷۸ء) والٹیر فرانسیسی آسمان فکر کا تابندہ ستارہ اور مصلحین کا پیامبر تھا، اٹھارہویں صدی پر اس کے افکار کی کارفرمائی بلکہ سلطانی قائم رہی مگر والٹیر جیسا مفکر، اسلام اور محمدؐ کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا نہ سکا، اس نے اپنے ڈرامہ (Play) دین محمد مسمیٰ بہ (Le Fanall seu ou Mohomet Lapropheis) میں

جو ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آئی، اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا، اس نے یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور محمدؐ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا، یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرتؐ کو نبی کاذب (Imposter) اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب (False barbarous religion) سے موسوم کیا، اس نے اپنے ڈرامہ کو پوپ (Pope Bendict xtr) کے نام سے منسوب کر دیا اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، مسلمانوں کو درندہ، جنگلی اور وحشی قوم (Barbarous seci) کا خطاب عطا کیا، اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والٹیر نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کیا، مجموعۂ مقالات (Essai sur las Moeurus et L.desnation) میں اس نے آنحضرتؐ کو برطانوی سیاست داں، کرام ول (Cramwall) کی عیاری سے تشبیہ دی ہے، والٹیر نے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کی پوری دعوت میں اسے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی اس کے سوا کہ انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، والٹیر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر مستشرقین پر پڑا، ان میں ایک ڈیڈارٹ (Diderat) ہے جس نے آنحضرتؐ کی گھناؤنی سیرت پیش کی اور آپ کو عقلیت (Reason) کا دشمن اور عورتوں کا دلدادہ ثابت کیا، فرانسیسی مستشرق رینان (۱۸۳۲ء تا ۱۸۹۲ء) (Rennan) نے بھی اسلام کو عقل کا لاعلاج دشمن (Incurable Enemyreason) قرار دیا۔

اٹھارہویں صدی کی مختصر روح فرسا روداد کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جب قاری انیسویں صدی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ خلف اپنے سلف سے متبعین اپنے پیش رووں سے زیادہ متقشف، متعصب اور زہر آلود ثابت ہوئے، ان پر نہ تحریک تجدید کا کوئی اثر پڑا، نہ ہی یورپ کی روشن خیالی، رواداری اور انصاف کی تحریکات نے ان کے دل کو موم بنایا، شدت نفرت میں وہ اپنے بزرگوں اور متقدمین سے بھی بازی لے گئے۔

انیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین

اوران کے اسکالرشپ کی نیرنگیاں: انیسویں صدی کی جھولی میں جو میراث آئی وہ بھی اسلام دشمنی کی میراث تھی، سابقہ رویہ میں مطلق تبدیلی نہیں آئی، ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۰ء تک تقریباً نصف صدی میں متعدد کتب اسلام اور محمدؐ پر شائع ہوئیں، ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر ڈیوڈ پرائس کی تالیف (Ghronological Ratrospect of Mohommedan) تھی، جو ۱۸۱۱ء سے ۱۸۲۱ء تک شائع ہوئی، مؤلف نے اپنی تاریخ میں آنحضرتؐ کے عہد سے لے کر ہند کے مغل شہنشاہ اکبر تک کے تاریخی واقعات درج کیے ہیں، دوسری اہم قابل ذکر تالیف ایڈورڈ افام (Edward Upham) کی ہے، موصوف نے ترکی کی تاریخ (History of ottomon Empire) لکھی جو ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی، مؤلف نے آنحضرتؐ کو حسب معمول نبی کاذب کے لقب سے یاد کیا۔

یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ صلیب کے بعد سے نثری ادب کے دوش بدوش نظم نے بھی اسلام دشمنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پیش روشعرا کا ذکر مختصراً گزر چکا ہے، یہاں پر انیسویں صدی کے شہرۂ آفاق جرمن شاعر گیٹے کا ذکر لازمی ہے، گیٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول پر گہرے اثرات چھوڑے، شاعر نے بظاہر دراسات اسلامیہ اور شرق اوسط سے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا مگر درحقیقت اسلام کے خلاف اپنے پیش روقائدین کے نقش قدم سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا، بلکہ آگے نکل گیا، ۱۷۷۳ء میں اس نے آنحضرتؐ پر ایک نظم ترانہ محمد (Mohamet is Gesang) لکھی، آنحضرتؐ کو ایک چشمہ سے تعبیر کیا اور وحدۃ الوجود کا مدرس بتاتے ہوئے احترام کے چند کلمات استعمال کیے گئے، گیٹے کے اسی بیان پر کارلائل کو اس قدر حیرت ہوئی کہ اس نے اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا کہ اگر واقعتاً گیٹے کا تبصرہ صحیح ہے تو ہم سارے عیسائی دراصل مسلمان ہیں، گیٹے نے ۱۷۷۰ء سے ۱۷۷۴ء تک اپنی نامکمل نظم لکھی، شاعر نے ثابت کیا کہ محمدؐ ابتدا میں

مخلص تھے، بعد میں وہ مادیت اور بوالہوسی کا شکار ہو گئے اور ان کا روحانی حصہ ضائع ہو گیا، یہ وہی کلاسیکی مضمون ہے جو آج تک مستشرقین کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز ہے، شاعر نے یہ بھی ثابت کیا کہ محمدؐ کی شخصیت مبہم اور غیر واضح تھی، ایکٹ اول میں اس نے آنحضرتؐ کو چاندتاروں کا پجاری ثابت کیا ہے، بعد میں ایک خدا کی عبادت کی طرف مائل ہوتے ہوئے دکھایا ہے، ایکٹ دوم کا مرکزی موضوع اسلام کی اشاعت اور پیروان اسلام کی کثرت ہے، ایکٹ سوم میں شاعر بتاتا ہے کہ محمدؐ نے فتح مکہ کے بعد کس طرح اپنی گرفت کو مستحکم کیا اور مذہب اسلام کو پھیلایا، آنحضرتؐ نے اسی مقصد کے لیے قوت اور عیاری دونوں کو استعمال کیا، ایکٹ پنجم میں شاعر نے آنحضرتؐ کو مادیت سے مغلوب ہو کر ایک سلطنت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے دکھاتا ہے، ان نظریات سے گیٹے کے عقائد و نفسیات جھلک کر سامنے آجاتے ہیں، یورپ کی فضا ہمیشہ مکدر رہی، دو ایک مستشرقین نے اگر انصاف کا مطالبہ کیا تو وہ ملعون و معتوب ہوئے، انیسویں صدی کی ممتاز شخصیات میں کارلائل کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، درحقیقت پوری صدی اس کی ذات میں ڈوب گئی، ۱۷۹۵ء سے ۱۸۸۱ء تک کارلائل کا نام نامی زندہ رہا، انیسویں صدی کے نصف اول تک فضا مسموم رہی، مگر نصف ثانی میں پھر اسلام اور محمدؐ کی جانب رواداری اور انصاف پسندی کے مطالبے شروع ہوئے، اس تحریک کے قائدین میں کارلائل کا نام قابل ذکر ہے، یہ مطالبہ بربنائے اخلاص نہیں تھا، بلکہ یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، سیاسی تبدیلیاں تھیں اور شبانہ روز جدت پسندی اور سائنسی ترقیات کے چیلنج کی کشمکش تھی، تعصب اور تقشّف کے خلاف عام لہر یورپ میں بڑھتی جارہی تھی، اسی فضا (Liberal Climats) نے بعض مستشرقین کو اسلام کے خلاف سابقہ موقف پر نظر ثانی کے لیے مجبور کیا، تبدیلی کا یہ سہرا یورپ کی سب سے طاقتور تحریک (Romantic Movement) کے سر ہے جس نے یورپ کے تمام فرسودہ نظامِ حیات، کلاسیکی عقائد، تقشّف اور تعصب کو ایسا چیلنج کیا کہ سارا یورپ ہل گیا، سیاست ہو یا ثقافت، ادب و کلچر ہو یا دین و مذہب ہر میدان

پر اس کا زوردار اثر پڑا، یہ تحریک دراصل کلاسیکی نظریات کے خلاف ایک بغاوت تھی، اس سے ٹکرانا مشکل تھا، کارلائل ان ہی تحریکات سے متاثر ہوا، اس تحریک کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ نوخیز نسل کے اندر اپنے پیش رو متقدمین کو چیلنج کرنے کی جرأت مندانہ ہمت پیدا کردی، تمام رسم و رواج کا قلع قمع ہوگیا، نقلی اور بناوٹی زندگی کے بجائے اصلی اور فطری زندگی گزارنے کی دعوت دی گئی، اس نے مشرق کے حقیقی مطالعہ اور افہام و تفہیم کا دروازہ بھی کھول دیا، اسی کا اثر تھا کہ کارلائل نے اپنے دیگر موضوعات کے ساتھ اسلام کو بھی موضوع بحث بنالیا، یہ امر واضح رہے کہ انیسویں صدی تک مستشرقین کلیۃً اسلامی اسکالر نہیں تھے جیسا کہ آج ہیں، بلکہ ہر فن مولیٰ تھے، اسلام کا مطالعہ اسی کا ایک حصہ تھا۔

کارلائل اسلامی رویہ میں ہرگز مخلص نہیں تھا، اس نے اسلام اور محمدؐ کو موضوع بحث محض اس لیے بنایا کہ اب اسلام قبول کرنے کا خطرہ ٹل گیا تھا، اس لیے واضح الفاظ میں لکھا کہ محمدؐ پر بحث اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ ممتاز نبی تھے بلکہ محض اس لیے کہ اب ارتداد کا مطلق خطرہ نہیں تھا، اب کوئی عیسائی اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھا، اب ہم آزادی کے ساتھ اسلام کے بارے میں لکھ سکتے ہیں اور محمدؐ کے بارے میں چند اچھے کلمات بھی استعمال کرسکتے ہیں، یعنی اسلام اور محمدؐ کی مخالفت اس لیے کی جارہی تھی کہ اسلام کی عالمی قبولیت کو چیلنج کیا جائے، (ملاحظہ ہو "The Herd as prohet" نیویارک ۱۹۵۲ء، ص ۱۱)

اس مقدمہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ایک بیدار مغز ناقد کارلائل کی تالیف کے تحسینی کلمات کو جو اس نے اسلام یا محمدؐ کے بارے میں لکھا تھا، پڑھتا ہے تو اس کے قلب پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

کارلائل کی تعریفیں ملاحظہ ہوں، وہ رقم طراز ہے کہ اسلام اور محمدؐ کے خلاف افترا اور کذب کا جو پلندہ یورپ میں جمع کیا گیا ہے وہ ہم عیسائیوں کے لیے باعثِ شرم ہے، یہ باتیں کہ محمدؐ کاذب تھے، یا مذہب اسلام مجموعۂ خرافات ہے، اس روشن دور میں قابل قبول نہیں،

محمدؐ کی تعلیم ۱۸۰ ملین انسانوں کی زندگی کا مشعل ہے، بارہ صدیوں سے انسانی ارواح اسلام کی گرفت میں ہیں، کیا یہ سب کذب اور جھوٹ ہے؟ یہ نظریات خرافات کا مجموعہ ہیں، (ص ۱۲)

اس نے بطور خلاصہ لکھا کہ محمدؐ نے عربیہ کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا، کارلائل پر سیل کے ترجمۂ قرآن کے واضح اثرات موجود ہیں، اس کے خیالات اور تحریر پر بھی اس کی چھاپ ہے، بلکہ یہی ترجمہ اس کے لکچرز کی اساس ہے، ان خوبصورت تعریفی کلمات کے باوجود کارلائل نے آنحضرتؐ کی شخصیت کو ایک نبی برحق کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس نے آپ کو تاریخ کی عظیم شخصیت، ایک بڑا ہیرو اور قائد (Great himan person) کی حیثیت سے ابھارنے کی سعی کی، مگر پھر اسی کارلائل کے دیگر کلمات کو پڑھ کر قاری ششدر رہ جاتا ہے جب وہ آنحضرتؐ کو جنگلی اور بادیہ نشین (Son of the Wildarness) غیر مہذب، حیوانی اور وحشیانہ آغوشِ فطرت کا پروردہ (Uncultured semi-bar barous son of nature) قرار دیتا ہے، یہ بیانات تاریخی حقائق کے خلاف ہیں، آنحضرتؐ قریش مکہ میں اٹھے جو ہم عصر تہذیب، دولت وتجارت کی قیادت کر رہے تھے، نہ تو وہ بادیہ نشین تھے، نہ ہی صحرائی جانور تھے، کارلائل کی نیت جو بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی تحریریں مڈیول دور کے تعصب اور خرافات سے پہلی بار بغاوت تھی، یہ تبدیلی رواداری اور انصاف پسندی کی جانب پہلی پسند ایک نیا قدم ضرور تھا، مگر کارلائل کی ان تحریرات کو دیگر مستشرقین نے بے حد ناپسند کیا اور کارلائل کی تالیفات پر رومانی تعبیرات کا ٹھپہ لگا دیا، قدیم روش سے سرتابی کو معصیت تصور کیا۔

انیسویں صدی کے وسط تک آنحضرتؐ کی سوانح کے عربی مصادر مثلاً ابن ہشام کی سیرت واقدی اور ابن سعد اور طبری کی تالیفات یورپ میں عام طور پر رائج نہیں ہوئی تھیں، یہ سب مسودات اور مخطوطات کی صورت میں پڑے ہوئے تھے لیکن رینکے نے جب تاریخی تنقید کی تحریک چلائی اور مصادر کی سراغ رسانی کا زور ہوا تو تاریخ فہمی میں نیا انقلاب برپا ہوا، عربی مصادر کے مطالعہ پر زور دیا گیا، جرمنی کے مستشرقین نے مسلم شرق اوسط، براعظم ہندو پاک

کے دورے شروع کیے، کتب خانوں کی تاریکیوں میں پڑے محتاج توجہ مسودات ومخطوطات کو روشنی میں لایا، کریمر (Alfred van Kremer) نے دمشق سے واقدی کی کتاب المغازی کا نسخہ برآمد کیا، ہندوستان سے تین قیمتی مخطوطات برآمد ہوئے، اسپرنگر اور دیگر مستشرقین نے دہلی سے آنحضرتؐ کی سوانح پر تین قیمتی مخطوطات حاصل کیے، ۱۸۵۰ء کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی مخطوطات برآمد ہونے شروع ہوئے، ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے قدیم تین نسخے ہندوستان سے بھی برآمد ہوئے، اواخر انیسویں صدی تک یہ مخطوطات یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہونے لگے اور اس طرح مستشرقین یورپ کی رسائی اصل مصادر تک عام ہوگئی، ان ہی بنیادوں پر نئی کتب کا ظہور ہونے لگا۔

گستاوویل (Gustaw Weil) نے آنحضرتؐ کی زندگی اور تعلیمات پر ایک کتاب (Mohammad der prophet sein leber urd seine Lehre) لکھی، مؤلف کے پاس ابن ہشام کا قدیم نسخہ موجود تھا، اس کے مطالعہ اور تحلیل وتفرید میں اس نے تاریخی تنقید کے نئے اصول اور قواعد وضوابط اختیار کیے اور آنحضرتؐ کے ساتھ انصاف پسندی کا رویہ اختیار کیا، مگر قدیم مکتب فکر سے آزاد نہ ہوسکا، اس کا موقف قدیم اور فرسودہ خیالات کے مدار سے ہٹ نہیں سکا، اس کے خیال میں چونکہ محمدؐ قدیم اور جدید بائبل کا خوبصورت درس توحید اس قوم میں واپس لائے جو ایمان کھو چکی تھی، اس لیے محمدؐ کو غیر مسلم بھی خدا کا پیامبر تسلیم کرسکتے ہیں، بالفاظ دیگر اسلام کو عیسائی الاصل اور یہودی الاصل ثابت کیا، بہرحال ان تحریرات نے رواداری کی فضا کو تقویت بخشی اور دیگر مستشرقین پر بھی اس کا اثر پڑا۔

فرانسیسی مستشرق کاسن دی پرسی ول (Guossin de perseval) نے ۱۸۴۷ء میں تاریخ عرب (Essat surli History Arebes) لکھی اور اپنے رویہ میں نرمی کا مظاہرہ کیا، ولیم میور اپنی زہرافشانیوں کے لیے معروف ہے، مگر وہ نئی تحریکات سے متاثر ہوکر کم ازکم اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے کا دعویٰ ضرور کرنے لگا، فرانسیسی مستشرق نے بڑی

ہمت سے کام لے کر لکھا کہ محمدؐ کو محض کاذب کہنا ناانصافی ہے، وہ اخلاص کے ساتھ اپنی قوم کو جہالت سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔

تاریخی مصادر کی نصی تنقیدات اور تنقید تاریخ کے نئے اصول وضوابط نے مزید نت نئے مسائل لا کھڑے کیے، سب سے پہلا مسئلہ آنحضرتؐ کی سیرت کے اصلی مصادر کی ثقاہت کے متعلق اٹھایا گیا، مستشرقین تحقیقات کے بعد پھر اپنے اصلی موقف پر پہنچ گئے، یعنی اسلام اور محمدؐ کی دعوت یہودی اور عیسائی روایات کی مسخ شدہ صورت ہے، اس میں کوئی نیا پن نہ تھا، یہ تو وہی مڈیول زمانہ کی بازگشت تھی، البتہ اس پورے موضوع کا ایک نیا علمی نام وضع کیا گیا جسے ہم اسلام کی اصلیت کے نام سے جانتے ہیں اور جو آج مغربی جامعات کا محبوب موضوع درس وتدریس ہے، جیسا کہ اوپر گزرا۔

۱۸۳۳ء میں ابراہام گیگر (Abraham Geiger) نے ایک مقالہ زیر عنوان محمدؐ کے یہودی مصادر و مآخذ (What did Muhammad take from Judaism) پیش کیا اور بہت سے نئے نظریات کی داغ بیل ڈال دی، اب ایک نئی تحریک چل پڑی کہ یہودیت ونصرانیت اور اسلام کے درمیان قریبی ربط وضبط ثابت کیا جائے تاکہ محمدؐ کے یہودی وعیسائی مآخذ کو حتمی طور پر ثابت کر دیا جائے، یہاں پر اس کتاب کا ذکر کر دینا قاری کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو ۱۹۶۷ء میں نیویارک سے زیر عنوان ''اسلام کی یہودی بنیاد'' (The jewish Foundation of Islam) شائع ہوئی اور اس کے مؤلف ییل یونیورسٹی (Yule university) میں اس پر مقدمہ معروف مستشرق راجنتھال (Frang Rosenthal) کا ہے جس نے ابن خلدون کا ترجمہ کیا ہے اور اسلامی تاریخ نویسی پر مبسوط کتاب بھی لکھی ہے، اس کتاب پر مبسوط نقد راقم الحروف کی کتاب پیغمبر اسلام اور مستشرقین میں ملاحظہ ہو، اسلام کی اصلیت اب مستشرقین کا محبوب موضوع بن گیا ہے اور تین معروف مستشرقین ولیم میور، اسپرنگر اور نالدیکے اس تحریک کے سرخیل بن گئے، اسپرنگر نے آنحضرتؐ کے مطالعہ کا ایک نیا اسکول قائم کیا جسے

یلوجی یا علم الامراض یا اسباب امراض کا اسکول کہا جا سکتا ہے، یہ واضح رہے کہ میور کی
رح اسپرنگر بھی برطانوی سول سروس کا ملازم تھا، اس نے اسلام اور آنحضرتؐ پر متعدد کتب
لھیں، ان میں حسب ذیل تین تالیفات قابل ذکر ہیں:

۱۔ حیات محمدؐ اصل مصادر کی روشنی میں، الہ آباد ۱۸۴۸ء۔

1. Life of Muhammad from original sources, Allhabad. 1848

۲۔ حیات اور تعلیم محمدؐ (تین جلدیں، مطبوعہ برلن از ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء۔)

2. Des Leban and Lehre des Muhammad (Berlin 1861-1865, 3 vols)

۳۔ محمدؐ اور قرآن ایک نفسیاتی مطالعہ، (ہیمبرگ ۱۸۸۹ء)

3. Mohammad under Koran: eine psychclegischo studies (Hamburg 1889)

ان تالیفات نے جن میں اسلام کی اصلیت کے اثبات پر پوری قوت صرف کی
گئی تھی، نقد و نظر کا ایک نیا طوفان برپا کر دیا، اسپرنگر چونکہ خود ڈاکٹر تھا، اس لیے اس نے
چودہ سو سالوں کے بعد بھی اسلام اور محمدؐ کا طبی معائنہ کرنا ضروری سمجھا، طبی معائنہ کی رپورٹ
میں اس نے ثابت کیا کہ آنحضرتؐ اعصابی مریض یا مصروع (Epileptic) تھے۔

طبی معائنہ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آنحضرتؐ کا نروس سسٹم چونکہ خراب تھا، اس
لیے ہذیان اور بدحواسی کے دورہ میں انہوں نے قرآن کی تصنیف گڑھ لی نیز اسلام نامی
مذہب کو گڑھ لیا، اب اسلام ہذیان الاصل قرار پایا، محمدؐ پر چونکہ ہذیان یا امتلاس اور اعصابی
اضطراب جو محض ہنسنے اور رونے کا سبب بنتا ہے (Hysteric freazy) کے دورے پڑتے تھے،
اس لیے اسلام وجود میں آ گیا۔

اسلام کی اصلیت کی یہ بالکل نئی اور اچھوتی تعبیر سامنے آئی، اب آنحضرتؐ کی
سیرت و سوانح کو طبی نقطۂ نظر سے (Pathological Approach) دیکھنے کی ضرورت محسوس
کی گئی اور اسے مستقل ایک اسکول کی حیثیت دے دی گئی، فرائڈ اور دیگر علمائے نفسیات کے
دور میں یہ اسکول جنسی آسیب کی زد میں آ گیا جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

سر ولیم میور برطانوی سول سروس کا ملازم اور اسکوٹش اصلیت کا متقشف کیتھولک عیسائی تھا، اس نے چار جلدوں میں حیاتِ محمدؐ لکھی جو لندن سے ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۱ء کے درمیان شائع ہوئی، یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ برطانیہ اسلام کے ازلی دشمنوں میں رہا ہے، صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں رچارڈ کی شکست کا غم ہنوز باقی ہے، اس کا انتقام برطانیہ نے تاسیس اسرائیل کے بعد لے لیا ہے مگر نفرت کی آگ سلگ رہی ہے، ولیم میور کی حیاتِ محمدؐ (Life of Muhammad) دراصل دریدہ دہنی اور ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کا مجموعہ ہے، خالص کیتھولک نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی گئی ہے مگر انگریزی خوان عوام کے لیے مستند مصدر ہے، ولیم میور نے آنحضرتؐ کو نبی کاذب کا خطاب دے کر یورپ کے ان مستشرقین کے خلاف سخت برہمی کا مظاہرہ کیا جو اسلام اور محمدؐ کے ساتھ رواداری کا مطالبہ کر رہے تھے اور اعلان کر دیا کہ اہل یورپ اپنے روایتی موقف میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، ولیم میور کی شدت نفرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلام اور محمدؐ اور قرآن کریم کو تہذیب، آزادی اور حق کا بدترین دشمن قرار دیا، ایسا دشمن جو آج تک انسانی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا، اس کا عقیدہ تھا کہ محمدؐ (العیاذ باللہ) شیطان کے آلۂ کار تھے، ولیم میور یہ تمنا اور آرزو لے کر دنیا سے رخصت ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن اہل اسلام توبہ کریں گے اور عیسائیت قبول کر کے جہل وضلالت سے نجات حاصل کریں گے۔

تاریخی تنقید کا مکتب فکر جو نالدیکے نے قائم کیا تھا اس کے اثرات ختم نہیں ہوئے، نالدیکے، اسپرنگر اور ولیم میور سے زیادہ دریدہ دہن ثابت ہوا، اس نے تاریخ قرآن (Geseni chtades Qoran) لکھی جو برلن سے ۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی، آج تک یعنی سو سالوں سے مستشرقین کی رہنمائی کے لیے یہ تاریخ مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس نے اپنے پیش رو کے طبی معائنہ سے مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ محمدؐ ہذیان کے مریض نہیں تھے، بلکہ وہ انتہائی اور جذباتی دورے (Fist of emotion) کے مریض تھے، اسی دورے کے زیر اثر ان کو اس بات

کا یقین آگیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، اسی میں انہوں نے قرآن کی تالیف کر ڈالی، ساتھ ہی اسلام نامی مذہب کی داغ بیل ڈال دی، یہ تمام تالیفات ان کے مرکزی خیالات اور عمودی مضامین ازمنۂ وسطیٰ یا لاطینی خرافات سے کسی طرح مختلف نہ تھے۔

بیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین

اور اسلام کا تحلیلی اور سائنسی مطالعہ : انیسویں صدی کے اواخر سے مستشرقین نقد اسلام کے نئے مکاتب فکر کی تاسیس میں لگے ہوئے تھے جیسا کہ ہم دیکھ چکے، جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، قاری کا مذاق بدلتا گیا، سیاسی اور معاشی احوال میں تغیر آتا گیا، مستشرقین کی اسکالرشپ چولے بدلتی گئی، پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی جانے لگی۔

جیسے جیسے یورپ کی فضا بدلی، مستشرقین کی اسکالرشپ بھی بدلی، ایک زمانہ تھا جب آنحضرتؐ کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے کی امکانی سعی کی گئی، جنس و جنگ کے اتہامات لگائے گئے، اسلام کو بزور شمشیر پھیلانے یا یہودیت و مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل قرار دینے کا چرچا تھا، وغیرہ وغیرہ، جب یورپ پر نفسیات کا بھوت سوار ہوا تو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ میں نفسیاتی اور طبی قوانین نافذ کیے گئے اور سعی کی گئی کہ نفسیاتی امکانات اور جوہر و توانائی (Peyo chdrnatar) کی روشنی میں آنحضرتؐ اور اسلام کا معائنہ کیا جائے، چنانچہ محمدؐ کے مطالعہ میں علم الامراض کے اصول نافذ کیے گئے، اسٹریا کا معروف عالم نفسیات فرائڈ (Freud) متوفی ۱۹۳۹ء حیات انسانی پر جنس کا آسیب بن کر سوار ہوگیا، اواخر انیسویں صدی سے آنحضرتؐ کی سیرت وسوانح کے مصادر پر نقد اور جرح و تعدیل کا سلسلہ شروع ہوا، اب نقد کا سارا زور قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرۃ النبی کی تحلیل و تفرید پر تھا، قرآن کریم کو غیر مرتب اور مبہم توہمات کا مجموعہ قرار دیا گیا، غیر مہذب اور غیر متوازن ہونے کی وجہ سے غیر ثقہ بھی سمجھا گیا، یعنی قرآن، اسلام اور محمدؐ کی تحریکات کی واضح صورت پیش کرنے سے قاصر ہے، قرآن پر سنگین حملوں کے بعد نزلہ احادیث نبویہ پر اترا، چونکہ احادیث قرآن کے بعد مصدر ثانی کی

حیثیت رکھتی تھیں، لہٰذا ان کو منہدم کرنا مستشرقین کا اولین فریضہ تھا، اب احادیث کے کذب وافترا کے افسانے گھڑے گئے، یوں تو نالدیکے نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل تھا لیکن انکار حدیث کے اسکول کی داغ بیل گولڈ زیہر (Innac Goldziher) نے ڈالی اور اپنی تصنیف دراسات محمدیہ (Mohammadenisch studien) میں اپنے نظریہ کی اساس ڈالی، اس نے اس سوال کے ذریعہ کہ کیا سیرت نگاری کے لیے احادیث پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ سب سے عظیم فتنہ کھڑا کیا، بیسویں صدی میں مستشرقین کی اسکالرشپ زمانہ کے ساتھ دو حصوں میں بٹ گئی، ایک تو انکار حدیث کے مکتب فکر سے منسلک رہی اور دوسری نئی ابھرتی ہوئی اشتراکی یا کمیونسٹ تحریک کی گود میں پرورش پانے لگی، اول الذکر مکتب فکر نے غیر یقینی کردار کے احادیث کی فہرست مرتب کی اور ان احادیث کو خوب اچھالا جو مذہبی اور سیاسی فرقوں نے ذاتی مفادات کے پیش نظر گڑھی تھیں، یا جو خاص قبائل، افراد اور احکام کی تائید میں تھے، گولڈ زیہر نے ان تمام احادیث کو مسترد کر دیا، انکار حدیث کے بعد گولڈ زیہر نے سیرت کے مصادر پر جراحی شروع کر دی اور ان کو بھی اس نے بیانیہ احادیث (Norrative Ahadith) کے زمرہ میں ڈال دیا، اسلامی اسناد کے پورے سلسلہ کو چیلنج کرنے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ یہ مصادر ثقاہت کی ضمانت نہیں دے سکتے، یعنی ہدم دین اسلام کی آخری کڑی تھی، نامی مستشرق ہنری لامینس (Henri Lammenns) نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا اور یہ ثابت کرنے کی پیہم کوشش کہ ہجرت مدینہ سے قبل اسلامی روایات کا سارا ڈھانچہ جس پر آنحضرتؐ کی سوانح کھڑی کی گئی ہے، بے بنیاد اور غیر ثقہ ہے اور محمدؐ کی مدنی زندگی کی ساری روایات داستان وافسانہ سے زیادہ درجہ نہیں رکھتیں، اسلام اس کی نظر میں ایک تاریخی المیہ تھا، سب سے دلچسپ تحقیق مؤلف نے یہ پیش کی کہ آنحضرتؐ کثیر خوری کے مریض تھے اور یہی ان کی موت کا سبب بنا، کثیر خوری کی وجہ سے ان پر لقوہ، مرگی کے دورے پڑے، ان ہی حملوں میں وہ جاں بحق ہو گئے، ہنری ابتداءً بیسویں صدی میں شام اور لبنان کا مشنری مبلغ تھا،

اسلام اور آنحضرتؐ کے خلاف شدت نفرت کے اظہار میں اس نے کوئی کمی نہیں کی، البتہ اس پر ریسرچ، تحقیق اور اسکالرشپ کا غلاف ڈال دیا اور اس کا نام سائنسی نہج تنقید رکھ دیا، اس نے آنحضرتؐ پر وحشیانہ حملے کیے اور آپ کے اخلاص کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

یورپ میں اچانک معاشی تحریکات کا طوفان اٹھا جس کے نتیجہ میں کمیونسٹ یا سوشلسٹ تحریک نے سر اٹھایا اور یورپ کی پوری سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، چونکہ سامعین، قارئین اور زمانہ کا مزاج بدل گیا تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر نقد و نظر کا اسلوب بھی بدل گیا، کارلائل کا نظریہ یعنی دنیا کی تاریخ عظیم انسانوں کی سوانح حیات کا نام ہے، بدل گیا، اس کی جگہ کارل مارکس کے نظریہ نے لے لی، جس میں انسان معاشیات کا خلیہ ہے، یعنی تاریخ معاشی اور سماجی حرکات کا نام ہے، چونکہ یورپ کا سارا تنقیدی نظام کمیونزم کے پنجۂ استبداد میں آ گیا تھا، اس لیے اسلامی اسکالرشپ اور مستشرقین دونوں اس کی گرفت میں جکڑ گئے۔

جرمنی کے یہودی اور عیسائی مستشرقین دراسات اسلامیہ میں پیش پیش رہے، ہیوبرٹ کریمی (Hubert Grimme) نامی جرمن مستشرق نے جو عربی کا اسکالر تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر دو کتابیں لکھیں جو ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۵ء طبع ہوئیں، اس نے مذہبی حیثیت کو بالکل ہی ختم کر ڈالا اور پہلی بار واضح انداز میں مطالبہ کیا کہ ساتویں صدی عیسوی کے عربیہ کا جہاں اسلام ظاہر ہوا، سماجی، معاشی اور سیاسی مطالعہ اسلام اور محمدؐ کو کماحقہٗ سمجھنے کے لیے لازمی ہے، اشتراکی تحریک کے ظہور سے پہلے ہی اس نے مکتب فکر کی بنیاد ڈال دی اور اعلان کر دیا کہ اسلام کا ظہور و عروج محض ایک سوشلز (Socialistie phenomenon) کا ایسا مظہر تھا کہ جس پر معاشی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، یعنی اسلام کی پوری تاریخ مکہ کی طبقاتی جنگ کے اندر پوشیدہ ہے، ایک طرف سرمایہ اور محنت کی کشمکش تھی، مالدار تجار کا ظالمانہ رویہ، ملکی معیشت اور بینک پر اس کا تسلط، قبائلی قائدین کا جابرانہ سلوک تھا، دوسری طرف محنت کشوں، مزدوروں اور حرفت پیشہ لوگوں کی روز افزوں عدم قناعت و نامرادی، مایوسی تھی، انہی دونوں کے تصادم کا

عکس یا مظہر اسلام ہے، یعنی اسلام امرا کے خلاف غربا کی بغاوت تھی، اس طرح اسلام ایک دینی و مذہبی تحریک نہیں بلکہ ایک سوشل سسٹم تھا اور محمدؐ نبی کے بجائے ایک سماجی مصلح تھے۔

معاشی، سماجی تحریک میں مارگولیوتھ ۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء نے سیاسی مصالحہ لگا کر ایک نیا مثلث تیار کیا، مارکسی تحریکات کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور آزادی کی تحریک بھی یورپ میں چل رہی تھی، لہٰذا اس نے اس میں سیاسی اچار کا اضافہ بھی کر دیا، یعنی محمدؐ کی دینی و مذہبی شخصیت کو ختم کر کے اس نے آپ کو محض ایک سیاسی مبصر اور قائد کی حیثیت دے دی، مارگولیوتھ کے خیال میں محمدؐ نے نبوت کا دعویٰ محض اس لیے کیا کہ وہ عرب پر بآسانی حکومت کر سکیں، اسی لیے وہ ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، نیشنل ہیرو بن گئے اور ایک مملکت کے بانی مبانی بھی، اس کی تالیف محمدؐ اور عروج اسلام ان ہی خیالات کا مجموعہ ہے، مقدمہ میں وہ رقم طراز ہے کہ میں محمدؐ کی عظیم شخصیت کو تسلیم کرتا ہوں، باہم متصادم قبائل عربیہ کو ایک متحدہ ریاست میں منتقل کر دینا اتھاہ مشکلات کا حل، ۲۳ سالہ ملی جدو جہد کے بعد ایک سلطنت کا قائم کرنا، پھر تخت و تاج کا مالک بن جانا اور ایسی وسیع سلطنت کی داغ بیل ڈالنا جس کی لپیٹ میں سارا عالم آ جائے، وغیرہ وغیرہ، ان کی صفات غیر معمولی صلاحیت کی متقاضی تھیں، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس میں مارگولیوتھ کا مقالہ بھی انہی خطوط کا عکس ہے، مگر مؤلف کی دریدہ ذہنی حسب معمول قائم رہی، اپنے تحسینی کلمات کو اس نے کافور بنا دیا، جب آنحضرتؐ کو قزاق اور ڈاکو قرار دیا، مؤلف نے لکھا کہ مدینہ میں آنحضرتؐ کا کردار محض لٹیرے قذاق کا تھا، مدینہ کی معیشت کا مدار ہی تجارتی قافلوں کی لوٹ مار پر تھا، مالِ غنیمت کی تقسیم میں بھی ناانصافی عام تھی، مؤلف آنحضرتؐ کی صداقت و اخلاص دونوں کا منکر ہے، وہ آپ کو محض ایک قانون داں جج یا ڈپلومیٹ سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہے۔

اٹلی کا معروف مستشرق سیلون کیتانی (۱۸۷۷ء سے ۱۹۳۴ء) (Princeleane

(Caetani) بھی اسی مکتب فکر سے منسلک تھا، اس نے بھی آنحضرتؐ کی دینی شخصیت کو ختم کرنے کی سعی کی اور قبائل عربیہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی احوال کے مطالعہ پر زور دیا جس کا مظہر اسلام تھا، اس نے اپنی تالیف اسلام (Islam.........) میں ۶۲۲ء کے بعد سے واقعات کو تاریخ وار درج کیا ہے اور اسلام کی ابتدائی تاریخ سے بحث کی ہے، اپنی تالیف دراسات شرقیہ (Studi Distorig Orientale) کی تیسری جلد میں اس نے آنحضرتؐ کو محض ایک سیاسی قائد (Staiesman) کی حیثیت دی ہے اور ظہور اسلام کو عرب کے سیاسی، معاشی اور سماجی اضطراب کا مظہر ثابت کیا، اس کے خیال میں آنحضرتؐ محض معاشی بدحالی کی بنا پر ہجرت پر مجبور ہوئے اور تحریک ہجرت کے قائد بن گئے، بطور خلاصہ مؤلف آنحضرتؐ کو عظیم موقع پرست سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں، اس لیے اس امر کا خاص اہتمام کیا ہے کہ محمدؐ کی دینی شخصیت کسی طرح ابھرنے نہ پائے بلکہ اس سے ہر ممکن صرف نظر کیا جائے۔

مصادر اسلامیہ اور اشتراکی تنقید کے پہلو بہ پہلو ایک نئی تحریک نے جنم لیا، یعنی مذہبیات یا دینیات کے مطالعہ میں علم النفس کے اصول کا استعمال اور مذہبی شخصیات کا خالص نفسیاتی مطالعہ، اس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ محض ایک انسانی ڈھانچہ بن کر رہ گئے، دینی شخصیت کی کشش جاتی رہی، دینی تحریکات کے عوامل ومحرکات کا امتحان نفسیاتی اصول کے مطابق لیا جانے لگا، دراسات اسلامیہ میں جب علم النفس (سائیکلوجی) اور اس کے اصول ومبادی کو نافذ کیا گیا تو اسلام کی سیاسی ومعاشی تعبیرات بھی کمزور پڑنے لگیں، چونکہ اسکالر اور قاری دونوں کے منہ کا مزہ پھیکا پڑنے لگا اس لیے کسی نئے اچار یا مصالحہ کی ضرورت پڑی، وہ مصالحہ علم النفس کا مصالحہ تھا، اسی نظریہ کو پورے اہتمام کے ساتھ آگے بڑھایا گیا اور ظہور اسلام کے نفسیاتی عوامل وحرکات کے مطالعہ پر زور دیا گیا، اس تحریک کے سرخیل دین فرانز بھل (Dane frantz Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) تھے، ان دونوں نے مذہب اور علم النفس یا مذہبی نفسیات (Religious psychology) کی

تازہ ترین معلومات کو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ پر منطبق کر دیا، آنحضرتؐ کی نفسیاتی تکوینیات (Psycho mechanism) کا گہرا مطالعہ کیا گیا، بھل نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں متعدد مقالات لکھے۔

آنحضرتؐ کے اعصابی نظام (نروس سسٹم) کے گہرے مطالعہ کے بعد بھل اس نتیجہ پر پہنچا کہ غیر معمولی اعصابی (Abnormal Norvous System) سسٹم کی وجہ سے محمدؐ اپنے آپ کو دھوکہ دینے یا مغالطہ میں پڑ جانے کے عادی ہو گئے تھے، اسی دھوکہ کا نتیجہ تھا کہ محمدؐ نے یقین کر لیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، محمدؐ ایک نہایت مشکوک اور مبہم (Ambiguous) کردار کے فرد تھے جس کا سمجھنا مشکل ہے، وہ (Opileptic) نہیں بلکہ (Hystorical) تھے، وہ حقیقی مفکر تو ہرگز نہیں تھے۔

طور اینڈرے نے اسلام اور محمدؐ پر متعدد کتب لکھیں اور سیرت و سوانح محمدؐ کے مطالعہ میں اس نے اپنے گہرے علم النفس کے تجارب کا استعمال کیا، بلکہ آنحضرتؐ کی شخصیت کی نفسیاتی تحلیل و تفرید میں اس نے تحلیلی نفسیات کی ٹکنیک (Technique of Anelytical psychology) استعمال کی، مؤلف کی نظر میں آنحضرتؐ کی عظمت کی صرف ایک دلیل ہے، وہ یہ کہ انہوں نے قدیم ادیان اور سابقہ مذاہب یعنی یہود و نصاریٰ کے مذاہب کا خلاصہ یا معجون مرکب (Synthesis) پیش کیا، چونکہ عرب کا سماجی اور معاشی نظام فرسودہ ہو چکا تھا، اس لیے روایت سے بغاوت ایک فطری رد عمل تھا، محمدؐ نے اس سے فائدہ اٹھایا، مؤلف اس بات پر مصر ہے کہ آنحضرتؐ اپنے اس عقیدہ میں بالکل راسخ تھے کہ واقعی ان پر وحی نازل ہوتی ہے، عروج اسلام کا راز مؤلف کی رائے میں محمدؐ کی ذہنی قوت اور صلاحیت میں مضمر تھا، مؤلف موصوف اسی نتیجہ پر پہنچے جو ان کے پیش رو کا محبوب موقف تھا، یعنی محمدؐ نے اسلام کی بنیاد عیسائیوں کے زیر اثر ڈالی، بیسویں صدی کے متقدمین میں یہی لوگ اساطین مستشرقین تصور کیے جاتے ہیں، ان کی پوری فہرست میں دو ایک ہی اسکالر

ایسے ہیں جنھوں نے خواہ مصلحتاً ہی صحیح اسلام یا محمدؐ کا دفاع کیا ہو، یا نرم الفاظ استعمال کیے ہوں، ان میں چند اسما مثلاً کارلائل اور بوسورتھ اسمتھ قابل ذکر ہیں، آخر الذکر نے اپنی کتاب محمدؐ اور محمد نزم میں آنحضرتؐ کے خلاف یورپ کے وحشیانہ حملوں کی مذمت کرتے ہوئے آپؐ کو ایک عظیم فرد تسلیم کیا ہے، الفونسی (Alphonse Eliomme Dinet) نے ۱۹۲۰ء میں پیرس سے اپنی کتاب ''اللہ کے نبی محمدؐ کی حیات'' (The life of Muhammad: The prohhet of Allah) شائع کی اور رواداری کا ثبوت دیا، لاطینی خرافاتی مصادر کے بجائے ابن ہشام کی سیرت رسول اللہؐ اور ابن سعد کی طبقات وغیرہ کا مطالعہ کیا، اسی طرح جے سی، ارچر (J.C.Archer) نے اسپرنگر کے اسباب الامراض (Pathelogical School) کی مذمت کی اور کم از کم آپ کو ایک صوفی (My stic) کی حیثیت سے تسلیم کیا، غرض مدافعت میں اسی قسم کی دو چار مثالیں مشکل سے ملتی ہیں مگر ان میں سے کسی نے آنحضرتؐ کو دل سے نبی تسلیم نہیں کیا۔

جوں جوں ہم بیسویں صدی کے اختتام یا آخری ربع کی طرف بڑھتے ہیں مستشرقین کے رویہ میں نرمی کے بجائے شدت محسوس کرتے جاتے ہیں، بالشتی مستشرقین کا ذکر ممکن نہیں، البتہ ممتاز اساطین مستشرقین کا طائرانہ جائزہ یورپ کے اسی ذہن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے جو اسلام کے خلاف ۱۴ صدیوں سے برسر پیکار ہے اور لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصَارٰی کی نوع بہ نوع اور گونا گوں تفسیر کے مواد فراہم کرتا جا رہا ہے۔

ارنلڈ جے ٹوائن بی (۱۸۸۹ء-۱۹۷۵ء)(Arnold.J.Toynbee) کا نام علمی حلقوں کے لیے محتاج تعارف نہیں، اسی معروف مؤرخ نے دنیا کے ۲۶ سے زیادہ مذاہب اور کلچر کا مطالعہ کرنے اور چالیس سالہ دیدہ ریز محنت کے بعد مطالعہ تاریخ کی بارہ جلدیں تحریر کیں جن میں تین ملین حروف استعمال کیے گئے ہیں، مؤلف کے خیال میں تہذیب نو خاتمہ کے موڑ پر پہنچ چکی ہے، اب صرف وقت کا انتظار ہے، (شاید تیسری عالمی جنگ وقت

محدود ہو) اشتراکی نقطۂ نظر کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہوئے مؤلف رقم طراز ہے کہ انسان صرف معاش یا سماج کا خلیہ نہیں اس کی روحانی زندگی بھی ہے، اخلاقی اقدار بھی ہیں جس کے بغیر انسان اور کیڑے میں فرق نہیں، اشتراکی مکتب فکر میں انسان محض سماج کا خلیہ (Cell) بن کر رہ جاتا ہے اور اخلاقی اقدار کو روحانیات نہیں معاشیات متعین کرتی ہیں، مؤلف نے ثابت کیا کہ اخلاقی اقدار کا خاتمہ خدا کے ساتھ رابطہ کے اختتام کے مترادف ہے، مؤرخ موصوف نے اپنا نظریہ چیلنج اور رسپانس (Challenge and Responce) پیش کیا، یعنی جس درجہ کا چیلنج ہو اسی درجہ کا رسپانس ہونا چاہیے، اس تناسب کی برہمی ہی زوال امت کا سبب بن جاتی ہے۔

یورپ میں تاریخ کا جدلیاتی نظریہ پیش کیا گیا، یعنی ارتقا اور نمو کے لیے باہمی کشمکش ضروری ہے، اس نظریہ نے توافق للبقا کے بجائے تنازع للبقا کی روح پھونک ڈالی اور رقابت وحسد اور بین الاقوامی جنگوں کی بنیاد ڈال دی، بے رحمی اور سنگ دلی کا جذبہ پیدا کیا جس کی زندہ مثالیں دو عالمی جنگیں ہیں، ٹوائن بی دراسات اسلامیہ اور محمدؐ کے مطالعہ میں فلسفیانہ اصول وقواعد کو کام میں لایا، مؤلف کے تجزیہ کے مطابق آنحضرتؐ کا رول مکہ میں روحانی رہا مگر مدینہ میں انہوں نے روح کے ساتھ مادہ کی ایسی آمیزش کی کہ خود سیکولر حاکم بن بیٹھے اور ریاست اور مذہب کو مدغم کر دیا، مؤرخ نے آنحضرتؐ کی سیاسی شخصیت کو ابھارنے کی سعی کی ہے جو اس کی نظر میں اعلیٰ درجہ (First Rate) کی تھی، محمدؐ کے بارے میں مؤلف نے مڈیول دور کے نظریہ دغاباز یا ٹھگ اور کذاب ومکار (Imposter) کا انکار کیا ہے، مگر بطور تلخیص جو بات آنحضرتؐ کے بارے میں مؤلف مذکور نے پیش کی، اس سے اپنے تمام تحسینی کلمات پر پانی پھیر دیا، مؤلف رقم طراز ہے کہ محمدؐ کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ ملک عرب کے سیزر بن گئے، (جلد سوم آکسفورڈ ۱۹۳۹ء-۴۲۶) کہاں مکار سیزر اور کہاں پیغمبر اسلام؟ دونوں میں کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ یہ اس عظیم ذہن کی تلخیص ہے جس نے

عالمی مذاہب وثقافت کا مطالعہ کیا اور جس کی شخصیت میں بیسویں صدی کے ۳ ربع حصے ڈوب گئے اور جو عالمی حوالجات کا مصدر بن گیا۔

دوسرا عظیم نامی گرامی مستشرق بلاشیر ہے، اس نے ایک نیا فتنہ کھڑا کیا، یعنی آنحضرتؐ کی سوانح پر بحث کرنے کے بجائے مصادر و سیرت پر بحث شروع کی اور اعلان کر دیا کہ ان مصادر کو اس وقت تک استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک جدید تنقید کے تکنیکی اصول ان پر منطبق نہ کر لیے جائیں، یہ سازش واضح طور پر اس بات کی دعوت تھی کہ مصادر اسلامیہ جدید تنقیدی اصولوں پر نہ پورے اتریں گے، نہ ان کی ثقاہت ثابت ہو سکے گی! یہ وہی پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی گئی۔

نصف آخر بیسویں صدی کی اہم خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہمہ وقت و ہمہ دم (Full Time) اسلامی اسکالر وجود میں آ گئے، یعنی ان مستشرقین نے دراسات اسلامیہ ہی کو اپنا پیشہ (Career) بنا لیا، اس لیے کہ مغربی جامعات، انسٹی ٹیوٹ اور مراکز بحث و تحقیق میں اسلام کے مختلف سیاسی و معاشی، دینی و ثقافتی پہلوؤں پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا اور بڑے بڑے مطابع اور اشاعتی ادارے (Publishers) ہر چھ ماہ کے وقفہ پر مستشرقین کے دروازوں پر دستک دینے لگے کہ آیا اسلام کے متعلق (یعنی اسلام کے خلاف) کوئی تازہ ترین تالیف برائے اشاعت تیار ہے؟

(یہ بات راقم الحروف سے ایک عالمی شہرت کے نامی گرامی مستشرق نے امریکہ میں بتائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس روش سے نالاں ہیں، آخر ہر چھ ماہ پر کوئی مؤلف کیسے کتاب لکھ سکتا ہے) یعنی تجارتی اور کمرشیل مفادات نے بھی اسلام کے خلاف لٹریچر کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا، عالمی مواصلات بڑھتے گئے، دنیا سمٹتی گئی اور سارا عالم جام جمشید کی طرح کوزہ میں بند ہو گیا، دوسری عالمی جنگ کے بعد عالم اسلام استعمار کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوا، آزادی کی نئی لہر پھیلی، ایک طرف اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لیے مفکرین اسلام

مثلاً سید قطب، مولانا مودودی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی وغیرہ کے قلم کے تیر برسنے لگے، دوسری طرف مستشرقین کو اپنی بساط کے الٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔

مغربی جامعات میں یہود و نصاریٰ کا بڑا گروہ جو درحقیقت مشنری اسکولوں کا پروردہ اور تربیت یافتہ تھا، قلم لے کر اسکالرشپ کے میدان میں کود پڑا، فرداً فرداً سب کا ذکر محال ہے، البتہ ممتاز نمائندوں کا سرسری جائزہ نفسیات غرب اور استشراق کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے تاکہ لن ترضیٰ کی تفسیر مزید واضح ہوسکے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کا عظیم ترین مستشرق سر ہملٹن گب کو سمجھا جاتا ہے جن کا نام مسلمان اور مستشرق دونوں بڑے احترام کے ساتھ لیتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ان کی لیاقت، وسعت نظر، مطالعہ اور طرز نگارش میں کوئی دوسرا سبقت نہیں لے جاسکا، موصوف امریکی جامعہ میں راقم الحروف کے شعبہ کے صدر الصدور بھی تھے، وصال سے پہلے آکسفورڈ میں ۱۹۷۰ء کی آخری ملاقات میں راقم سطور نے کافی وقت مرحوم کے ساتھ صرف کیا، علالت کے باوجود جس محبت اور جوش و خروش کے ساتھ وہ پیش آئے لائق تحسین و ستائش ہے، خاص کر بیگم قدسیہ کے ساتھ حسن سلوک کا نادر نمونہ پیش کیا، اس مرض کی حالت میں اپنے علمی کارناموں، تحریری نسخوں اور خاص کر عربی خوش خطی کے جو نمونے دکھائے اور دوسری عالمی جنگ کے دوران لکھے ہوئے عربی مقالات و مضامین کا جو مجموعہ دکھایا وہ لائق حیرت ضرور تھا، ان تمام اخلاقی محاسن کا ہر فرد معترف ہوگا، خواہ وہ کسی مذہب اور مسلک کا ہو مگر اسلام کے بارے میں ایک ایسے روشن خیال عالم اور مستشرق کا رویہ کیا تھا، اس کا جواب نفی میں ہی دیا جاسکتا ہے، صرف دو ایک مثالیں کافی ہیں، موصوف کی کتاب محمدنزم (۱۹۶۲ء) خود بدمذاقی کا عظیم ثبوت ہے، گرچہ اب اس کا نام اسلام رکھ دیا گیا ہے مگر مؤلف کے مضامین اظہر من الشمس ہیں، اپنی معروف تالیف ''اسلام میں جدید رجحانات'' ۱۹۴۷ء (Modern Trends in Islam) میں اسلام کے بارے میں بے حد دلسوز باتیں تحریر کی

ہیں، چھٹے باب میں اسلام اور اس کے عالمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں کہ اسلام درحقیقت محمدؐ کے جذباتی مغلوبیت کا ایک ہیجانی دین (Emotion of cult) تھا، جدید رجحانات کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ جدید معقول دینیات (Rational Theology) اب محمدؐ کے ہیجانی دین (Emotional Cult) پر غالب آ گئی ہے یعنی جدت قدامت پر اور بغاوت روایت پر غالب آ گئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ عالم اسلام میں مسلم حکمرانوں اور روشن خیال مغربی تعلیم یافتہ افسران کے ہاتھوں جو اسلام کشی کی تحریک ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمدؐ کا جذباتی مذہب اب عقلیت سے تبدیل ہوتا جا رہا ہے، مؤلف یورپ کی بدقسمتی پر نوحہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یورپ کی روحانی تحریک اسی جذباتی مذہب کے زیر اثر عربی ادبیات کے ذریعہ میڈیول دور میں یورپ پہنچی، پھر اٹھارہویں صدی میں الف لیلہ وغیرہ کے ذریعہ جذباتیت کا آسیب یورپ کے سر پر سوار ہو گیا، براعظم ہندوپاک کی اسلامی تحریکات اور تحریک جدید سے بحث کرتے ہوئے مؤلف علی گڑھ اسکول اور سرسید کی تعریف کرتے ہیں، ساتھ ہی غلام احمد بانی قادیانیت اور قادیانی تحریک کی زوردار حمایت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ اسلام میں احمدیہ تحریک نے ہی تجدید کو آگے بڑھایا، ایک نئے مذہب کو وجود میں لایا اور رواداری کے ساتھ تحریک اصلاحات پر زور دیا، جو لوگ قدیم اسلام میں عقیدہ کھو چکے تھے ان میں تازہ ایمان پیدا ہوا، علامہ محمد اقبال کسی بھی مسلم قاری کے لیے محتاج تعارف نہیں، نہ ہی کوئی تعلیم یافتہ علامہ کی اسلام دوستی یا فکر و نظر اور مغربی تہذیب پر نقد و جراحت سے ناواقف۔

پروفیسر گب علامہ اقبال کو مجموعہ اضداد قرار دیتے ہوئے ان کی معروف تصنیف کی دھجی اڑاتے ہیں اور اقبال کو مجموعہ تضاد (Moss of Contradiction) قرار دیتے ہیں، معروف فرانسیسی مستشرق رینان (Rennan) نے اسلام کو معقولیت یا عقلیت کا ناقابل علاج دشمن (Incurable enemy of Islam) بتایا تھا، پروفیسر گب نے اسلام کو تاریخی افسانہ

یا جھوٹ (Historical Romence) سے تعبیر کیا جس میں معقولیت کا عنصر کم ہے اور تخئیل کا عنصر زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ تخئیل کی زندگی عقلیت کے مقابلہ میں مختصر ہوتی ہے، اسی لیے اسلام جلد زوال پذیر ہوا۔

حی القائم معروف مستشرق مانٹگمری واٹ کی روداد اور انصاف پسندی کا چرچا خاصہ ہے، ان کی تین معروف تالیفات مغرب اور مشرق دونوں جگہ مقبول ہیں، محمد در مکہ (۱۹۵۳ء) محمد در مدینہ (۱۹۵۶ء) اور محمد من حیث نبی اور اسٹیٹمین (۱۹۶۱ء) کی دھوم مچی اور اگر بغور دیکھا جائے تو مؤلف کے موقف میں روایتی موقف سے زیادہ نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے، یہ تصور موجود ہے کہ محمد مکہ میں کچھ اور تھے اور مدینہ میں کچھ اور ہو گئے، یہ قدیم موضوع بحث ہے، اس میں نیا پن نہیں، خود ٹوائن بی نے یہی موقف اختیار کیا ہے، پروفیسر واٹ نے ان کتب میں آنحضرتؐ اور اسلام کے منظر و پس منظر کا تحلیلی مطالعہ کیا ہے جس کے ذریعہ وہ اسلام کی اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں، اول الذکر دو کتابیں سیرت محمدؐ سے متعلق ہیں، آنحضرتؐ کے تاریخی اور سوشل پس منظر میں آپ کے کارناموں اور زندگی کا تجزیہ ہے، مکہ کے سوشل اور معاشی حالات کی تحلیل ہے، یہ موضوع بھی اچھوتا یا جدید نہ تھا، مؤلف یورپ کے وحشیانہ حملوں کے خلاف آنحضرتؐ کا دفاع ضرور کرتا ہے، اس کے خیال میں محمدؐ کے عظیم کارناموں کی روشنی میں وحشیانہ حملے غیر موزوں ہیں۔

محمد در مدینہ ص ۳۳۵ تیسری کتاب جو اول الذکر دو جلدوں کی تلخیص بھی ہے اس لیے قابل توجہ ہے کہ اس میں مؤلف نے آنحضرتؐ کی نبوت اور اخلاص کو تسلیم کیا ہے، یہ موقف بھی نیا نہ تھا، اس سے پہلے بھی یہ موضوعات زیر بحث آ چکے تھے، ان کتابوں میں وہ کلام پاک پر حملے برابر کرتے ہیں، وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا نزول وحی کے ذریعہ سے ہوا۔

برناڈ لوئس امریکی مستشرق حی القائم ہے اور اسلام دشمنی کے لیے معروف بھی ہے

جس کی تازہ ترین مثال اس کا وہ مقالہ ہے جو امریکن اسکالر نامی مجلّہ شمارہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے، اس کے صفحہ ۳۷ پر مؤلف قرآن کریم کا موازنہ جرمنی کے ایک وحشی رزمیہ کے ساتھ کرتے ہیں، وہ رزمیہ جس سے معروف جرمن موسیقار واگنر نے اپنے بعض اوپرا اخذ کیے تھے، اس سے زیادہ مضحکہ خیز اسکالرز شپ اور کیا ہوسکتی ہے، یہی اساتذہ امریکی جامعات میں دراسات اسلامیہ کے سربراہ ہیں، دوسری مثال ریڈرز ڈائجسٹ کے ایڈیٹر انتہائی پال کی ہے جس نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مذہب ساتویں صدی عیسوی کی ریگستانی اور وحشیانہ و بدویانہ سوسائٹی کے لیے آج سے دس صدی قبل وضع کیا گیا تھا (ریڈرز ڈائجسٹ جنوری ۱۹۸۱ء ص ۱۰۲) ایک عالمی اور شہرۂ آفاق پرچہ کے ایڈیٹر کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہوچکی ہیں اور اسلام اب پندرہویں صدی کے مدار میں داخل ہوچکا ہے، یہ واضح رہے کہ ریڈرز ڈائجسٹ کی پندرہ زبانوں میں ۳۰ ملین کاپیاں اور ۲۹ ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور عام طور پر ہر تعلیم یافتہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

یہ ہے چودہ سو سالوں کا ایک تاریخی زائچہ جو سرسری طور پر پیش کیا گیا ہے، مستشرقین کی اسکالر شپ اور مغربی مجلّات و رسائل اور چھاپہ خانوں اور مطابع کی واضح اسلام دشمن پالیسی اور تفسیر لن ترضی عنک کے ساتھ ناظرین کے سامنے ہے، ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک موقف میں فرق نہیں آیا۔

مغربی جامعات میں دراسات اسلامیہ کی مشکلات عملی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں: مغربی یا امریکی جامعات میں علوم اسلامیہ مثلاً تاریخ اسلام، عقائد و علم کلام یا فلسفہ کا مطالعہ نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے، یہاں مسلم طلبہ اور اساتذہ کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہیں جو اپنے دین حنیف سے محبت کی بنا پر تمسیخ دین کے لیے تیار نہیں، ان کے لیے دو ہی راہیں کھلی ہوئی ہیں، یا تو اسلامی مضامین چھوڑ کر دوسرے مضامین کا انتخاب کریں یا پھر جامعہ ہی کو خیر باد کہیں، بہت سے

طلبہ جنہوں نے اپنے دین کی حفاظت کے ڈگری کی پرواہ نہیں کی وہ جامعہ ترک کرنے پر مجبور ہوئے، اس لیے اساتذہ یا مشیران تعلیم اور ایڈوائزر سے ذہنی تصادم کے بعد وہاں رہنا مشکل تھا، بعض حالات میں اسکالرشپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے، ایسے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، طلبہ واساتذہ کی دوسری قسم افسوسناک حد تک مایوس کن ہے، اس گروہ کو سفندان میں ایسے مسلم اساتذہ اور طلبہ موجود ہیں جو ذاتی منفعت، یہود ونصاریٰ اساتذہ کی خوشنودی، ملازمت میں استحکام اور تقرری کی آرزو میں نہ صرف اسلام پر حملوں کو برداشت کرتے ہیں، بلکہ خود بھی ایسے مقالات تحریر کرتے ہیں جن میں اسلام پر صریح حملے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ایک طالب علم نے استاذ کو خوش کرنے کے لیے خلفائے راشدین میں سے ایک خلیفہ پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ خود عیسائی استاذ نے تبصرہ میں لکھ دیا کہ زیر بحث خلیفہ کے ساتھ طالب علم نے ناانصافی کی ہے اور ظلم بھی۔

امریکی اورینٹل کانفرنس کا ایک سالانہ جلسہ نیویارک میں منعقد ہوا، راقم سطور بھی مدعو تھا، ایک مستشرق نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ نے قرآن کی تالیف میں ام المومنین ماریہ قبطیہؓ سے کیا کیا استفادے کیے، مقالہ کے اختتام پر لوگوں نے مبارک باد پیش کی، مقالہ نگار کو داد تحسین پیش کرتے ہوئے ایک مسلمان پروفیسر نے کہا ''سبحان اللہ! کیا ریسرچ اور تحقیق تھی، ہم ان معلومات سے محروم تھے'' جزاک اللہ وغیرہ۔

راقم الحروف پروفیسر مذکور کی پشت پر ہی کھڑا ہوا تھا جس کا علم پروفیسر صاحب کو نہ تھا، جب وہ پلٹے اور دیکھا کہ راقم سطور نے انہیں اس قسم کی داد تحسین دیتے ہوئے سن لیا تو وہ پانی پانی ہو گئے اور پھر کبھی آنکھیں دوچار نہ کر سکے، یہ خوشامدانہ کلمات تحسین محض اس لیے پیش کیے گئے کہ ان کی ملازمت کے دوام واستحکام میں ان کی اعانت ہو سکے، مگر استاد مذکور کچھ دنوں بعد بڑی رسوائی کے ساتھ جامعہ سے نکالے گئے، ایک طالب علم نے جو اسلامی عقائد کو اپنی زیست کی علامت اور اپنے وجود کا تعارفی نشان تصور کرتا تھا، ایک مقالہ

''قرآن اور ابتدائی اسلامی کلچر''یعنی ابتدائی اسلامی کلچر کے ارتقا میں قرآن کا کیا کردار (رول) رہا ہے، کے عنوان سے ایک جامعہ میں پیش کیا، نگراں پروفیسر نے مقالات کو اس کے سامنے اس تبصرہ کے ساتھ پھینک دیا کہ بھلا یہ بھی کوئی علمی مقالہ ہوا جس میں نہ تو محمدؐ پر تنقید کی گئی ہے، نہ ہی قرآن پاک پر نقد و جرح ہے، محمدؐ نے (نعوذ باللہ) مکہ اور مدینہ میں کیا کیا چولے بدلے، اس کا کوئی ذکر بھی نہیں، ان نظریات کے ساتھ تو مغربی یا امریکی جامعات میں سے کسی جامعہ میں گزر بسر ممکن نہیں، متعلم مذکور نے یہ کہہ کر کہ وہ ڈگری کے لیے اپنے ایمان اور عقائد کا سودا کرنے کو تیار نہیں، استاذ مذکور کا کورس چھوڑ کر دوسرا کورس لے لیا، ایک مسلم منتہی طالب علم ایک معروف اور نامی گرامی مستشرق کے زیر تربیت تھا اور ساتھ ہی ایک معروف مسلم استاذ یا اسکالر کا جو مستشرقین سے بھی بازی لے جانے کو تیار تھے، پروردہ تھا، اس نے اسلام پر ایک تقریر کے دوران اسلامی عقائد اور ایمان بالغیب پر ایسی باتیں عرض کرنے لگا جیسے کوئی معتزلی قبر سے اٹھ کر آ گیا ہو، وحی پر حملے کرتے ہوئے عرض کیا کہ اسلام عام طور پر تقلید پر زور دیتا ہے اور آزادی فکر یا عقل اور معقولیت سے دور لے جاتا ہے، اس قسم کے جملے عام طور پر مستشرقین کے محبوب مضامین ہیں، ایسے ذہین نوجوان جب تربیت پا کر مسلم ممالک میں واپس آتے ہیں اور اعلیٰ عہدوں اور مناصب اقتدار پر فائز ہوتے ہیں تو مظلوم اسلام کے لیے مقتل سجاتے ہیں، آج عالم اسلام اسی المیہ سے دوچار ہے، یہ کوئی معمولی فتنہ نہیں ہے، یہ امر فوری طور پر محتاج توجہ ہے۔

تجاویز: مباحث بالا کی روشنی میں حسب ذیل تجاویز پر غور کرنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے، ورنہ سمینار اور کانفرنس محض نشستند و گفتند و برخاستند کے مترادف ہوں گی، چونکہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کی یہ عظیم تاریخی کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء سنگ میل اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے ٹھوس تجاویز پر غور و فکر کی فوری ضرورت ہے، ان تجاویز میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

۱۔ قرآن کریم کی ہدایات کی روشنی میں آیت کریمہ لَنْ تَرضٰی عَنکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصَارٰی کو رہنما اصول تسلیم کر لیا جائے، تاکہ اسلامی دانش گاہیں اور مسلمان دانشوران، ریسرچ ادارے اور محققین سب واضح ذہن کے ساتھ مستشرقین کی تالیفات کا مطالعہ کریں اور نقد سے صرف نظر نہ کریں، مسلم حکمرانوں نے آیات قرآنی سے سرتابی کے بعد جو سزا پائی ہے اور جس کی مثالیں آج سب سے نمایاں ہیں، اس کا اثر سارے عالم اسلام پر ظاہر ہے، اسلامی ریسرچ کو اس انحطاط اور زوال سے محفوظ کرنے کے لیے ان آیات کی روشنی میں واضح پالیسی مرتب کرنے کی ضرورت ہے، ہماری جامعات میں عربی و فارسی مصادر سے ناواقف مسلم اساتذہ ہی مستشرقین کی تالیفات پر بھروسہ کر کے اعتماد کے ساتھ اپنے طلبہ کو زہریلا مواد پلا دیتے ہیں، عربی سے ناواقفیت کی بنا پر وہ مجبور و معذور ہو چکے ہیں، ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے وہ خود عربی، فارسی یا اردو کتب کا مطالعہ کر سکیں، ہند و پاک کے اساتذہ کا بھی یہی رویہ ہو گیا ہے۔

۲۔ یورپ کی زبانوں میں جو کثرت سے مستعمل ہیں، مثلاً انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ میں علوم اسلامیہ پر بکثرت لٹریچر فراہم کیا جائے، اردو، فارسی اور عربی کتب کے تراجم کے ساتھ ساتھ اسلامی ادب وافکار کا ذخیرہ فراہم کیا جائے، مستشرقین کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انہوں نے اسلام دشمن لٹریچر کا دروازہ کھول دیا جس نے ہر مسلم گھرانے، جامعات، بازار اور دوکانوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور خام تربیت یافتہ مسلم ذہنوں کی تغسیل کا بہترین آلۂ کار بن گیا۔

۳۔ خالص اسلامی لٹریچر کی ترویج کے لیے تین اہم مراحل درپیش ہیں:

الف: ایک ایسا اشاعتی پریس قائم کیا جائے جہاں عالم اسلام کے اسکالر اپنی کاوشات اور ریسرچ پروجکٹ کی اشاعت کرا سکیں، مغرب کے پریس نے یہی کام انجام دیا ہے، عالم اسلام کے بہترین مفکر اور اسکالرز اپنی فکری کاوشات کی اشاعت سے اسی لیے

محروم ہیں کہ اس کا کوئی نظم نہیں ہے، اسی لیے عالم اسلام میں نہ تو زرخیز ذہنوں کے تحفظ کا احساس ہے نہ ہی اس کا کوئی نظم کیا گیا ہے، یورپ میں احتفاظ، لیاقت و ذہن ایک مستقل علمی تحریک بن چکی۔

ب: ایک دارالترجمہ قائم کیا جائے جہاں عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کے تراجم ممتاز مغربی زبانوں میں کیے جاسکیں اور طباعت کے بعد انہیں عالمی مارکٹ میں فراہم کیا جائے، مستشرقین کے علمی سیلاب کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ اسی قوت و طاقت کے ساتھ انشائی اسلامی ادب فراہم کیا جائے۔

ج: عالمی مسلم اسکالرز کا ایک انڈکس تیار کیا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ دنیا میں مسلم اسکالرز کن کن موضوعات پر اور کہاں کہاں ریسرچ میں منہمک ہیں، اس انڈکس کے ذریعہ تکرار موضوعات اور تضییع اوقات دونوں سے بچا جاسکتا ہے اور بین الاقوامی تعاون اور اشتراک فکر و نظر کی تحریک پیدا کی جاسکتی ہے، اس تعاون اور موالات کی آج بے حد کمی ہے بلکہ عالمی اسکالرز کا تعارف تو کجا ان کے کارناموں سے بھی واقفیت نہیں ہے، یہ تعارفی انڈکس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوگا۔

۴۔ یورپ میں تیار کردہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ کرانے کے بجائے ایک نیا اسلامی انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جائے جس میں لکھنے والے سرتاسر مسلم اسکالرز ہوں، اس میں دیر لگ سکتی ہے مگر یہ تاخیر باعث تشویش نہیں، یورپ میں جو اسلامی انسائیکلو پیڈیا تیار کیا گیا ہے اسے قطعی مسترد کر دیا جائے اور ان پر اعتماد کرنے کے بجائے خالص مسلم اسکالرز کی تحقیقات اور کاوشوں کو مراجع اور مصادر اصلیہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔

۵۔ مذکورہ بالا پروجکٹ کے لیے مالیاتی فنڈ کی ضرورت ہوگی، اس فنڈ کو اسلامی لٹریچر تیار کرنے، سمینار اور کانفرنس کے انعقاد اور دیگر اشاعتی کاموں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، بہت کم لوگ کو معلوم ہے کہ مستشرقین کی اسلام دشمن تالیفات کی اشاعت میں

چرچ کا فنڈ کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور عالمی مشنری کو جو ملین در ملین ڈالر کی رقمیں ملتی ہیں وہ عیسائی حکومتوں اور عوام دونوں کا عطیہ ہوتی ہیں، تاکہ ایک طرف جہاں مسیحی مذہب کی اشاعت و ترویج کا اہتمام کیا جائے وہاں اسلام کے خلاف (جو ان کے خیال میں عیسائیت کا دشمن ہے) لٹریچر کا انبار لگا دیا جائے۔

۶۔ ضرورت ہے کہ مسلم ممالک کی جامعات میں خالص ریسرچ اسکالر اساتذہ کا تقرر عمل میں آئے، یہ اساتذہ سال بھر تعلیم و تدریس، لکچرز اور امتحانات میں مصروف ہونے کی وجہ سے ریسرچ کا کام کرنے سے معذور و مجبور ہوتے ہیں، غیر معمولی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ تحقیقی مشاغل مشکل ہیں، یورپ کے اکثر ممالک میں خاص کر فرانس جو مادر افکار کے نام سے معروف ہے، تدریسی اساتذہ کے ساتھ خالص ریسرچ پروفیسر کا تقرر ہوتا ہے جو سال بھر صرف ریسرچ کرتے رہتے ہیں، تدریس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس طرح گوناگوں افکار و خیالات کے ذریعہ وہ اپنی ملت کو فکری طور پر زرخیز رکھتے ہیں اور ذہنی خشک سالی اور قحط الرجال سے قوم و ملک کو بچاتے رہتے ہیں، یہاں تدریسی و تحقیقی اساتذہ کی تنخواہیں برابر ہوتی ہیں اور بعض اساتذہ حکومت یا ریسرچ اداروں کے متعین کردہ پروجکٹ پر کام کرتے ہیں اور بعض خود اپنا پروجکٹ حکومت یا ریسرچ اداروں سے منظور کروالیتے ہیں اور پھر ان پر ریسرچ کرتے رہتے ہیں، افکار نو کی اپج اور ذہن کی یہ زرخیزی ہی یورپ کی زیست کا سامان فراہم کرتی ہے، ضرورت ہے کہ اسلامی حکومتیں اور ان کی ریسرچ اکیڈمیاں وغیرہ فوری طور پر اس طرف توجہ کریں اور تعلیم و ریسرچ کو قومی منصوبوں میں اولیت دیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ ۵۸:۱۱)	اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا درجے بلند کرے گا۔

علم و ایمان ترقی کے لیے جزو لاینفک ہیں۔

۷۔ مستشرقین کے ساتھ الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک طرف اسلامی ادب کا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور دوسری طرف مستشرقین کی تالیفات کا تحلیلی مطالعہ کیا جائے، مستشرقین کی ایک اہم پالیسی یہ بھی رہی ہے کہ نت نئے مسائل اور اعتراضات اٹھائے جائیں اور اسلام کے خلاف پے در پے حملے کیے جائیں تا کہ مسلم محققین اپنی تمام تر ذہنی وفکری قوتیں بجائے مفید کاموں کے ان حملوں کے جوابات میں صرف کرتے رہیں اور اس طرح انہیں کبھی اس کا موقع نہ مل سکے کہ وہ اپنا فکر خیز اسلامی ادب منظر عام پر لا سکیں، اس پالیسی کو اب تک کماحقہ نہیں سمجھا گیا ہے، مسلم اسکالرز کا ایک طبقہ اساطین مستشرقین کی ایک ایک کتاب کا تقابلی مطالعہ ضرور کر سکتا ہے، اس کی اشد ضرورت ہے کہ ترجمے یا اڈیٹنگ کے نسخوں کا اصل عربی متن سے مقابلہ کیا جائے، لغوی اور معنوی تسامحات کا جائزہ لیا جائے، اس طرح ایک خالص علمی اور تنقیدی ادب کو منظر عام پر لایا جائے تا کہ عوام کی نظر ان تسامحات پر بھی رہے جن پر محض علم وتحقیق کا غلاف پڑا ہوا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان تالیفات میں تمسیخ علوم اسلامیہ اور تاریخ اسلام کی دانستہ نفی کی گئی ہے اور یہ لن ترضٰی کی عملی تفسیر بھی ہیں، کسی ایک مستشرق کا احاطہ ایک مسلم اسکالر کے بس کی بات نہیں ہے، فرداً فرداً ہر تالیف کی تحلیل وتفرید کے لیے ایک نہیں متعدد مسلم دانشوروں کی ضرورت پڑے گی، تا کہ وہ دیانت وامانت کے ساتھ بلاتعصب مستشرقین کا علمی محاسبہ کر سکیں اور ان عوامل و محرکات کا تجزیہ کر سکیں جو ان تالیفات کا سبب بنیں، کوئی ایسا مستشرق نہیں ملے گا جس کا دامن تعصب کی آلائشوں سے پاک ہو یا صادق الامین ہو یا خالص علمی وتحقیقی جذبہ کے ساتھ دراسات اسلامیہ کی طرف مائل ہوا ہو۔

جن مستشرقین نے بڑے زور وشور کے ساتھ برملا اسلام کی تعریف کی ہے، ان کے جادو سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے اصل منشا اور مقصد پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے، بعض اوقات قاری مستشرقین کی پانچ اور چھ سات سو صفحات پر مشتمل کتاب

پڑھ جاتا ہے، اس میں اسلام کی تعریف ہی تعریف نظر آتی ہے، لیکن اخیر میں مؤلف کے تلخیصی کلمات کو پڑھ کر وہ ششدر رہ جاتا ہے، ضخیم کتاب کا مؤلف اپنی تعریفات کے بعد لکھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمدؐ کاذب تھے اور اسلام یہودی و عیسائی مذاہب کا چربہ ہے، ہمارے اعتذاری مسلم نوجوان جو مستشرقین کی اسکالرشپ سے بے حد متاثر ہیں اور ان کی تعریفات میں رطب اللسان بھی ہیں، ان سے تعارض کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انہوں نے نہ تو کسی ایک مؤلف کی پوری فکری شخصیت کا تجزیہ کیا ہے، نہ ہی اس کی تمام تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، ادھر ادھر سے مطالعہ کے بعد اپنی رائے قائم کرلی، یا دیگر اصحاب کے تبصروں پر اپنی رائے کی اساس ڈالی، یہ بے حد خطرناک علامت ہے، یہ کہنا کہ کارلائل نے اسلام کے بارے میں خوب لکھا ہے، گبن یہ کہتا ہے، ٹوائن بی یہ کہتا ہے اور ولیم میور نے اس کا اعتراف کیا ہے، وغیرہ وغیرہ کلمات بے حد خطرناک ہیں، کیونکہ کم علم طالب علم ان کلمات سے متاثر ہوکر مغالطہ میں آجاتا ہے اور اس پورے زہر کو پی جاتا ہے جو ان مؤلفین نے شکر میں لپیٹ کر شوگر پل کی طرح اپنے صفحات میں پیش کیا ہے اور جب وہ کتاب کے اختتام پر پہنچ کر تلخیصی کلمات پڑھتا ہے تو اس کے دماغ میں اسلام کے بارہ میں بعینہٖ وہی سوالات، شکوک اور شبہات پیدا ہوجاتے ہیں جو مستشرق مؤلف پیدا کرنا چاہتا ہے، بچے کو تلخ دوا یا تو شکر ملا کر یا شربت کا رنگ دے کر دھوکے سے پلا دیا جاتا ہے اور بچہ اسے پی بھی لیتا ہے لیکن ایک دانا و فرزانہ کے لیے اس تلخی کو گھونٹنا مشکل ہے۔

مندرجۂ بالا مباحث سے مستشرقین کی تلخیصات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ زہر کو کس طرح نئے جام میں گھول کر پلا دیتے ہیں، یہاں پر ایک اور مثال بے حد ضروری ہے اور مفید بھی، یہ ایک کلاسیکی مثال ہے جس پر دوسروں کا قیاس بھی کیا جاتا ہے۔

اسپین کی میڈرڈ یونیورسٹی میں عربی ادبیات کے استاد پروفیسر پلاسیوس نے ۱۹۱۹ء میں اپنی کتاب میڈرڈ سے شائع کرائی، تحقیق کا موضوع دانتے کے اصل مصادر کی سراغرسانی

تھا، پچیس سالہ تحقیق و جستجو کے بعد مؤلف اس نتیجہ پر پہنچا کہ دانتے کی شہرۂ آفاق کامیڈی، بنیادی خیالات میں نہ صرف واقعۂ معراج رسولؐ کے مشابہ ہے، بلکہ معراج سے متعلق دیگر ادبی و دینی مواد مثلاً ابن عربی کی فتوحات اور معری کی رسالہ الغفران کے مضامین کا چربہ بھی ہے اور ساخت اور نمونہ میں ہو بہو ان کی نقل بھی، معمولی تبدیلیوں مثلاً ناموں کے فرق کے ساتھ وہی خیالات اور نمونے پیش کیے گئے ہیں جو احادیث معراج میں موجود ہیں۔

تحقیق کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ سنسنی خیز تھا، مؤلف نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود عیسائی مذہب نے بے شمار اسلامی تصورات کو اپنایا ہے، ان میں حیات بعد الممات اور جزا و سزا کا واضح عقیدہ خاص اسلامی ہے جسے عیسائیت نے اپنا لیا، عیسائیت کے اندر حیات بعد موت کا تصور ہی نہیں تھا، غرض اسلامی عقیدہ بعد میں چرچ کا اور چرچ کے پادریوں کا ممتاز عقیدہ بن گیا، مؤلف نے یہ بھی ثابت کیا کہ پادریوں کے روحانی سفر کے مختلف واقعات اور داستانیں واقعۂ معراج کی نقالی ہیں، یہاں پر یہ امر واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ مؤلف کی یہ تحقیقات اسلام دوستی پر مبنی نہیں، جب اسپین اور اٹلی کے درمیان قومیت اور عصبیت کی آگ بھڑکی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلی تو اسکالر بھی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں تیل ڈالنے لگے، میڈرڈ کے پروفیسر نے اٹلی کو کمتر ثابت کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا، اطالوی ادب کے بائبل یعنی دانتے کی کامیڈی کو مسرت زا قرار دیا، یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ دانتے نے اتنا سارا مواد واقعۂ معراج اور احادیث معراج سے اخذ کیا ہے لیکن پلاسیوس کے اندر اٹلی کے خلاف نفرت کا جذبہ تھا، مؤلف خود ایک کیتھولک پادری تھا اور اسی عام مسیحی نظریہ کا حامی بھی تھا جس پر عیسائی روز ازل سے عقیدہ رکھتے ہیں، اصل ہسپانوی کتاب کا انگریزی ترجمہ و تلخیص ۱۹۱۶ء میں لندن سے اسلام اور ڈوائن کمیڈی کے زیر عنوان ہیرالڈ سنڈرلینڈ نے پیش کیا، اصل ہسپانوی کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۴۳ء اور انگریزی ترجمہ کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ لندن

۱۹۲۶ء راقم الحروف کے مطالعہ میں ہے، مترجم نے اصل سے بعض اسناد وغیرہ حذف کر دی ہیں لیکن اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے (کتاب کا دوسرا تازہ ترین انگریزی ایڈیشن بھی جو ۱۹۶۸ء میں ۲۹۵ صفحات پر مشتمل ہے شائع ہو چکا ہے) شروع سے آخر تک اس کتاب کا مطالعہ نہایت صبر آزما ہے، دانتے بلکہ دین مسیح پر من حیث مجموعی اسلامی اثرات کی فہرست دیکھ کر قاری خوشی محسوس کرتا ہے، مؤلف کو فراخ دل، غیر متعصب، منصف، روادار قرار دیتا ہے مگر کتاب کے آخر میں مؤلف نے لن ترضی کی تفسیر پیش کر دی اور اسی عام مسیحی عقیدہ کا اظہار کر دیا یعنی اسلام یہودی اور عیسائی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (ملاحظہ ہو مؤلف کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ایڈیشن ۱۹۱۷ء آخری صفحہ ۲۷۷ کا آخری پیراگراف)

ان حقائق سے یہ بات قطعی آشکار ہے کہ مستشرقین کا خانوادہ، خواہ مشرقی چرچ کا پروردہ ہو، خواہ مغربی چرچ کا، عقائد میں مختلف نہیں، اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں بھی مختلف نہیں، شعر و ادب کے مطالعہ میں پاسیوز نے ۲۵ سال صرف کیے اور آخر میں ثابت کر دیا کہ دانتے کی شاعری مجموعۂ سرقات ہے اور معراج محمدؐ سے ماخوذ ہے (اگرچہ محمدؐ نبی کاذب تھے اور اسلام دھوکہ کی ٹٹی ہے) آج ہمارے بعض دانشوران مستشرقین کے بڑے مداح ہیں جو مسلم شعرا اور ادبی سرمایہ کو مغربی زبانوں میں منتقل کر کے اہل مغرب کو اسلامی کلچر اور ثقافت سے متعارف کرا رہے ہیں، ہم نہ تو اس کے مخالف ہیں نہ ہی اس کے خلاف تعصب کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، البتہ چند گوشوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلے مسیحی مشنری اسلام کے خلاف محاذ آرا تھی، صدیوں کی انتھک جنگ کے بعد مشنری والوں کو یقین آ گیا کہ تبلیغی پلیٹ فارم سے قرآن و حدیث اور علوم اسلامیہ پر حملہ ناکام رہا، انہوں نے اسٹریٹیجی بدل ڈالی، مشنری مبلغین کو تعلیمی عبا و چغا پہنا کر جامعات میں علوم اسلامیہ کے اسکالر کی حیثیت سے گھسا دیا اور سارے عالم میں دھوم مچا دی کہ فلاں شخص دنیا میں اسلامی قانون کا ماہر ہے اور فلاں فلسفہ و کلام کا ماہر ہے اور فلاں اسلامی ادب اور

شعر وسخن کا ماہر ہے، وغیرہ وغیرہ، مغربی جامعات میں سامی شعبوں سے آزاد اور مستقل بالذات ادارے کھولے جانے لگے، کہیں ان کا نام شعبہ جات دراسات اسلامیہ رکھا گیا اور کہیں ادارۂ دراسات شرق اوسط کا نام دیا گیا، وغیرہ وغیرہ، جامعات کے ان اداروں نے اسلام دشمن ادب کا انبار لگا دیا، میدان جنگ صلیب میں تلوار سے قتل کرنے کے بجائے جامعات میں ہی مقتل سجائے گئے، بقول عارف اکبر ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

جب مستشرقین نے محسوس کیا کہ اسلام دشمن ادب بھی بے اثر ہو رہا ہے، اس کی قوت ٹوٹتی جا رہی ہے تو انہوں نے نیا مدخل تلاش کیا، وہ مدخل دینیات کے بجائے قدیم کلچر اور تاریخ کا مدخل تھا، جس طرح اشتراکی نے پیٹ کے راستہ سے گھس کر دنیا میں ہلچل مچا دی، اسی طرح بعض مستشرقین نے کلچر کے نام پر عالم اسلام میں ہلچل مچا دی، فراعنۂ مصر کا مطالعہ کیا اور اسلام کو کلچر دشمن مذہب قرار دے کر خود اہل مصر میں فراعنۂ مصر کے ساتھ ہمدردی پیدا کر دی اور اسلام کو غاصب قرار دینے کی تحریک چلا دی، ایران میں سائرس سے ایسی محبت پیدا کی کہ اسلام کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی، پاکستان میں موہنجوڈارو اور ہڑپہ کی تمجید اور انڈس ویلی تہذیب کی حمد وثنا میں تحریری تحریک چلائی، ایک طبقہ نے اسلام کو حملہ آور اور غاصب قرار دے کر اسے کلچر وثقافت کا دشمن قرار دے دیا، شعرا نے اس پر نظمیں لکھیں اور اپنا رشتہ محمد بن قاسم کے بجائے راجہ داہر سے قائم کرنا شروع کر دیا، "کلچرل مسلم" کی نئی تحریک چل پڑی، یعنی ہم بطور حادثہ مسلم کلچرل حلقہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلم ہیں، مذہبی مسلم کہنے کے بجائے کلچرل مسلم کہنا زیادہ مفید ہوگا، ان موضوعات پر مستشرقین کی تصنیفات موجود ہیں جن کی تفصیلات کا یہاں موقع ہے نہ ہی وہ موضوع کا حصہ ہیں۔

بعض مستشرقین شعر وادب کے راستہ سے گھسے اور اقبال وغالب وحالی کے نام پر دراسات کا سلسلہ شروع کیا جو بلاشبہ خوش آئند اور محمود اقدام تھا، اقبال بعض کی نظر میں

مجموعۂ تضاد قرار پائے اور محمدؐ کے عصباتی دین کے مبلغ بھی، یہاں پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ شعر و ادب کے مطالعہ میں بھی عقائد کا ٹکراؤ لازمی ہے، فن میں عقیدہ کی آمیزش فطری امر ہے، رومی ہوں یا اقبال، ابن عربی ہوں یا بوصیری، ان کے کلام و پیام میں اسلامی عقیدہ، تصوف، روحانیت، غیر مرئیات و ماورا کا سارا کا سارا نظام رچا بسا ہوا ہے، ان کے فن سے اگر ان کا پیام نکال دیا جائے تو وہ صرف ردیف و قافیہ اور الفاظ کا ڈھانچہ ہی رہ جائے گا، فن کار میں ازلی ربط ہے، فن کار کے عقائد اس کی انشائی ذات کا نہ صرف حصہ ہیں بلکہ اس کے فن کی فعال روح بھی، ہر فن کے اندر فنکار کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے، دنیا کا کوئی عظیم شاعر یا اس کا فن اس کے عقیدہ سے مبرا نہیں ہوسکتا، بلکہ شعری و ادبی مواد و ہیئت تک میں فن کار کی ذات تحلیل ہو جاتی ہے، فن کا جمالیاتی شعور دینی و سیاسی، سماجی بلکہ معاشی عقائد تک اس کے فن کا حصہ ہیں، وارداتِ قلب اور کوائفِ نفس کے ساتھ یہ عقائد بھی اس کی انشائی ذات کا جزء لاینفک ہیں، یہی مختلف خیالات و نظریات یا عقائد اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں، کسی دور کا ادب محض ہم عصر فنی محاسن، صنائع و بدائع کی بنا پر مقبول نہیں ہوتا بلکہ اس کی عوامی مقبولیت میں ہم عصر روایات اور عقائد کی آمیزش اور گھلاوٹ اور ملاوٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، خود یورپ کے ادب سے دو تین عالمی فن پاروں کی مثالیں کافی ہیں، آٹھ صدی قبل مسیح کا مقبول فن کار ہومر (جس کی ذات ہنوز محل نزاع ہے) اور اس کی رزمیہ نظمیں الیڈ اور اوڈیسے میں نہ صرف قدیم یونانی وثنی عقائد کی آمیزش ہے بلکہ انسانی معاملات میں اولمپیا کے خداؤں، دیوی دیوتاؤں کا واضح عمل دخل بھی ہے، اسی طرح روما کے معروف وثنی شاعر ورجل کی شہرۂ آفاق رزمیہ نظم ''اینائڈ'' دیو مالائی قصوں اور وثنی عقائد سے مرصع ہے، دو عالمی شہرت کے مسیحی شعرا کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے، ملٹن اور دانتے دونوں عالمی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں، ان کی شاعری محض ان کے عقائد کی ترجمان ہے، اول الذکر نے خالص پیورٹن عقائد کا اظہار کیا اور آخر الذکر نے متقشف کیتھولک عقائد

کا اظہار کیا، ملٹن کی تین مذہبی نظمیں شہرۂ آفاق ہیں، چرچ کی بے جان مذہبی روایات سے عاجز آ کر ملٹن نے تحریک اصلاحات میں شرکت کی اور خالص بائبل کی روشنی میں دین مسیح کا احیا کرنا چاہا، اس کے لیے وہ تاج برطانیہ تک سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھا، برطانیہ میں شہنشاہیت ختم ہوگئی مگر قائدین اصلاحات کی باہمی کشمکش اور افتراق کی وجہ سے عود شاہی کا عمل ۱۶۶۰ء میں پیش آیا، ملٹن کی شاعری پیورٹن تحریک کی کامیابی کا ترانہ تھی اور دین مسیحی کے احیا کا منشور بھی، اس کی فردوس گم گشتہ (۱۶۶۷ء) سقوط آدم کی داستان حزیں کا ایک رزمیہ ہے، خطا کار آدم کو اس کے ازلی گناہ سے ابن اللہ عیسیٰ نے نجات دی اور کفارہ ادا کر کے بنی آدم کو بچالیا، لہٰذا بنی آدم کی نجات اسی میں ہے کہ وہ عیسیٰ کو ابن اللہ تسلیم کر لیں، اس عقیدہ کے منکرین جہنمی ہیں، ان کی نجات ممکن نہیں، ملٹن کی دوسری مذہبی نظم فردوس بازیافتہ ہے جو ۱۶۶۵ء سے ۱۶۶۷ء کے درمیان منظر عام پر آئی، اس میں ملٹن عیسائی عقیدہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، حاصل رزم یہ ہے کہ فردوس جو آدم کے ہاتھوں ضائع ہوئی تھی عیسیٰ ابن اللہ کے ہاتھوں واپس ملی، آدم شیطان کے مطیع ہو گئے لیکن عیسیٰ اپنے باپ کے وفادار ثابت ہوئے اور شیطانی ترغیبات کو ٹھکرا کر باپ کی وفاداری کا ثبوت پیش کیا، ملٹن کی تیسری معروف نظم سیمسن ہے جس کا مرکزی مضمون اولڈ ٹسٹامنٹ سے ماخوذ ہے، بالفاظ دیگر ملٹن کی کہانی سیمسن کی زبانی ہے، کیا ملٹن کی شاعری کے عمودی مضامین مذہبی عقائد کی ترجمانی نہیں کرتے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ملٹن کی شاعری عالمی فن پارے کا عروج قرار پائے اور اقبال کی شاعری محمدؐ کے عصباتی دین کی عکاسی یا مجموعۂ تضاد بن جائے۔

ملٹن سے زیادہ دلچسپ مثال خود دانتے کی ہے، دانتے (۱۲۶۵ء-۱۳۲۱ء) نے من حیث خالص کیتھولک، احیائے دین مسیح کی آرزو میں اپنی ڈوائن کمیڈی لکھ ڈالی، اس نے نہ صرف شعری مواد میں عقائد کی آمیزش کی، بلکہ ہیئت کے سانچہ میں بھی عقیدہ کو گھول کر پلا دیا، نظم کی پوری ترتیب عقیدۂ تثلیث پر قائم ہے، ۳ اور ۹ کا لحاظ ساری نظم میں موجود ہے،

حد تو یہ ہے کہ قوافی میں بھی اس نے عقیدۂ تثلیث کے احیا کے لیے مثلث قوافی کی ایجاد کی، پوری نظم مثلث بند میں لکھی گئی ہے، خلاصۂ نظم یہ ہے کہ انسانیت کی نجات محض کیتھولک عقیدہ کو تسلیم کرنے میں ہے، چرچ کی زبوں حالی اور چرچ اور ریاست کے تصادم پر وہ اشکبار ہے، اس کے خیال میں حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہ لانے والے جہنمی ہیں، کیا کوئی قاری یا ناقدان عالمی شہ پاروں کو مواد و ہیئت میں عقائد کی آمیزش سے مبرا ثابت کر سکتا ہے۔

جو مستشرقین اسلامی شعرا و ادبا کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کو اس مطالعہ کا حق ہے مگر مسلمانوں کو بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس مطالعہ میں اقبال کے فلسفۂ توحید، خودی و بے خودی، مرد مومن، عشق رسول کی نازک آبگینوں پر مستشرقین کے نشتر سے بال تو نہیں پڑے ہیں؟ یا حالؔی کی غزل گوئی کی تعریف کے ساتھ ساتھ مسدس حالی کی تنقیص تو نہیں کی گئی ہے، ملٹن اور دانتے عصباتی و ہیجانی قرار نہیں پائے مگر ہمارے شعرا انفعالی قرار پائے، یہاں پر دو ایک مزید شواہد کی ضرورت ہے، ٹیگور کے مجموعۂ مکاتیب میں راقم کی نظروں سے ایک خط گزرا جو شاعر انقلاب نذر الاسلام کے خط کا جواب تھا، آخر الذکر نے اول الذکر کو نوبل پرائز حاصل کرنے پر مبارک باد کا خط لکھا، اس خط کے جواب میں آخر الذکر یعنی ٹیگور نے لکھا کہ ''تمہاری (نذر الاسلام) شاعری کے مقابلہ میں ہماری شاعری فروتر ہے، نوبل پرائز کے اصل مستحق تم تھے، ہم نہیں'' مگر مستشرقین کی ٹولی نے اپنے خود ساختہ فیصلوں میں مسلم شاعر کو من حیث ہیجانی شاعر مستحق نوبل پرائز نہیں سمجھا، ٹیگور کی دھوم سارے عالم میں مچ گئی مگر نذر الاسلام مجہول الحال رہا، وہ شاعر انقلاب جو حریت و آزادی کے گیت گاتا تھا ظالم برطانیہ نے جب اس جرم میں اس کو گرفتار کر کے رانچی کے جیل میں قید کیا تو قلم، سیاہی اور کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی اس کے کمرہ میں نہ رہنے دیا، اس نے بلیڈ سے رگ جاں کھول کر خون کے فوارے جاری کر دیے، دو انگلیوں سے کمرہ کی پوری دیوار پر حریت و آزادی کے ترانے لکھ ڈالے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　　کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ہمیں ان خطرات سے باخبر رہنا چاہیے اور محض اس لیے کہ مغربی اسکالر ہمارے شعراو ادبا کو مغرب میں متعارف کرا رہے ہیں، ہمیں سرور کے نشہ میں خطرہ کے نشانات سے بے تعلق نہ ہونا چاہیے، مغربی جامعات میں اسلامی تحریکات مثلاً اخوان، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت پر پی، ایچ، ڈی کے مقالات لکھے جا رہے ہیں، ساتھ ہی تحریکی شخصیات مثلاً حسن بنا، مولانا مودودی، مولانا الیاس پر تحقیقات جاری ہیں، ان کے شر و خیر، محاسن و معائب سے بھی باخبر رہنا ضروری ہے، یہ دراسات اس لیے بھی کی جاتی ہیں کہ اسلام کی سربستہ قوت کا راز معلوم کر کے اس کی کاٹ کا سامان پیدا کیا جائے اور اتحاد اسلامی اور وحدت امت کے تمام عوامل، دواعی و محرکات کو کچل کر افتراق و انتشار کی صورت برپا رکھی جائے تاکہ استعماری قوتیں عالم اسلام میں کچھ نہ کچھ شر انگیزی کرتی رہیں اور مشنری مبلغین اپنی پالیسی اسی کے مطابق بناتے رہیں۔

بطور تلخیص یہاں پر عرض کیا جا سکتا ہے کہ اسلام فروغ علم کا داعی ہے اور خذ ما صفا ودع ما کدر کا اعلان آفاقی اعلان ہے، مستشرق ہو یا غیر مستشرق، ہر ایک کی تالیف جو طاہر و مطہر ہوگی، قابل قبول ہوگی اور ہونی چاہیے، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جس طرح کوئی مسلم مؤلف حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ تسلیم کرنے یا آیت لم یلد ولم یولد کے خلاف جانے کے لیے تیار نہ ہوگا، عقیدۂ تثلیث یا حلول کو قبول کرنے سے انکار کرے گا اسی طرح ہر مستشرق قرآن کو کلامِ الٰہی، محمدؐ کو آخر الزماں اور اسلام کو دین الٰہی تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوگا اور یہ تصادم ازلی ہے۔

وہ دن امت مسلمہ کے لیے محرم کی دس تاریخ سے زیادہ تاریک ہوگا اور سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) پر سعدی کے مرثیہ سے زیادہ دل دوز اور دل سوز ہوگا جس دن مسلمان علوم اسلامیہ کی تفسیر و تعبیر کے لیے، قرآن و حدیث کی تدوین و تحلیل کے لیے، تاریخ و فلسفۂ اسلام کی توضیح

کے لیے مستشرقین پر انحصار کریں گے اور مدد کے لیے ان کے دروازہ پر دستک دیں گے۔

شاید ہی کوئی ایسا اسلامی مصدر بچا ہو جو مستشرقین کی تحریف سے ماورا ہو، اور علامہ محمد بن سعد کی الطبقات الکبریٰ کو لیجیے، مستشرقین کی تحقیقات کے ساتھ اس کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس کی غلطیوں کا احاطہ مشکل ہے، جس قدر تصحیف و تحریف ابن سعد کے مطبوعہ نسخوں میں ہوئی ہے، حیرت ناک ہے، ان اغلاط کو دامن عفو میں جگہ دینا، ان کی محنت اور دیدہ ریز و جانکاہ کاوشات کی تحسین نہیں بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر غلاف ڈالنے کے مترادف ہے۔

فان کنت لاتدری فتلک مصیبة وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

ہم مستشرقین کے کارناموں کے منکر نہیں اور نہ ان کے پاکیزہ کارناموں کو منفی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، البتہ ہم تمسیخ کو تجدید نہیں کہہ سکتے، عالم اسلام کی انشائی قوت مفلوج نہیں ہوئی ہے، سقوط بغداد کے بعد بھی انشائی عمل جاری رہا، سترہویں صدی سے استعمار نے عالم اسلام پر تسلط قائم کیا جو دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا، اس عرصہ میں تمام اسلامی نوادرات کی لوٹ جاری رہی، مسلمان سائنس دانوں کی کتابوں کا مطالعہ ہوا، ان کے اڈیشن طبع ہوئے، اس لیے نہیں کہ انہیں اسلام سے محبت تھی یا ان کے اندر اسلامی کلچر کے فروغ کا جذبہ تھا، بلکہ محض ان اسلامی علوم سے استفادہ مقصود تھا اور یہ بات عام ہو چکی ہے کہ زوال عالم اسلام کے بعد ہی یورپ کا عروج وارتقا ہوا، علمی ذخائر پر تسلط کے بعد اور ان کے مطالعۂ تدریس واشاعت کے بعد اچانک یورپ میں بہار آئی۔

استعماری نظام تعلیم میں ریسرچ اور تحقیق کا حق صرف سفید فام اہل یورپ کو تھا، مقامی آبادی کو خواہ وہ برصغیر ہندو پاک میں ہو یا شرق اوسط میں، وسط ایشیا میں ہو یا ایشیائے بعید میں، صرف اتنا حق تھا کہ وہ بی۔اے کی ڈگری حاصل کر کے انگریزی، فرانسیسی اور ڈچ دفاتر میں کلرک کی حیثیت سے زندگی گزارے، تفکر و تدبر کا اس کو حق نہ تھا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک طرف استعمار کی کمر ٹوٹی، دوسری طرف عالم

اسلام باوجود باہمی اختلافات، کشمکش اور تصادم کے مستحکم ہونے لگا اور ربع صدی کے اندر اسلام دنیا کی تیسری قوت کی حیثیت سے ابھر کر نمودار ہو گیا، وہی اسلام جس کی تجہیز و تکفین کا سامان استعماری قوتیں اور ان کے اعوان و انصار مستشرقین کر چکے تھے، یہ محض خیال نہیں، اس کے لیے تحریری شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں، مستشرقین کی تحریروں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کی جانکنی کے منتظر تھے، مگر اچانک اس کی روح، قوت و اثر پذیری، حوصلہ اور امنگ کو دیکھ کر وہ ششدر اور حیران رہ گئے، بلکہ علوم اسلامیہ کے میدان سے ہارے ہوئے سپاہی کی طرح اب بھاگ رہے ہیں، یا چولے بدل رہے ہیں، دوسری طرف عالم اسلام کے حساس مفکرین نیا اسلامی ادب تیار کر رہے ہیں اور مغرب پرست مسلم حکمرانوں کی پیہم سازشوں اور جوڑ توڑ کے باوجود ان کی مرضی کے خلاف عالم اسلام میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں کروٹ بدل رہی ہیں، نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا ہو رہی ہے، خالص اسلامی ادب استشراق کا پردہ چاک کر دے گا، دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا یہ بین الاقوامی سیمنار جو اسلام اور مستشرقین کے زیر عنوان منعقد کیا گیا ہے اس نئی شاہراہ کی سمت ایک برق رفتار سفر ہے اور آیت "لن ترضی" کی عملی تفسیر بھی ہے۔

(معارف جولائی ۱۹۸۳ء)

☆☆☆

مطالعۂ سیرت اور مستشرقین

از

(جناب ڈاکٹر نثار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی)

تمہید: ہمارے یہاں کے علمی اور دینی حلقوں میں مستشرقین کا نام اور ان کا کام اب خاصا مشہور و متعارف ہو چکا ہے اور فی زمانہ ایسے بالغ نظر علما کی کمی نہیں ہے جو مستشرقین کی علمی مساعی، ان کے تحقیقی کارناموں، ان کے مالہٗ و ماعلیہ سے واقف نہ ہوں، تاہم اسلامی علوم کے حوالہ سے بالعموم اور مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے بالخصوص مستشرقین کے کام کی نوعیت، ان کے رویہ اور سلوک اور ان کی کیفیت و کمیت سے عام طور پر بے خبری پائی جاتی ہے اور وقت کی ضرورت ہے کہ اردو داں طبقہ کے سامنے خاص طور پر پورے مسئلہ کا ایک مفصل علمی جائزہ پیش کر دیا جائے۔

تعارف: واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کے بارہ میں صورت حال اب پہلے سے بہت مختلف ہو چکی ہے، ایک زمانہ تھا کہ اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور اہل اسلام کے لیے مستشرقین کا تعصب و تظلم اپنی انتہا پر تھا اور ان کی تحریروں میں بے باکی و گستاخی فحاشی کی حد تک پائی جاتی تھی جس سے بعضوں کو خود شرم آئی لیکن پھر رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی مختلف عوامل کے نتیجہ میں شدت کم ہوتی چلی گئی، مختلف مکاتب فکر وجود میں آئے اور انکشاف حقیقت کے ساتھ ساتھ خود مستشرقین کے گروہ میں کچھ معتدل قسم کے مصنفین بھی شامل ہو گئے، یہاں تک کہ عہد جدید میں استشراق اور مستشرقین مسلم اور غیر مسلم دونوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں کہ

انہوں نے اسلام اور دنیائے اسلام کو بہت غلط طور پر پیش کیا ہے، نتیجۃً یہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ جو کچھ نظریات پہلے قائم کیے گئے تھے ان کو بالکل بدلنا ممکن نہ ہو تو ان پر نظر ثانی بہرحال کی جانی چاہیے، شاید یہی وجہ ہے کہ اب بعض مستشرقین نے اپنے نظریات واقعۃً تبدیل کر لیے ہیں اور بعض حلقہ بگوش اسلام بھی ہو گئے ہیں۔

آغاز کار: دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی و عربی میں بالخصوص مستشرقین کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت و حقیقت اپنے اور پرائے سب پر کھلتی جارہی ہے، بلکہ پچھلے دو ایک عشروں میں تو انگریزی زبان میں بعض کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات، دنیا کے ہر حصہ میں بہت کچھ بدل رہے ہیں، علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں اور بوڑھوں کے مقابلہ میں نوجوان نسل فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جارہی ہے، انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالہ سے بعض اہم کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں، مثلاً (۱) العقیقی، نجیب، المستشرقون، دارالمعارف مصر ۱۹۵۶ء-۱۹۶۴ء (ج ۱ تا ۳)، (۲) احمد، ابراہیم خلیل، المستشرقون والمبشرون فی العالم الاسلامی، قاہرہ ۱۹۶۴ء (۳) زکریا، ہاشم زکریا، المستشرقون والاسلام، لجنۃ التعریف بالاسلام، مصر ۱۹۶۵ء (۴) الھراوی، حسین، المستشرقون والاسلام، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ ۱۹۶۵ء (۵) البہی، محمد والمستشرقون فی موقفھم عن الاسلام، الازہر، طبع جدید (۶) الدسوقی، محمد، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ۱۹۷۲ء (۷) شبلی، عبدالجلیل، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ۱۹۷۷ء (۸) صبرہ، دکتورہ، عفاف، المستشرقون ومشکلات الحضارہ، دارالنہضۃ العربیہ قاہرہ ۱۹۸۰ء، ان میں سے اول الذکر کتاب اہم ترین اور مفصل ترین ہے جو سرنامہ کے عین مطابق اس موضوع پر واقعی ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے (تقریباً ۱۲۰۰ صفحات) العقیقی نے بڑی جامعیت کے

ساتھ دنیائے مغرب کے تمام اہم علاقوں (فرانس، اٹلی، برطانیہ، اندلس، پرتگال، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سوئزرلینڈ، سویڈن، روس، امریکہ وغیرہ) کے تمام قابل ذکر مستشرقین (اگرچہ بعض کا ذکر چھوٹ گیا ہے، مثلاً فان کریمر وغیرہ) کے احوال و آثار کو جمع کر دیا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا آغاز سر سید احمد خان م ۱۸۹۸ء اور ان کے رفقا سے ہوا، اسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعۂ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سر سید احمد خان نے ہی کھولا اور اس حقیقت کے باوجود کہ سر سید کے دینی افکار میں تجدد کا رنگ غالب تھا اور راسخ العقیدہ علما کو ان سے حد درجہ اختلاف تھا اور ہے، سر سید نے جذبۂ ایمانی اور خالص جرأت رندانہ سے کام لے کر اپنے ہم عصر مستشرق سر ولیم میور کی دل آزار تصنیف دی لائف آف محمدؐ (حیات محمدؐ) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا اور ذرائع کی کمی کے باوجود اہانتِ رسول کا خاموش بدلہ لینے کے لیے اپنا تن من دھن سب لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے، مناظرانہ رنگ سے پاک، تاریخی حقائق و اسناد پر مبنی ایک جوابی کتاب "الخطبات الاحمدیه فی العرب والسیرة المحمدیة" لکھی اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہو گیا، یہ بڑا اہم دور تھا، یہی وہ زمانہ تھا جب مستشرقین یورپ فی الواقع سیرتِ رسولؐ کے اصل عربی ماخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے اور پھر ان ہی کی منظم کوششوں سے بہت سے ماخذ زیور طبع سے آراستہ ہو کر مسلمانوں تک پہنچے، اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور نا قابل اعتماد روایتوں کو بطور سلاح استعمال کیا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے سیرتِ رسولؐ کا اعتبار اٹھ جائے اور پھر اس کے نتیجہ میں آپ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے۔

ابتدائی جائزہ: سر سید کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی

تحریک کا آغاز ہوا تھا، اسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی، اس سلسلہ میں اگر چہ مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا اور سیرت پر متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن جو شہرت اور بقائے دوام علامہ شبلیؒ (م ۱۹۱۴ء) کو حاصل ہوئی، وہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی، علامہ شبلیؒ کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انہوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی کوششوں کو ہی نشانۂ تنقید نہیں بنایا بلکہ انہوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا، جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرتِ رسولؐ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ تحریک استشراق کے جواب میں علمی و تحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکتے تو سیرۃ النبیؐ مستشرقین کے اعتراضات و مطاعن کا بھی یادگار جواب بن جاتی، بہر حال مطبوعہ سیرۃ النبیؐ کے آغاز میں ہی اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلیؒ نے ''یورپین تصنیفات'' کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات، ان کے اسباب و محرکات، ان کے اصول مشترکہ اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا اور پھر مشہور مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شامل کتاب کر دی، یہ تمام کام اپنے ابتدائی درجہ میں تنقیح طلب ہونے کے باوجود نہایت دقیع ہیں۔

علاوہ ازیں علامہ شبلیؒ چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبیؐ کو دراصل ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعۂ سیرت کو معیارِ تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیر بحث لاتے، بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالہ سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقب تو گویا انتہائے مقصود تھا اور ان کی زندگی کی آخری خواہش تھی، غالباً اسی لیے انہوں نے سیرۃ النبیؐ کے مجوزہ خاکہ میں ''پانچواں حصہ'' خاص یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا جو اگر چہ پورا نہ ہو سکا، تاہم آنے والوں کے لیے روشنی چھوڑ گیا اور یہ ثابت کر گیا کہ خود مولانا شبلیؒ مسئلہ مستشرقین کی گہرائی اور گیرائی کا بہ حد غایت ادراک رکھتے تھے۔

افسوس کہ علامہ شبلیؒ کے بعد مستشرقین کے حوالہ سے سیرتِ رسولؐ کے مطالعہ و

تحقیق کا کوئی بڑا اور منظّم کام سامنے نہیں آیا اور نہ ہمارے یہاں کے سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی اہمیت دی، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکا دکا، انفرادی و اجتماعی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی مقالات و مضامین اور کتابچوں میں اس جانب کچھ نہ کچھ پیش رفت بہر حال ہو رہی ہے، مثلاً ایک مسلمان مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب ''حیات محمد'' کا تذکرہ بے محل نہیں معلوم ہوتا جو اگرچہ عربی زبان میں ہے لیکن اردو ترجمہ کے بعد گویا وہ اردو ادب کا ہی سرمایہ بن گئی ہے، ہیکل نے اپنے بیان کے مطابق نہ صرف یہ کہ ''جامدین عن المسلمین'' کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا، بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت انداز سے جواب دینے کے لیے بھی کتاب لکھی، ہیکل نے متن کتاب کے علاوہ اپنے طویل مقدمہ میں اور پھر بعد میں ''المستشرقون والحضارة الاسلامية'' کے تحت مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور ان کے علم و تحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے اور مختلف عنوانات (مثلاً اسلام اور مسیحیت کی کشمکش، مسیحی مصنّفین کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام، مسلمان مصنّفین اور مغربی افترا پرداز مستشرقین وغیرہ) کے تحت اصل حقائق کو نمایاں کیا ہے اور جرأت و قوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔

نوعیت مسئلہ: یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی تحریکِ استشراق کا قرار واقعی جواب، اردو زبان و ادب میں اب تک نہیں دیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا اور جسے مولانا شبلیؒ نے منظّم و مؤثر بنانے کی کوشش کی تھی، اس کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور اس کا آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب سرگرمی نہ ہونے کے برابر ہے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر مغربی اور یورپی مستشرقین کی سرگرمیاں تو لب و لہجہ کے فرق کے ساتھ تا حال جاری و ساری ہیں اور ان کے عزائم و مقاصد میں بھی سر مو فرق نہیں آیا ہے لیکن ادھر ہماری طرف سے انتظام و اہتمام صفر ہے، مولانا شبلیؒ وغیرہ نے مستشرقین کی

علمی تحقیقات اوران کے معیار کی جونشاندہی کی تھی اوران کی تصانیف کو جس طرح کذب و افترا کا دفتر قرار دیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا اور تمام علوم اسلامیہ میں بالعموم اور سیرت رسولؐ کے باب میں بالخصوص واقفیت تامہ حاصل کر کے ان کی غلطیوں، بددیانتی اور تلبیس وتحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا اور اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظم کام کا نقشہ بنایا جاتا مگر ایسا نہیں ہو سکا بلکہ المیہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت وشدت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا، نہ ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلیٰ سطح پر علم وتحقیق کی سرپرستی کرسکیں اور ان کوششوں کو متحد ومنظّم کرسکیں جو انفرادی واجتماعی اور نجی وسرکاری مختلف پیانوں پر کی جاتی ہیں، ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں اس معیار کی علمی وفنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کا طرۂ امتیاز ہے، مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لیے اسی تیاری کی ضرورت ہے جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی (مثلاً علم وتحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، تجسس وتفحص کے آداب، فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب و ثقافت کا گہرا مطالعہ، ضروری علوم وفنون سے دلچسپی، مشنری جذبہ، متعین مقاصد اور انتھک محنت وریاضت وغیرہ۔)

مستزاد یہ کہ مستشرقین کی تحریک کو ایک گونہ تقویت خود ان مسلمان محققین وعلما کے رویہ سے مل رہی ہے جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصول تعلیم وتحقیق کے لیے جاتے ہیں تو وہاں کے احوال ومناظر سے اس درجہ متاثر ومرعوب ہو جاتے ہیں کہ انہی کے ہم آواز ہوجاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظّم کیا جائے اور مرحلۂ اول میں مسئلہ مستشرقین کی نوعیت وحقیقت کو سمجھ لیا جائے اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق ومستشرقین کی تحریک، اس کے مقاصد، اسباب ومحرکات، عہد بہ عہد ارتقا اور اعلام ومشاہیر کی عام صورت کیا ہے، زیر نظر مقالہ کا مدعا یہی ہے۔

استشراق، مستشرق: استشراق اور صاحبان استشراق (مستشرقین) کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ استشراق اپنی حقیقت و ماہیت میں چونکہ اسلام کے خلاف ہے اور ہر دور کے (غیر مسلم) مستشرقین کی تمام سرگرمیاں اپنے علمی تنوع کے باوجود چونکہ اسلام، پیغمبر اسلامؐ، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون کے حوالہ سے بہر حال معاندانہ رہی ہیں اور چونکہ مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد اپنی اصل و نسل میں یہودی ہیں یا عیسائی، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسلام اور یہودیت وعیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ وفکر کی نمو ہو گئی تھی، تاہم اپنے مخصوص فنی واصطلاحی معنوں میں اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریکِ استشراق کا باقاعدہ آغاز اور مستشرقین کی علمی وتحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئیں، شاید یہی وجہ ہے کہ:

۱۔ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں بلکہ انگریزی زبان وادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا، چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورۂ بالا دونوں الفاظ اورینٹ سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں شرق یا مشرقی سمت جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، پھر اسی سے اورینٹل، یعنی مشرقی، جو تمام معنوں میں مغربی (Occidental) کا ضد ہے، مشرقی کے مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو مشرق یعنی ایشیا یا ان ممالک کا باشندہ ہو جو بحر روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں جب کہ اورینٹلزم یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات مشرقی طرز و ادا، اقدار، علوم و آداب اور فنون وثقافت وغیرہ سے واقفیت اور مہارت وغیرہ، نیز اس کے تحت اورینٹل اسکالرشپ کا مطلب ہوگا مشرقی زبانوں سے واقفیت اور پھر اس سے بنا ہے اورینٹلسٹ (مستشرق) اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں، علوم، فنون اور تہذیب وتمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو یا بقول مولوی عبدالحق ماہر مشرقیات ہو۔

ب۔ عربی، فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش، ر، ق تو موجود ہے لیکن زیر بحث الفاظ یعنی باب استفعال میں اس کے معنی ومفہوم یا بطور فعل ان لغات میں بحث نہیں پائی جاتی، (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے) عربی قواعد کی رو سے استشراق ثلاثی مزید کا باب استفعال ہے جس کا مادہ ش، ر، ق (شرق) ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کے جملہ خصائص ولوازم یعنی اتخاذ وطلب، وجدان وحسبان اور تمول وتکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی، صاحبانِ استشراق کے احوال وشخصیات سے اور ان کی تحقیقات وتخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے، گویا الفاظ کا پیکر بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا تمام تر علم اکتسابی ہے، جسے انہوں نے بڑی محنت وریاضت سے طلب وجستجو کر کے حاصل کیا، اس کی خاطر سفر وحضر، تمکن وتوطن اختیار کیا اور پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان میں تخمین وظن اور تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے، مختصر یہ کہ عربی میں استشراق کے لغوی معنی ہوں گے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کا مطلب ہوگا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی، یا مشرقی بنا ہو، اردو لغت وادب میں بھی کم وبیش یہی مفہوم ہے، یعنی مستشرق کا مطلب ہوگا "وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو، یا وہ فرنگی یا امریکی جو مشرقی زبان یا علوم کا ماہر ہو۔"

زبان ولغت کی مندرجۂ بالا بحث سے استشراق اور مستشرق کا مفہوم اگرچہ کسی قدر واضح ہو جاتا ہے اور مستشرق کی نوعیت وماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جا سکتی ہے، تاہم استشراق کی اصل حقیقت اس وقت سامنے آئی جب کہ استشراق، السنۂ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم وآداب کے یک رخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے بغض وعناد اس کا جزو لازم ٹھہرا، پھر یہی بغض وعناد پہلے پہل تو مشنری جذباتیت کا آئینہ دار رہا لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے متعین مقاصد کے تحت علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا، گویا اس دوسرے مرحلہ میں استشراق نے ایک تحریک، ایک مستقل رویہ اور سلوک کی شکل اختیار کر لی اور

اسی رویہ وسلوک کے احاطہ میں رہتے ہوئے تمام ضروری مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا، مثلاً اسلام اور اس کی تعلیمات کو مجبوراً یا تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ کے عہد بہ عہد ارتقا کے ساتھ وہ تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں، قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تاکہ یہ تہذیبیں اسلامی تہذیب وتمدن کے لیے چیلنج بن سکیں، عربی زبان کے لیے کہا گیا کہ قرآنی عربی، عہد جدید کی ضروریات وحالات سے مطابقت پیدا نہیں کرسکتی، اس لیے مقامی زبانیں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہیے بلکہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط سے تبدیل کردینا چاہیے، پیغمبر اسلامؐ کی سیرت وکردار کے بارہ میں ان نکات کو اچھالا گیا جن سے عام ذہن کے لوگ بھی اچھا تاثر نہ لے سکیں اور ان کے لائے ہوئے مشن کو ناقابل التفات گردانا جائے، اسلامی تہذیب وثقافت کی تعمیر وترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی ثابت کی جائے، تاکہ اسلامی ثقافت مجموعۂ خرافات ٹھہرے، وغیرہ وغیرہ، ان تمام معاملات کا ہدف بہرحال مستشرقین کے نزدیک اپنے عزائم کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمت عملی تبدیل ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت، علمیت اور استدلال کے اوزان و پیمانے استعمال کرنے لگے، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق اپنے رویہ پر خود انہوں نے نظر ثانی کی اور بدنیتی کے باوجود مخالفت ومخاصمت کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقہ سے کیا جانے لگا اور اسلام کے مقابلہ میں تعصب وتظلم کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا۔

مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہا، اسی لیے ان کے ہاں علم، تجربہ، انداز استدلال، مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے فکر وفن اور تحقیق وتالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔

لیکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو، اس لیے اس اجمال کی کچھ تفصیل

آئندہ صفحات میں عرض کی جائے گی تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق جذبۂ فکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا اور مطالعہ و تحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ و سلوک کیا رہا۔

تحریک استشراق کا آغاز: تحریک استشراق کو اگر خلاف اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز دراصل ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف بالخصوص بغض و عداوت کا اظہار موقع بہ موقع تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا اور وفور جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر و تصنیف اور وقائع و اشعار کے قالب میں ڈھلتی رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایۂ افتخار قرار پائیں، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد سے کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانی اسلام کے حوالہ سے ان کی مخالفت و مخاصمت کا عام انداز یہی رہا اور اس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق و واقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے، اس صورت حال کا ایک بظاہر سبب ان کے دلی جذبات کے علاوہ یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لیے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انہیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں، اس پر مستزاد تصادم و کشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دہرائے گئے، خاص طور پر آنے والے زمانہ میں صلیبی محاربات کا سلسلہ جس سے دشمنی و عداوت کا نشہ ان پر طاری ہوا جو آج تک نہیں اترا، صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہو گئی، بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی و فکری محاذ پر اسلام اور دنیائے

اسلام کو زک پہنچائی جائے، اس کی تدبیر اس سے بہتر کوئی اور نہ تھی کہ اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے، چنانچہ اس کام کے لیے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آباد کار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم و معلومات رکھتے تھے، وہ کتنی ہی ناکارہ و خام سہی، ان کے لیے بہر حال مفید مطلب تھیں جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جا سکتی تھی اور سیرت ختم الرسلؐ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جا سکتا تھا، مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی پیغمبر اسلامؐ کے بارہ میں مغرب کے پاس معلومات انتہائی مبہم اور ناقص تھیں اور اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیو مالائی کہانیوں سے پر کیا گیا، اس افسانوی مواد کے بھی دو حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سیرت کو پیکر خیال میں پیش کیا گیا اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی اصل اور حقیقت نہ تھی بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد و اختراع اور کذب و افترا سے عبارت تھا، اس عہد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کیے گئے، مثلاً (نقل کفر کفر نہ باشد) آپ کو نبی کاذب، مخالف مسیح، موجد مذہب نو اور بہروپیا کہا گیا اور بہر عداوت اس حد تک گر گئے کہ آپ کے لیے لفظ محمد استعمال کرنے کے بجائے (Mahomd) سے تعبیر کیا گیا، جس کے معنی ہیں ''شہزادۂ ظلمات'' پھر جب صلیبی جنگوں کی ناکامی سے ان کی آتشِ عداوت اور بھڑکا دی تو وہ حضورؐ کے لیے (Maphomet, Baphomet) اور (Bapum) کے الفاظ استعمال کرنے لگے اور آپ کی سیرت و سوانح کے بارہ میں مہمل کہانیاں دیو مالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں، ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بت پرست تھے اور ان کا مرکز پرستش محمدؐ کا بت تھا، پھر ایک سے زیادہ تین بتوں کی پرستش کا فسانہ تراشا گیا اور یہ انکشاف کیا گیا کہ ''آنحضرتؐ تو دراصل خود پیر و دیو

عیسوی تھے لیکن پوپ منتخب نہ ہو سکے تو انتقاماً رومی چرچ سے بغاوت کر کے اسلام ایجاد کیا" وحی و تنزیل کے حوالہ سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمدؐ نے ایک سفید کبوتر، فاختہ یا قمری کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ مغربی علما و مستشرقین صدیوں کیسی شدید ناواقفیت کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علما سیرت وسوانح کے نام سے پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں، البتہ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیرووں نے (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا جس نے حضورؐ کی ذات اقدس پر جنسی وشہوانی الزامات کی بھرمار کر دی، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویر رسولؐ کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات واتہامات عائد کیے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم وبیش یکساں تھے، اسی لیے جب کسی انھوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسلؐ افراط وتفریط کے

سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہل مغرب آنحضرتؐ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار اور شیطان کا چیلا قرار دیتے رہے کہ اتنے میں صلیبی جنگوں کے طویل سلسلہ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہوگئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انہوں نے کمال عیاری سے اسباب و وسائل اور تدبیر و حکمتِ عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لیے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کیے جائیں اور ''گرم جنگ'' نہ سہی ''سرد جنگ'' میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں، علم و تحقیق کے معنوی اسلحہ سے لڑی جائے، شاید اسی لیے رائمنڈلل (Raymondlull) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ایک پر امن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں۔''

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق و مغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گزشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزامات و اتہامات اور تشکیک و تذبذب کے بیج بو کر خرافات کا ایسا جنگل اگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے مقابلہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا، دوسری طرف انہیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم و فن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے اس کے سبب یونانی علوم و فنون کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں اور یوں ان کے آباواجداد

کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا، علاوہ ازیں علوم و فنون اور آداب و معارف کے اسلامی مراکز سے اخذ و استفادہ کے لیے اور اندلس و صقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمعِ عرفان و حقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لیے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم و فنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی، چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں بالآخر وہ مرحلہ آ گیا، جب کہ ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا، سب نے مل کر اسلام کو اپنا واحد مشترکہ دشمن قرار دیا اور ایک متحدہ رومی کیتھولک چرچ کی بنیاد رکھی گئی اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی، یہودی، راہب، پادری، قصہ گو، مناظر، شاعر وغیرہ ڈٹے ہوئے تھے، اب ان کی جگہ مغربی دنیا کے وہ عقلا اور فضلا لیں گے جو کلاہ علم سے آراستہ ہوں گے اور درس و تدریس کی مسندوں پر فائز ہو کر دادِ تحقیق دیں گے تاکہ ادھر ان کے ان دیکھے جذبات نفرت و عداوت بھی تسکین پائیں اور ادھر علم و تحقیق کے حوالہ سے ان کا رعب و دبدبہ بھی قائم ہو جائے، چنانچہ یہی ضرورتیں گیام پوسٹل (G.Postel) کو سامنے لائیں جو عام طور پر مستشرقین یورپ کا باوا آدم شمار ہوتا ہے، وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور بطور خاص لغت و لسانیات کے حوالہ سے اہم خدمات انجام دیں، پوسٹل ہی کے لیے ۱۵۳۹ء میں کلیۂ فرانس قائم کیا گیا اور وہ عربی کی پہلی کرسی صدارت پر فائز ہوا، گیام پوسٹل کے کام کو لغت و لسانیات کے ہی مکرر حوالہ سے اس کے لائق و فائق شاگرد جوزف اسکالیجر نے آگے بڑھایا، بہرحال کم و بیش پینتالیس سال کی تیاری کے بعد ۱۵۸۶ء میں عربی مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا جس کا سہرا بڑی حد تک ڈیوک آف تسکانی (Tuscany) کے سر ہے۔

اوپر کی تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں، یعنی:

۱۔ یہ کہ سولھویں صدی عیسوی کو ہم باقاعدہ طور پر تحریک استشراق کا سر آغاز

قرار دے سکتے ہیں، یہی وہ دور ہے جب کہ مستشرقین یورپ نے کام کا مربوط و منظم نقشہ مرتب کیا۔

۲۔ اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور عیسائی پس منظر میں ہوئی جس کا اثر تاریخ مابعد پر جاری و ساری رہا، کیونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ (کلیسا) کا پروردہ تھا۔

تحریک کا ارتقا: تحریک استشراق کے حوالہ سے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ زمانہ تحریک کے ارتقا، اس کے پھلنے پھولنے کا عہد ثابت ہوا، جہاں تک سترہویں صدی عیسوی کا تعلق ہے بقول مولانا شبلیؒ یہ صدی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے اور یورپ کی جدو جہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، پھر یہ عروج استعمار کی صدی ہے جس کے پنجۂ استبداد میں رفتہ رفتہ عالم اسلام آتا چلا گیا، یورپی شہزادوں کی سرپرستی میں اسلامی مطبوعات کے بارہ میں معلومات جمع کی جانے لگیں، عربی زبان کی ماہیت و خصوصیت کو سمجھنے کی کوششیں ہونے لگیں، یہاں تک کہ ارپی نیس (Erpenius,1584-1626) نے پہلی عربی کی قواعد شائع کی جو لغوی اصولوں پر مرتب کی گئی تھیں، پھر اس کے اتباع میں اس کے شاگرد جیکب جولیس (Jacob Golius, 1595-1667) نے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں اور پھر ۱۶۳۸ء میں ایڈورڈ پوکاک (E.Pococke,1604-1691) پہلا انگریز مستشرق تھا جسے آکسفورڈ میں شعبۂ عربی کا صدر نشین بنایا گیا، مزید برآں عربی زبان کی قواعد اور لغت کی ترتیب کا کام آسٹریا کے میرنسکی (L.E.Maur-nski) نے بھی ۱۶۸۰ء میں انجام دیا، اس کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب و تمدن کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ادارہ ڈی ہربیلوٹ (D.Herbelot) کی سرکردگی میں قائم کیا گیا، اس ادارہ نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس وقت تک جس قدر بھی مشرقی علوم پر کتابیں شائع ہوئی تھیں، ان کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے شائع کر دی جو پر از معلومات تھی، اسی ادارہ کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا۔

سترہویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخِ اسلام وسیرتِ پیغمبرؐ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بہ موقع معلوماتِ سابقہ کے مسالے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، اس صدی میں مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا ان کے ماخذ کے بدل جانے میں مضمر تھی، ازمنۂ وسطیٰ کے روایتی لاطینی اور بازنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی اور انہوں نے اس تضاد کو بھی سمجھ لیا جو سیاحوں کے سفرناموں کے اندراجات، ان کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا تھا، اس عہد میں بھی حسبِ سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں، البتہ جو مستشرقین مطالعۂ سیرتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے سے سامنے آئے ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں:

(۱) ولیم بیڈول (W.Bedwell) انگریز مستشرق تھا، جس کا زمانہ ۱۵۶۱ء تا ۱۶۳۲ء ہے، اس کے آثار و باقیات میں دو کتابیں قابل ذکر ہیں، ایک عربی لغت جو سات جلدوں میں ہے اور ۱۶۱۰ء سے پہلے شائع ہوئی اور دوسرے سیرتِ رسولؐ پر کتاب جو لندن سے ۱۶۱۵ء میں شائع ہوئی، سیرت کی کتاب نہایت گستاخانہ ہے اور نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے اس کا نام ہی ''محمد کاذب'' رکھا گیا ہے، (نعوذ باللہ)، (۲) والٹیر (Valtier.P) فرانسیسی مستشرق تھا، اس کا زمانہ ۱۶۱۳ تا ۱۶۶۷ء ہے، اس نے عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بڑی کثرت سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا، (۳) ہانجر (Hottinger.J.H) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق، (۱۶۲۰ء تا ۱۶۶۷ء) اس کے باقیات میں مشرقی تصانیف کی ایک فہرست (مطبوعہ ہائیڈلبرگ ۱۶۵۸ء) قابل ذکر ہے، (۴) ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr.Henry stubbe) سترہویں صدی کا مشہور مستشرق بہ زمانہ (۱۶۳۱ء تا ۱۶۷۶ء) اس کی مشہور کتاب (جو پہلے پہل لندن سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی) کا نام ہے "An Account of the Rist and progress of Mohametanism" کہا جاتا ہے کہ اگر اس کتاب میں کچھ تاریخی

غلطیاں نظر انداز کر دی جائیں تو اسے سیرتِ رسولؐ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرتِ رسولؐ کے بارہ میں اولین اعتذار ہے، اس کتاب میں اسٹب نے نہ صرف یہ کہ اس رویہ کا جائزہ لیا ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مسیحی مصنفین نے پہلے سے اختیار کر رکھا تھا، جب کہ ان مصنفین کی تصویر کو اس نے مکروہ قرار دیا ہے جو انہوں نے اخلاق و کردار نبویؐ کی کھینچی تھی اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ "اس آسمان کے نیچے سوائے محمدؐ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکز توجہ بنی ہو کہ اپنے تو اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اسے نگاہِ آتشیں سے دیکھیں، مشرق میں اسے سراہا گیا لیکن مغرب نے التفات نہ کیا۔" (ص ۲۱۱)

دوسرے مستشرقین میں سے جین بررڈ (Gene Brard) کا زمانہ گرچہ ۱۵۳۵ء تا ۱۵۹۷ء تھا لیکن اس کا موقف تقریباً سترہویں صدی میں عام ہوا، وہ ایک مشہور کیتھولک مناظرہ باز تھا، جین بررڈ کو سب سے بڑا اعتراض اس پر تھا کہ حضورؐ نے قرآن کو عربی زبان میں کیوں لکھا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خالص مہذب زبانوں میں کیوں نہیں لکھا گیا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس لیے کہ محمدؐ (خاکم بدہن) خود ایک حیوان (جانور، چوپایہ) تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ) زبان (عربی) جانتے تھے جو ان کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس لیے اس کے نقطۂ نظر کے مطابق قرآن عربی جیسی وحشی زبان میں لکھا گیا۔ (حمادے ص ۴۷، ۴۶)

۱۶۵۳ء میں الیکزنڈر روس (Alexander Ross) نے اپنی کتاب (Pondebli) شائع کی، وہ اگرچہ تقابل ادیان کے حوالہ سے سامنے آئی لیکن اس کے ایک حصہ میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے بارہ میں کچھ بہتر مواد پایا جاتا ہے، حالانکہ اس کی پہلی کتاب "حیات محمدؐ کا مختصر جائزہ" قرون وسطیٰ کے روایتی خرافاتی مواد، قصے، کہانیوں اور زہریلے معاندانہ مواد

پر مشتمل تھی، لینلوٹ ایڈیسن (Lanelot Addison) نے ۱۶۷۸ء میں سیرت پر ایک کتاب شائع کی، اگلے سال یہی کتاب نئے عنوان (حیات و مماتِ محمدؐ) کے نام سے سامنے آئی، مگر اس کے مصادر حسبِ معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اپنی کتاب ''قرآن'' کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کیا تھا، ایک اور مستشرق ہمفرے پرائی ڈیکس (Humphrey prideaux) نے حضورؐ کی سوانح لکھی لیکن اپنے دامن کو وہ بھی خرافات سے بچا نہ سکا اور دوسروں کی طرح آپ کو خدانخواستہ مدعیِ کاذب، مکار، فریبی قرار دیا، اس پر تماشا یہ ہے کہ اس کی کتاب ایک صدی تک دوسروں کے لیے ''معیاری کتب حوالہ'' بنی رہی، ایک ہی سال (۱۶۹۷ء) میں دو اشاعتیں عمل میں آئیں اور فرانسیسی ترجمہ بھی ۱۶۹۸ء میں ہو گیا، اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کے حلقوں میں عام مذاق کیا تھا اور کس قسم کے مواد کو ان کے بڑے علما استعمال کرتے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران بھی تحریک استشراق، منازلِ ارتقا طے کرتی رہی، البتہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، رختِ سفر کم و بیش ہوتا رہا اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کے علی الرغم مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی بھی پیدا ہو گئی، اس نرمی اور لچک کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے چند کا رویہ، رنگ و آہنگ اور آواز و انداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا، بلکہ دل و نگاہ میں گنجائش پیدا کر کے اثبات و معروضیت سے آگے بڑھ کر توصیف و مدحِ اسلام و پیغمبر اسلامؐ میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، ورنہ پرانے خیالات اور ان کے متقدمین کے قائم کیے ہوئے نظریات بہر حال سرگرم سفر رہے اور مقبولیت بھی انہی کو حاصل رہی، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ متشددانہ و متعصّبانہ رویہ کے شانہ بشانہ معقولیت و انصاف پسندی کا رجحان بھی جاری و ساری ہو گیا اور اس رجحانِ نو کا ساز غالباً اس صدی میں سب سے پہلے ولندیزی مستشرق ریلان (H.Relant) نے ۱۷۰۴ء میں (De Religione Mohamdion) لکھ کر چھیڑا اور اپنے ہم مشربوں سے مطالبہ کیا کہ

''ہم مشرق کو اس کے اپنے اصل ماخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں'' اور برملا کہا کہ ''تاریخی انصاف'' کے ترازو میں تو ہمیں اسلام کو بھی تولنا چاہیے، پھر اس ''نے نوازی'' میں پیری بائل اور بولین ولیرز وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مغرب نے اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کی طرف بنظر شفقت دیکھا اور افہام وتفہیم کی جانب پیش قدمی کی۔

اس صدی میں مستشرقین کی ذاتی وانفرادی کوششوں کے علاوہ سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی سرگرمیاں منظم کی گئیں، خصوصاً اس صدی کے اواخر میں ان رجحانات نے زیادہ زور پکڑا، بقول مولانا شبلیؒ ''یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوتِ سیاسی اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی جس نے اورینٹلیسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کیے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا اور آخر کار'' ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درس گاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا'' السنۂ مشرقیہ کے علاوہ مسلمانوں کے سائنسی علوم پر علمی وتحقیقی کام کی غرض سے پیرس میں ۱۷۹۵ء میں ایک اور ادارہ قائم کیا گیا، اس کے تحت اضافی طور پر مشرقی زبانوں کے بارہ میں بھی معلومات اکٹھا کی گئیں۔

اٹھارہویں صدی کی ایک خصوصیت اس تحریک کے حوالہ سے یہ بھی ہے کہ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحوں کا رواج اسی زمانہ میں شروع ہوا، چنانچہ انگلستان میں ۱۷۷۹ء کے لگ بھگ اور فرانس میں ۱۷۹۹ء کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی اور پھر جلد ہی استشراق نے بھی رواج پالیا اور اس کے ساتھ ایک مخصوص تصور اور مخصوص سلوک اور رویہ نے بھی جنم لیا، اس صدی کے مشاہیر علمائے مستشرقین میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) سائمن اوکلے (Ockley.G) انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۷۸ء تا ۱۷۲۰ء تھا، اس کی کتاب مسلمانوں کی تاریخ پر ۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۸ء شائع ہوئی، یہ تین جلدوں میں تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مستشرقین کے نتائج تحقیق کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا، (۲) ایڈورڈ پوکاک، انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۴۸ء تا ۱۷۲۷ء تھا، اس کا ہم نام ایک مستشرق سترہویں صدی میں گزرا ہے، (۳) جارج سیل، انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۹۷ء تا ۱۷۳۶ء تھا، اس نے ۱۷۳۴ء میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا اور بعض مستشرقین کے کلماتِ خیر کے ردِعمل میں آنحضرتؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب قرار دیا، (۴) جین گجنیر (Gajnier.J) انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۷۰ء تا ۱۷۴۰ء تھا، اس نے دو کتابیں شائع کیں، ان دونوں کتابوں کا مقصد بولین ویلیر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ ولین ویلیر کے مقابلہ میں اس نے ایک نئی تالیف پیش کی جو ۱۷۴۸ء میں امسٹرڈم سے نمودار ہوئی، (۵) رسک (Reisk,J.J) جرمن مستشرق جس کا زمانہ ۱۷۱۶ء سے ۱۷۷۴ء تک تھا، وہ جرمنی کا کلاسیکی لغوی اور عربی اسکالر تھا اور یونانی زبان وادب پر سند مانا جاتا تھا، (۶) ایڈورڈ گبن، انگریز مورخ زمانہ (۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء) اپنی کتاب تاریخ زوال روما کے لیے خاصی شہرت کا حامل، اس نے ۱۷۵۰ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرتؐ کے بارہ میں نہایت دل آزار رائے کا اظہار کیا اور رواداری کے دعویٰ کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کاذب کا خطاب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ آخری ایام میں شہوت، لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی میں مبتلا ہو گئے تھے، (نعوذ باللہ)، (۷) والٹیر (Voltaire,FR) فرانسیسی مصنف زمانہ ۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء، اس نے پیغمبر اسلامؐ کے بارہ میں اپنا مشہور ڈرامہ تحریر کیا، یہ ڈرامہ اگر تاریخی لحاظ سے بے بنیاد تھا تاہم یہ امر ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ اس وقت تک مستشرقین شریعت اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوئے تھے، یہ ڈرامہ ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آیا، اس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار

کیا بلکہ یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور آنحضرتؐ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرتؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب سے موسوم کیا، اس نے ڈرامہ کو پوپ پانژدہم کے نام منسوب کیا اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، پھر اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والٹیر نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف سخت نفرت کا مظاہرہ کیا، والٹیر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر دوسرے مستشرقین پر بھی پڑا، چنانچہ ڈیڈی روٹ (Diderot) اس فحش نگاری پر بھی اتر آیا کہ ''محمدؐ دنیا میں سب سے بڑھ کر عورتوں کے دوست اور سنجیدگی و معقولیت کے دشمن تھے۔'' (نعوذ باللہ)

تحریکِ استشراق کا عروج: انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لیے متعدد اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے، پچھلی صدیوں میں عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط وانحطاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا، ایک تو ان کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف ''مغرب'' کو زمانۂ بیداری کے بعد سیاسی، عسکری، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ہر میدان میں مسلسل تفوق و بالادستی حاصل ہوتی چلی جارہی تھی اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جارہی تھی، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالم اسلام خستہ اور زار ہوا اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا، یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو، اقوامِ مغرب کے لیے بہرحال خوش آئند تھی اور اس سے برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا، چنانچہ زیرنظر دور (۱۸۰۰ء تا ۱۹۲۵ء) تحریک استشراق کے عروج و کمال سے عبارت ہے، اس عہد میں تحریکِ استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا، مستشرقین کے انداز و اطوار اگرچہ بدلے گئے، تاہم کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے ان کے خلاف اپنے اسلاف پر بازی لے گئے، مثلاً:

(الف) کمیت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ زیر بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی، اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے جو خاموش صلیبی جنگ کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے، مثلاً فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، بلجیم، چیکوسلوا کیہ، فن لینڈ وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے۔

(ب) کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصنیفات کے ڈھیر لگا دیے، ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا بلکہ عقائد اسلام، قرآن، حدیث، سنت، فقہ، اجتہاد، عرب، اہل عرب اور احوال عرب، ترکوں اور عربوں کے تعلقات، اسلام کی اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبر اسلامؐ کی سیرت و سوانح وغیرہ پر کثرت سے لکھا گیا، اس دور میں مستشرقین کا معیار تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انہوں نے ایسا کمال دکھایا جو آج بھی باعث حیرت ہے، قدیم عربی ماخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافاتِ قدیم کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں، ان کی محنت و ریاضت، علم شناسی اور مشرق نوازی کی روشن دلیل ہیں، بلکہ یہ ان کا مسلمانوں پر احسان ہے کہ ان ہی کی کوششوں کے طفیل بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں مسلمانوں تک پھر سے پہنچیں اور مشہور و متعارف ہوئیں۔

(ج) مستشرقین کے گروہ میں حسب سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف و تالیف میں حصہ لیا، ایک طرف اگر روایتی قسم کے متشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے، تو دوسری طرف حقیقت بیں انصاف پسند، نرم رو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے، مثلاً گاڈفرے ہگنز، کاسن دی پرسیوال، ویل رینان، گوئٹے، شول، کارلائل اور درمنگھم وغیرہ۔

(د) مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا اور بحیثیت مجموعی اس دور

میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا نہ رہا، بلکہ مختلف عوامل کے نتیجہ میں نرم، حقیقت پسندانہ اور معقول ہوتا چلا گیا، اس کی بظاہر وجہ ایک تو مشرقی مصادر تک ان کی رسائی عربی اور دوسری مشرقی زبانوں سے واقفیت تھی کہ جس کے نتیجہ میں محض تخمین وظن کے بجائے وہ عقل واستدلال اور علم کی روشنی میں بات کرنے لگے، مشرقی ممالک کے مشاہدات و اسفار نے ان کے اپنے اسلاف کی لغویت ثابت کردی اور بیان وواقعہ کا تضاد سامنے آگیا، دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، نیز جدت پسندی، سائنسی ایجادات و اختراعات، تعصب وتقشّف کے خلاف بے چینی، رومانی تحریک، کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی مؤثر عوامل ثابت ہوئے، ان باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت ونفرت پر محبت ومودت کے جذبات غالب آگئے تھے بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انہیں نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کردیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، بہرحال اصل وجہ ہم کسی کو قرار دیں، واقعہ عملاً یہ پیش آیا کہ:

(أ) اس دور میں ان کے یہاں لغویات کم ہوگئیں اور الزامات واتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہوگیا۔

(أأ) نیز صورتِ حالات نے کلیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کردیے، جنھوں نے جرأت سے کام لے کر اپنے پیشرو مصنّفین کی تغلیط کی اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا۔

(ہ) اپنی سرگرمیوں کو منظّم ومرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کیے، مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس ۱۸۲۲ء، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ ۱۸۲۳ء اور امریکن اورینٹل سوسائٹی ۱۸۴۲ء وغیرہ ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جریدے نکالنا شروع کردیے، جن سے ان کی تحریک کو

بے پناہ تقویت حاصل ہوئی، لوگوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے میں رسائل وجرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لیے متذکرہ بالا مجلات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اپنی حکمتِ عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد رسائل وجرائد کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا، چنانچہ ہندوستان سے "The Muslim world" کا اجرا، پیرس سے ۱۸۹۵ء میں، "Revae-de-Islam" کا اجرا، روس سے ۱۹۱۲ء میں، "Mir Islam" کا اجرا وغیرہ، رسائل وجرائد اور مجلّات کی ان اشاعتی سرگرمیوں کا بظاہر مقصد تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کراسکیں لیکن بہ باطن مدعا اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا، رہی ان کی بلند آہنگی تو وہ صاف نتیجہ تھی اقوام یورپ کی بالادستی کا اور استعماری تسلط کا، بہر حال اب منزل وہ بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانگریس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۳ء میں اسے پہلی بار عملی جامہ پہنایا گیا، عالمی کانگرسوں کا انعقاد بھی ان کے لیے بڑا مفید طلب تھا، مختلف اداروں کی سرگرمیاں، کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علما وفضلا کی شرکت، مقالات، خطبات، صلاح مشورے، قراردادیں وغیرہ، یہ سب باتیں تحریک استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لیے بہر حال ضروری تھیں اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا اور انیسویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کردیا۔

بہر حال یہ تفصیل اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ تحریکِ استشراق کا دور عروج وکمال تھا اور پھر ہم نے دیکھا کہ تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی رفتار سے ترقی ہوئی، مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام سرگرمیاں بہت منظّم طریقے سے ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں، اسی عہد کی آخری دہائی میں اگرچہ عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور متعدد واقعات وحوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی، سماجی اور معاشی وثقافتی حالات کا نقشہ

بدل ڈالا، تاہم یہ جائزہ ہم آئندہ صفحات میں عہد جدید کے تحت لیں گے۔

یہاں زیر بحث دور کے کچھ مشاہیر مستشرقین کا مختصر تعارف کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(۱) جان جاک سیدیلو (Sedillot.J.J) مشہور فرانسیسی مستشرق جس کا زمانہ (۱۷۷۷ء تا ۱۸۳۲ء) تھا، متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں جن میں ایک تاریخ عرب بھی ہے۔ (۲) دیورجے (Deeverjers,A.N) فرانسیسی مستشرق، زمانہ ۱۸۰۵ء تا ۱۸۶۷ء، اس کے آثار میں متعدد تصانیف شامل ہیں، تاریخ ابوالفدا سے سیرۃ النبی ؐ کا خلاصہ متن وترجمہ کے ساتھ ۱۸۴۷ء میں شائع کیا، بلادعرب پر کئی مجلدات بشمول تاریخ خلافت عہد مغلیہ تک، مطبوعہ ۱۸۴۷ء، (۳) ڈاکٹر پیرون (Perron,A) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۰۵ء تا ۱۸۷۶ء) مصنف کتاب نساء العرب قبل الاسلام وبعدہ، مطبوعہ ۱۸۵۸ء، نیز ترجمہ کتاب الطب النبوی از جلال الدین ابی سلیمان داؤد، مطبوعہ ۱۸۶۰ء، (۴) گارسن دی تاسی (Tassy garcin de) فرانسیسی مستشرق، زمانہ ۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء، صاحب تصانیف دین اسلام، قرآن، مذہبی تعلیمات وفرائض وغیرہ، (۵) جوزف وہائٹ (White.J) انگریز مستشرق، زمانہ ۱۷۴۶ء تا ۱۸۱۴ء، اسلام اور نصرانیت کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل مقالات ومحاضرات، اسلام اور پیغمبر اسلام پر خطبات، (۶) ولیم رائٹ (Wright,W) برطانوی مستشرق اور مصنف، زمانہ ۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء، (۷) ایڈورڈ ہنری پامر (Palmer,E.H) برطانوی مستشرق اور مشہور مترجم قرآن، ترجمہ قرآن مطبوعہ، آکسفورڈ ۱۸۸۰ء، زمانہ ۱۸۴۲ء تا ۱۸۸۳ء، (۸) ڈی جونگ (Jong, de) ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۹۰ء، دوسرے ہم وطن مستشرق ڈی جوجے (Gocje, M.J.DE) کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام پر کام کیا، متن اور لاطینی میں ترجمہ لیڈن سے ۱۸۸۱ء میں شائع کرایا، (۹) ڈی جوجے ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ ۱۸۳۶ء تا ۱۹۰۹ء، کثیر التصانیف، وفیات الاعیان از ابن خلکان پر کام کیا اور اپنے ہم وطن مستشرق ڈی جونگ

کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام کے متن و ترجمہ کی اشاعت کی، (۱۰) فلائشر .Fleischer)
H.L.) جرمن مستشرق تھا، زمانہ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء) متعدد کتابیں لکھیں، تاریخ ابوالفداء کو
متن و ترجمہ کے ساتھ اور تعلیقات و حواشی سے آراستہ کر کے لیپزک سے ۱۸۳۱ء میں شائع
کرایا، ایک اور کتاب تاریخ عرب قبل اسلام پر لکھی جو لیپزگ سے اسی سنہ میں چھپی، (۱۱)
وسٹنفیلڈ (Wusten Feld,F) جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۹ء) زود قلم مصنف،
تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات و حواشی (تین جلدیں) آراضی مدینہ منورہ
اور تاریخ اشراف مکہ وغیرہ کتابیں اس کی یادگار ہیں، (۱۲) بیریزین (Beresine,N) مشہور
روسی مستشرق (۱۸۱۸ء تا ۱۸۹۶ء) گویا روسی مستشرقین کے زمرۂ اساتذہ میں شامل متعدد
تصانیف، مصادر اسلامی، تہذیب و تمدن اور اسلام کے درمیان تعلق پر کتابیں، روسی دائرۃ
المعارف میں مشرق اور مشرقی علوم و آداب پر متعدد مقالات اسی مستشرق کے قلم سے ہیں،
(۱۳) بلانکو (White Josseph Blanco) مشہور مستشرق برطانوی مذہبی مصنف (۱۷۷۵ء
تا ۱۸۴۱ء) مستند پادری، خاص کام کا میدان اندلس کی تاریخ تھا، (۱۴) ایڈورڈ سخاؤ، مشہور و
معروف جرمن مستشرق، برلن میں مشرقی زبانوں کے کلیہ کا سربراہ، خود بڑا اسکالر اور زبان داں
تھا، بقول مولانا شبلیؒ پروفیسر سخاؤ کی ہی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے
ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبویؐ میں کوئی
تالیف نہیں شائع ہوئی، (۱۵) سلیم نوفل، روسی استشراق کی تاریخ میں اہم نام، استادوں کا
استاد، سرخیلِ مستشرقینِ روس میں سے ایک تھا، زمانہ (۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۲ء) توطن لبنان، کام
فرانسیسی میں کیا، سیرت نبویؐ اور اسلامی تعلیمات پر تصانیف، (۱۶) فان کریمر (Woncremer)
آسٹریا کا مشہور مستشرق، ولادت ویانا میں ہوئی، تعلیم بھی وہیں پائی، ترقی کر کے وزارت
کے درجہ تک پہنچا اور وفات تک وزارت خارجہ اور دوسری وزارتوں میں خدمات انجام دیتا
رہا، اسلامی مصادر کی تقریباً بیس عربی کتابوں کو تلاش کر کے شائع کیا، ان میں سے واقدی کی

المغازی ، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ ،نشوان کا قصیدہ الحمیریہ وغیرہ قابل ذکر ہیں ، اس نے اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کے بارہ میں کثرت سے کتابیں لکھیں جو جرمن زبان میں ہیں ،(۱۷) سر ولیم میور، مشہور انگریز مستشرق ، اس کا تفصیلی تعارف مقالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے ،(۱۸) مینارڈ (Meynord.B.DE) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۲۷ء تا ۱۹۰۸ء) اس نے استشراق پر پہلا رسالہ لکھا اور شائع کرایا ، جغرافی، تاریخی، ادبی لغت مرتب کی ، مسعودی کی مروج الذہب کا متن وترجمہ شائع کیا ،(۱۹) رینی باسے (Basset,Rene) فرانسیسی مستشرق ، زمانہ (۱۸۵۵ء تا ۱۹۲۴ء) بے شمار کتابوں کا مصنف، مثلاً الشعر العربی قبل الاسلام ، مطبوعہ ۱۸۸۰ء ، بوصیری کا قصیدہ بردہ ، نقد شرح مع ترجمہ مصنف وغیرہ وغیرہ ،(۲۰) ڈاکٹر لیبان (Lebon.D.G.) فرانسیسی مستشرق ، مشہور عالم، طبیب اور تمدن وحضارتِ مشرق کا جاننے والا مؤرخ تھا ، ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا ، متعدد ضخیم کتابیں لکھیں ، تمدن مصر ، تمدن عرب اور اندلس میں عربی تمدن پر کام قابل ذکر ہے ، اس کا شمار ان مغربی مستشرقین میں ہوتا ہے جو انصاف پسند تھے اور اسلامی خوبیوں کے قائل تھے ،(۲۱) گولڈزیہر، ہنگری کا مشہور ومعروف مستشرق (۱۸۵۰ء، ۱۹۲۱ء) کثیر التصانیف شخص تھا ، قرآن ، تفسیر ، حدیث ، سیرت پر بے شمار دراسات قائم کیے ، گولڈزیہر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نولدیکے کے نقد حدیث سے آگے بڑھ کر انکار حدیث میں اس کا ہم نوا بن گیا ، انکارِ حدیث کے بعد گولڈزیہر نے سیرت کے دوسرے مصادر کو بھی نشانہ بنایا ،(۲۲) ولہاوزن، جرمن مستشرق (۱۸۴۴ء، ۱۹۱۸ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں ، مختلف موضوعات پر لکھا ، تاریخ یہود ، محمد مدینہ میں ، دین اسلام کے مطالعات ، عہدِ نبویؐ میں دستورِ مدینہ ، مکاتیبِ نبویؐ اور وفود ، منقول از ابن سعد مع متن وترجمہ ، وہ پروٹسٹنٹ تھیولوجین اور بائبل پر عبور رکھتا تھا ،(۲۳) واشنگٹن ارونگ ، معروف امریکی اسکالر اور مستشرق (۱۷۸۳ء، ۱۸۵۹ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں ، خصوصاً سیرت محمدؐ اور خلفا پر دو جلدیں جو ۵۰-۱۸۴۹ء میں شائع

ہوئیں، اس کی کتاب حیات محمدؐ کا ترجمہ عربی میں شائع ہوا، (۲۴) یوجین یونج (Eugen-younge) فرانسیسی مستشرق، متعدد کتابوں کا مصنف، ایک ضخیم رسالہ نور اسلام کی خاص کرن، دوسرا مشرق جس طرح اسے مغرب نے دیکھا، سیرۃ نبویؐ بہ زبان فرانسیسی وغیرہ وغیرہ، انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ قرون وسطیٰ کا مسیحی دماغ بھی بدلتا چلا گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگرچہ ان کے عزائم اور مقاصد میں فرق نہیں آیا، تاہم دین اسلام اور سیرت رسولؐ کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ اور سلوک یکساں نہیں رہا اور جیسے جیسے عہد جدید کی منزل قریب آتی گئی، مجموعی طور پر ان کے ظاہری رویہ میں معقولیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا اور وہ خود یہ محسوس کرنے لگے کہ تعصب اور تشدد کی انتہا پسندی خود ان کے لیے اور ان کی تحریک کے لیے ضرر رساں ہوگی، بہر حال اب ہم اگلے دور میں قدم رکھتے ہیں۔

عہد جدید: پچھلا دور جو بیسویں صدی کے ربع اول میں اختتام کو پہنچا، جیسا کہ ظاہر ہوا، تحریک استشراق کا نقطۂ کمال ثابت ہوا اور ہر اعتبار سے استشراقی سرگرمیوں نے فروغ پایا، اب وہ دور جسے ہم عہدِ جدید سے تعبیر کر سکتے ہیں بیسویں صدی کے ربع اول سے شروع ہوا اور تا حال جاری وساری ہے۔

عہدِ جدید آیا تو اپنے جلو میں نت نئے رجحانات لے کر آیا اور سیاسی و عسکری اور معاشی وسماجی سطح پر پچھلی بہت سی باتوں کو زیر وزبر کر گیا، چنانچہ عالمی جنگیں اور اس کے نتیجہ میں مشرقی ومغربی معاشروں پر ہمہ گیر اثرات، نو آبادیاتی علاقوں کی بیداری، ظلم واستحصال کی تاریکیوں کے خلاف حریت وآزادی کی روشنی، استعماری قوتوں کی شکست وریخت، ایجادات واختراعات کا ظہور، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظریات کی نمو اور تہذیب وتمدن کے تنوع نے حالات ومسائل کی نوعیت کو بہت کچھ بدل ڈالا، ادھر استشراق کے حوالہ سے یہ

امر قابل ذکر ہے کہ تحریک استشراق پچھلے دور میں جس نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی، ہر کمالے را زوال کے مصداق، غالباً مزید پیش قدمی ممکن نہ رہی، اس لیے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوا کہ کیا تحریکِ استشراق رو بہ زوال ہوگئی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کی کوششوں کا ایک رخ تو یہ ٹھہرا کہ جو کچھ حاصل کرلیا گیا تھا اسے بہر طور باقی رکھا جائے، دوسری طرف اسلام، پیغمبر اسلام اور عالم اسلام کے اعمال و احوال میں زیادہ انہماک، توجہ اور امعان نظر برتا جانے لگا، جز وقتی اسکالرز کے بجائے کل وقتی علما نے جگہ حاصل کی اور آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور مغرب کی دوسری جامعات میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دوسرے اسلامی و مشرقی مباحث کے لیے باقاعدہ نشستیں مخصوص کی جانے لگیں، یہ مطالعہ لازماً خلوص پر مبنی نہیں تھا، مگر ان کے اشتغال وانہماک پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ اس سے خال خال مفید نتائج بھی پیدا ہوئے اور کعبہ کو صنم خانے سے بعض پاسبان بھی مل گئے۔

مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے کسی حد تک اعتدال اور انصاف پسندی کی روایت جسے ویل، گوئٹے اور کارلائل وغیرہ نے آگے بڑھایا تھا، اس عہد میں بھی جاری وساری رہی اور الفانسو، آرچر، ٹائن بی، بلاشیر اور واٹ وغیرہ کے یہاں روایتی انتہاپسندی کے ساتھ ساتھ معقولیت و معدلت کے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں، اسلامی مصادر کی تحقیق و دریافت، ان کی تبویب اور اشاریہ سازی کا کام نہ صرف آگے بڑھا بلکہ ایک طرف تو مستشرقین نے اس معاملہ میں اپنی محنت و ریاضت سے ایک طرح کی اجارہ داری حاصل کرلی اور دوسری طرف اسلامی و مشرقی مصادر پر نقد و جرح کے کام کو بھی وسیع پیمانہ پر انجام دیا جانے لگا، یہ غالباً تحریکِ استشراق کے مزاج سے بھی ہم آہنگ تھا کہ مصادر و مآخذ کا اعتبار اسی طریقہ سے اٹھ سکتا تھا اور مشرقی اذہان وقلوب میں تشکک و تذبذب کے بیج بوئے جاسکتے تھے، اس ضمن میں قرآن و سنت اور دوسرے مصادر سیرت کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا اور مآل کار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس کے مفاد پرست سیاسی

رہنما تھے اور مذہبی خلوص وسچائی ان میں بہت کم تھی۔

اس عہد میں جو نئے رجحانات پروان چڑھے، ان میں سے چند قابل ذکر ہیں:

بعض مستشرقین نے سیرت نبویؐ کا مطالعہ طبی اور معالجاتی (Pathological) نقطۂ نظر سے کیا، کچھ نے اس عہد کے معاشی اور سماجی عوامل سے متاثر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک معاشی اور معاشرتی مصلح کی حیثیت سے اہمیت دی اور کچھ نے ان سب سے مرکب و مرتب نظریہ قائم کیا، یہ تمام نقطہ ہائے نظر دراصل مخصوص ذہنی وفکری پس منظر کی پیداوار تھے، طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر سے سیرت کے مطالعہ میں یہ موقف قائم کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (خاکم بدہن) نفسیاتی ودماغی امراض کا شکار تھے، انہیں مرگی کے دورے پڑتے تھے اور ہنری لامنس کی دریافت یہ ہے کہ یہ دورے حددرجہ شہوت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے، اس سے پہلے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی مشہور برطانوی مستشرق اسپرنگر بھی کر چکا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوش کر چکا تھا کہ خدانخواستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام اعصاب چونکہ مختل تھا اور آپؐ نعوذ باللہ ہذیان واضطراب اعصابی کے مریض تھے، اس لیے ان کے لائے ہوئے دین اور ان کی سیرت میں اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے، طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر کو مزید تقویت مطالعۂ سیرت میں علم النفس کے اصول کے اطلاق سے ملی، اس کے تحت اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کی نفسیاتی تحلیل کی کوشش کی گئی اور اس معاملہ میں فرانز بہل (Frantz Buhl) اور طور اینڈرے (Torandrae) نے سبقت دکھائی اور حق ترجمانی ادا کیا۔

زیر بحث دور میں جن نئے رجحانات اور نئی تحریکوں نے جنم لیا، ان میں اشتراکی نقطۂ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے، مارکس اور انیجلز کے خیالات اور تاریخ کی مادی تعبیر نے اپنا حلقۂ اثر پیدا کیا اور ایسے مستشرقین آگے آئے جن کی نظر میں اسلام کی اشاعت وفروغ اور پیغمبر اسلامؐ کی کامیابیاں دراصل سیاسی، سماجی اور معاشرتی عوامل کی کارفرمائیوں کا نتیجہ تھیں، چنانچہ اس ضمن میں جرمن مستشرق ہیوبرٹ گرائم (Hubert Grime) کا نام معاشی

نظریہ کے ارتقا کی علامت بنا، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں، اس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کو ایک مذہبی و دینی نظام کی بہ نسبت ایک سماجی اشتراکی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر کے بجائے صرف ایک سیاسی، سماجی اور معاشی مصلح سمجھنا چاہیے، سیاسی، سماجی اور معاشی نقطہ ہائے نظر کا رنگ مارگیولیوتھ نے اور گہرا کیا اور اس نے اپنے مطالعۂ سیرت میں آنحضرتؐ کو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا اور اپنی کتابوں اور مقالات میں یہاں تک لکھا کہ مکہ میں اپنی دکان سے لے کر مدینہ میں ایک مملکت کی تعمیر تک تیئس سال کا عرصہ لگایا، پھر دریدہ ذہنی کی انتہا کرتے ہوئے آنحضورؐ کو نعوذ باللہ ڈاکوؤں کا سردار اور مدینہ کا ظالم اور مستبد لکھنے میں بھی تکلف نہیں کیا، اطالوی مستشرق پرنس لیون کتانی نے اپنے دیو پیکر کام کا ماحصل یہ قرار دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس ایک چالاک سیاست داں تھے اور انہوں نے معاشی و سیاسی مفادات کی خاطر مذہبی داعیات کو قربان کر دیا تھا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ (خاکم بدہن) محمدؐ پکے مفاد پرست تھے اور اپنی سیاست بازی میں انہوں نے اپنی مذہبیت کو پسِ پشت ڈال دیا تھا، مطالعۂ سیرت میں انتہاپسندی خلاف حقیقت بھی تھی اور خود گروہ مستشرقین میں سے بھی بعض نے اسے پسند نہیں کیا، تاہم مستشرقین نے بین بین رویہ اختیار کیا، مثلاً عہد جدید کا مشہور مؤرخ ٹائن بی اپنی عظیم الشان تصنیف مطالعۂ تاریخ میں دنیا جہان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتا ہے اور واقعات سے اصولوں کو اخذ کرتا ہے، پھر اسلام کے بارہ میں بھی عمومی طور معقول رویہ کا اظہار کرتا ہے لیکن جب سیرتِ رسولؐ پر قلم اٹھاتا ہے تو آپ کی حیاتِ طیبہ کو دو مراحل میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک پہلا مرحلہ تو وہ ہے جب کہ آنحضورؐ کا قیام مکہ میں رہا، اس دوران میں بقول ٹائن بی آپ کلیۃً مذہبی مشنری سرگرمیوں میں منہمک رہے لیکن دوسرے مرحلہ میں مدینہ پہنچ کر انہوں نے بقول ٹائن مذہبی مقاصد سے الگ ہو کر سیاسی سرگرمیوں کو جاری کیا، وہ بہر حال اس خیال کی پر زور تردید کرتا ہے کہ آنحضرتؐ

ایک بہرو پیا تھے، ٹائن بی کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک حضرت مسیحؑ ایک مثالی پیغمبر تھے، بلاشبہ حضورؐ کی زندگی، آپ کی حیاتِ طیبہ کے مصادر سے بحث کرتا ہے اور غلو سے بچتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ احادیث وسیر کے ذخیرے میں بہر حال ایک حصہ ایسا ہے جسے جدید تکنیکی طریقوں سے جانچ پرکھ کر مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے، اسی قسم کا نقطۂ نظر منٹگمری واٹ کا بھی ہے، مطالعۂ سیرت کے ضمن میں واٹ نے متعدد کتابیں تحریر کیں، واٹ کی تصنیفات کو بہر حال آخری جدید ترین کوششوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کے نزدیک مصادر نے جہاں تک اجازت دی اپنی دانست میں ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی، واٹ کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال میں ''علمیت'' نے جو ترقی کی ہے اس کا مظاہرہ اس کی تصانیف میں نظر آتا ہے اور اس کی تصانیف اسلامی مآخذ کی جدید ترین دریافت اور جرح وتنقید کے جدید اصولوں کی عکاسی کرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واٹ کا موقف ٹائن بی کے موقف سے زیادہ مختلف نہیں ہے کہ وہ بھی آنحضرتؐ کی شخصیت کو مکہ ومدینہ میں مختلف سمجھتا ہے۔

بہر حال عہد جدید کا یہ مجموعی جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ عہد جدید کے مستشرقین اگر چہ اپنے اندازِ تحریر، اپنی علمیت اور طرز ہائے تحقیق میں اپنے اسلاف سے بہت مختلف ہو گئے ہیں اور بہت سے معاملات میں انہوں نے بالکلیہ رجوع کر لیا ہے، تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام تر جدیدیت کے علی الرغم تحریک استشراق کا اصل محرک جذبہ اب بھی کار فرما حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ عہد جدید کا ایک مصنف فرانسیسکو جریئلی اپنی زبان قلم سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ''پرانی دشمنی عہد جدید میں بھی جاری ہے'' علاوہ ازیں اس صورت حال میں ایک اور جدید ترین مصنف ایڈورڈ، ڈبلیو، سعید کا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ استشراق اور اس کی تحریک کا اہتمام وانضباط بنیادی طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ایک سیاسی ضرورت کے تحت ہوا (اوریئنٹلزم ص ۲۰۴ و ۲۰۱) اور استشراق کو جہان مشرق پر اس وقت مسلط کیا گیا، جب کہ مشرق مغرب کے مقابلہ میں

مغلوب و منفعل تھا اور پھر "قوت وضعف" کے اسی تفاوت نے بعض لازمی نتائج پیدا کر دیے، (ایضاً ص ۲۰۴) استشراق کے درحقیقت دو چہرے، دو رخ ہیں، ایک اس کا داخلی اور پوشیدہ پہلو (Latent) اور دوسرا ظاہری، خارجی رخ (Manifest) پہلا داخلی رخ تو ہمیشہ سے ایک ہے، جسے کبھی کسی زمانہ میں نہیں چھوا گیا، جب کہ دوسرا ظاہری پہلو متغیر ہوتا رہا، یعنی مشرقی معاشرہ و تہذیب، زبان، ادب، تاریخ، معاشرت وغیرہ کے بارے میں خیالات و افکار بدلتے رہے، مختصر یہ کہ مستشرقین کے خیالات میں تبدیلی اسی ظاہری استشراق کی وجہ سے آتی رہی لیکن داخلی جذبۂ استشراق ہمیشہ سے آج تک یکساں محکم و مستحکم رہا اور کسی واضح تبدیلی سے آشنا نہیں ہوا، (ص ۲۰۶) بہر حال خلاصہ یہ کہ استشراق کسی مثبت اور تعمیری رویہ اور سلوک و دستور کا نام نہیں ہے بلکہ یہ مغرب کی جاری کردہ موثر علمی روایت ہے۔ (ایضاً ص ۲۰۳)

عہد حاضر کے اس مختصر علمی جائزہ کے بعد مناسب ہے کہ اس دور کے چند مشاہیر مستشرقین کا تعارف پیش کر دیا جائے:

(۱) مونٹے (Montet,ed) (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۷ء) اس کی علمی یادگاروں میں اسلام حال و مستقبل (مطبوعہ پیرس ۱۹۱۰ء) الاسلام (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) تاریخ اسلام (مطبوعہ ۱۹۱۳ء) اور فرانسیسی میں ترجمۂ قرآن (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) شامل ہیں، (۲) گاڈ فرے ڈی ممبائن (Goude Frey de Mombynes,m) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۲ء-۱۹۵۷ء) پیرس میں مشرقی علوم والسنہ کے شعبہ میں عربی کا استاذ، متعدد کتابوں کا مصنف، مثلاً اسلام میں نظم (۱۹۳۱ء) مکہ و مدینہ (۱۹۱۸ء) عالم اسلام اور بازنطینی صلیبیوں تک (۱۹۳۱ء) وغیرہ، (۳) کارلو الفانسو نلینو، اطالوی مستشرق زمانہ (۱۸۷۲ء-۱۹۳۸ء) بے شمار مصنفات و مطبوعات اس سے منسوب ہیں، مثلاً منتخبات القرآن (لیپزگ ۱۸۹۳ء) اسلام سے پہلے قبائل عرب کی تکوین و ترتیب (۱۸۹۳ء) تاریخ یمن قبل اسلام (۱۹۲۷ء) ممالک عرب کی اسلام کے بعد عصر حاضر تک تاریخ، جغرافیہ، ثقافت، عادات، اسماء قبائل و تراجم رجال، فہرست مخطوطات

اور شخصیات کی تحقیق، رواۃ، روایت اور مصادر کی تحلیل وغیرہ اور حیات محمدؐ جو اس کے انتقال کے بعد روم سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی، (۴) سر تھامس آرنلڈ، انگریز مستشرق زمانہ (۱۸۶۴ء-۱۹۳۰ء) ان کی مشہور ترین کتاب دعوت اسلام ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۹۶ء)، (۵) رابرٹ بریفالٹ (Briffault,Robert) برطانوی مستشرق، انگریز سرجن اور ناول نگار، مشہور ترین کتاب ''دی میکنگ آف ہیومینیٹی'' تھی، (۶) اسٹینلے لین پول، مشہور برطانوی مستشرق (زمانہ ۱۸۵۴ء-۱۹۳۱ء) مؤرخ ماہر اثریات، برٹش میوزیم میں پرانے سکوں کا محافظ (۱۸۷۴ء-۱۸۹۲ء) تاریخ مسلمانان اندلس پر خاص کام ہے، (۷) نکلسن، مشہور برطانوی مستشرق، متعدد تصانیف کا مصنف لیکن خاص کتاب عرب کی ادبی تاریخ (مطبوعہ لندن و نیویارک ۱۹۰۷ء) اور اس کا مضمون محمدؐ اور قرآن، نیز محمدؐ کی ایک نامعلوم سوانح نکلسن کا زمانہ (۱۸۶۸ء-۱۹۴۵ء) ہے، (۸) نولدیکے، مشہور جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۳۶ء-۱۹۳۰ء) تصنیفات زیادہ تر سامی زبانوں پر اور تاریخ اسلام پر، نیز قرآن کی اصل اور ترکیب پر بحث، نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل، سیرت پر ایک کتاب کا مصنف (مطبوعہ ۱۸۶۳ء)، (۹) ہرگرونج (Hergronje,S,H.) ہالینڈ کا مستشرق (زمانہ ۱۸۵۷ء-۱۹۳۶ء) اس کے آثار میں مکہ کا حج، فقہ اسلامی اور سیاست نبویؐ شامل ہیں، مذہباً عیسائی، زیادہ تر کام ولندیزی زبان میں ماہر اسلامیات سمجھا جاتا تھا، اس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنی ابتداء سے ہی سیاسی مذہب تھا، بہرحال اسے اسلام کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں اور اس نے نجی اسلام اور سرکاری اسلام کے درمیان فرق متصور کیا، (۱۰) ونسنک، ولندیزی مستشرق (۱۸۸۱ء-۱۹۳۹ء) اس کی علمی یادگاروں میں یہود مدینہ کے بارہ میں رسول اللہﷺ کا موقف جو اس کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع بھی تھا اور لندن سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا، نیز محمدؐ اور یہود، الاسلام (مطبوعہ ۱۹۱۱ء) وغیرہ خاص کتابیں ہیں، (۱۱) زخاؤ، جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۴۵ء-۱۹۳۰ء) جیسا کہ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ابن سعد کی طبقات اسی کی کوششوں سے زیور طبع سے آراستہ

ہوئی، (سیرۃ النبیؐ ج۱،ص۹۲)، (۱۲) جوزف ہوروز (Horovitz.J) جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۷۴ء-۱۹۳۱ء) اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں مغازی واقدی پر قلم اٹھایا (مطبوعہ ۱۸۹۸ء)، (۱۳) جوزف ہیل، جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۷۵ء-۱۹۵۰ء) آثار میں عربی تہذیب پر اس کی کتاب مشہور ہے، (۱۴) کارل بروکلمان، جرمن مستشرق، (زمانہ ۱۸۶۸ء-۱۹۵۶ء) بے شمار کتابوں کا مصنف لیکن مشہور ترین تصنیف ''تاریخ اقوام مسلم'' ہے، اس میں آنحضرتؐ پر تحریر قابل ذکر ہے، (۱۵) بارتھولڈ، روسی مستشرق (زمانہ ۱۸۶۹ء-۱۹۳۰ء) تصانیف کثرت سے ہیں، مثلاً اسلامی تہذیب، تاریخ ترکستان، عالم اسلام، خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہ، (۱۶) سموئیل زویمر (Zewemer.S) امریکی نژاد، اجل علمائے مستشرقین، اس کی تصانیف کثرت سے ہیں، خاص طور پر مسیحیت اور اسلام کے تعلقات پر، اس کی دیگر کتابوں میں اسلام سے پہلے بلاد عرب، دنیا میں اسلام، حیات محمدؐ، اسلام صحرائے عرب میں اور ورثہ نبویؐ وغیرہ ہیں، (۱۷) ایچ، جی، ویلز، انگریز مستشرق (زمانہ ۱۸۸۶ء-۱۹۴۶ء) افسانہ نگار، ماہر عمرانیات اور مؤرخ، متعدد تصانیف یادگار ہیں، خصوصاً دی آوٹ لائن آف ہسٹری، میں محمدؐ اور اسلام، (۱۸) گب، اس عہد کا مشہور ترین برطانوی مستشرق ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا اور ابھی چند سال پہلے وفات ہوئی ہے، گب کی تصانیف اگرچہ بہت سی ہیں تاہم اصل شہرت کتاب محمڈنزم سے ہوئی جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی، کتاب کے نام کے سلسلہ میں گب نے خود توجیہات پیش کی ہیں لیکن یہ نام اور توجیہات خود اس کے شاگرد اسمتھ کو پسند نہیں آئیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گب کے یہاں مختلف نظریات، تصورات اور خیالات میں ارتقا واقع ہوا اور وقت و حالات کے تحت بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے جس کا ثبوت اس کی مختلف تحریروں سے ملتا ہے، اپنی عمر کے آخری ایام میں بہر حال اس نے اسلام کے بارہ میں نرم روی کا مظاہرہ کیا، (۱۹) ولفریڈ کینٹویل اسمتھ، گب کا شاگرد، جولائی ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوا، پی، ایچ، ڈی کی سند ۱۹۴۹ء میں، ایک اور مستشرق فلپ، کے، ہٹی کی زیر نگرانی تحقیقی

مقالہ مجلۃ الازہر، تجزیہ وتنقید پر حاصل کی، مذہباً عیسائی متعدد کتابوں کا مصنف، حال پروفیسر ریلیجن ڈلہوزی یونیورسٹی کناڈا، (۲۰) جوزف شاخت، جرمن مستشرق، پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی، خالص یہودی، اسلام اور علوم اسلامی پر متعدد تصانیف ہیں لیکن اصل کام قانون اور اصول فقہ اسلامی پر ہے، (۲۱) برناڈ لوئس، عہد جدید کا مشہور انگریز مستشرق، ۱۹۱۶ء میں لندن میں پیدا ہوا، تصانیف کثرت سے ہیں لیکن مشہور کتابوں میں عربس ان ہسٹری، اسلام ان ہسٹری، کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مدیر و مقالہ نگار رہے، اسلام دشمنی کے لیے مشہور ومعروف ہے اور آج کل یہود پرستی اور اسلام دشمنی میں سرفہرست ہے۔

عہد جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجہ بالا تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن تحریکِ استشراق کے کیف وکم کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے اور بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریکِ استشراق اپنے آغاز اور عروج وارتقا کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد آج کے عہد میں انتشار سے دوچار ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنّفین اپنی اصل تحریک کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہرحال نظر نہیں آتی جو پہلے ان کا خاصہ تھا، مستشرقین کی نوجوان نسل، زمانہ کے حالات ووسائل کے پیش نظر ذہن وفکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار ہورہی ہے، ادھر اسلامی دنیا میں سوچ کی نئی لہریں پیدا ہورہی ہیں اور بعض جدید مفکرین ومصنّفین مشرق کی تحریروں نے خود مغربی دنیا میں مدوجزر پیدا کردیا ہے، پھر یہ بات بھی صاف ہے کہ اب طاقت وقوت کے سارے اوزان وپیمانے بدل گئے ہیں، استعمار اور استحصال کی لغات بدل گئی ہیں، علمی وذہنی مرعوبیت پہلے جیسی نہیں رہی اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر فلک وفضا اور زمین دیکھ رہا ہے، اس لیے کیا عجب کہ آنے والا زمانہ تحریکِ استشراق کے کوچ کا بگل بجادے، اس لیے بقول ایک مصنف ”وقت آگیا ہے کہ اسلامی مفکرین وعلما اپنے حریفوں کے مدمقابل آئیں اور معاندین ومخالفینِ اسلام کے خلاف علمی محاذ پر حقیقی معرکہ کے لیے صف آرا ہوں، البتہ معروضیت کا خواہ مخواہ

دعویٰ نہ کریں کہ علمی معروضیت تو درحقیقت فریب نظر (Myth) ہے۔

(جانس، ملی ٹینٹ اسلام، ص ۸۵، لندن ۱۹۷۹ء)

اسباب ومحرکات: تحریکِ استشراق نے اپنے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک کا سفر جس انداز سے طے کیا ہے، اس کا ایک عمومی جائزہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے اور بین السطور تحریک کے اغراض ومقاصد اور محرکات کی بڑی حد تک نشاندہی بھی ہوچکی ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے پس پردہ محرکات واسباب کو صاف صاف بیان کردیا جائے، چنانچہ بطور خلاصہ ان کو مندرجۂ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ اسلام اور ادیان غیر میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں، اسلام کا نظریۂ حیات، اس کا نظام فکر وعمل، اس کے تہذیب وتمدن کا اظہار، یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے، پھر دانائے سبل، ختم الرسلؐ نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اس نے روز ازل سے ہی ادیان باطلہ کی نفی کردی تھی، اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار، اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کے بارہ میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں اور اپنے بغض وعناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں، ان کا یہ رویہ اور ان کی شقاوت وقساوت دراصل نظریاتی وفکری بنیادوں پر استوار ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ''تم دیکھوگے کہ اہل ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤگے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے'' (سورۂ مائدہ: ۸۲) جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے ان کے پورے گروہ میں نمایاں یہود، نصاریٰ اور مشرکین ہیں، ان کو اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پر پسند نہیں، بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں، اس لحاظ سے تحریکِ استشراق کی اٹھان اسلام دشمنی کے زیر سایہ ہوئی

اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے۔

۲۔ نظریاتی سبب کے علاوہ ایک سبب تاریخی بھی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا گیا اور اس کے علمبرداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر لہرا دیا، اس پر مستزاد یہ کہ اپنی پیش قدمی میں اسلام نے اپنی راہ کی تمام مزاحمتوں کو اس آسانی کے ساتھ ختم کر دیا کہ دنیائے مغرب آج تک انگشت بہ دنداں ہے، خاص طور پر اس وقت کی معلوم دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم اور فارس کا سر غرور سے یوں سرنگوں کیا کہ وہ صدیوں خمیدہ رہا، بہر حال اسلام کی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ وسعت و اشاعت نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی و نظریاتی رفعتوں کو پارہ پارہ کر دیا، بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں (شام، فلسطین، مصر، وغیرہ) پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے، شمالی افریقہ کی فتوحات، اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیر و زبر کر دیا اور یوں اسلام اور مغرب کے درمیان عداوت کی مستقل بنیاد پڑ گئی، یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بھی نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

۳۔ محاربات صلیبی کو اگر ہم تحریکِ استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا، صلیبی جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں، البتہ اس حد تک نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام و نامراد ہوئیں اور (۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۲ء تک کے) معرکہ ہائے صلیب و ہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے، اس لیے انہوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے علمی و فکری محاذ کو منظم کیا جائے، یہی فیصلہ بالآخر تحریکِ استشراق کی شکل میں

سامنے آیا، اس سلسلہ میں لارڈ ایلنی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے کہ "فوجی اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں مگر یورپی لوگ دین اسلام اور اس کی تہذیب کے بارہ میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے ان میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے۔"

ایک فرانسیسی (Pierremartino) اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "جب عیسائی ترکوں کے خلاف جنگ ہار گئے تو وہ ہرزہ سرائیاں کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے عیسائیت کی شکست کا بدلہ میدانِ ادب میں لے لیا" چنانچہ تحریکِ استشراق کی صورت میں اہل یورپ اور ارباب کلیسا کی تمنائیں پوری ہوئیں اور اس طرح تحریکِ استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظم حملہ واقعۃً عسکری محاذ پر ان کے صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا، مختصر یہ کہ اسلام دشمنی کی جو چنگاریاں پہلے سے دبی ہوئی تھیں وہ لَو لینے لگیں اور رفتہ رفتہ ان کی آتش عداوت دامن مشرق کو جلانے لگیں۔

۴۔ مستشرقین من حیث المجموع چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، اپنی اصل ونسل کے اعتبار سے بہر حال یہودی، عیسائی اور مشرک ہی رہے ہیں، گویا اختلاف دین و مذہب کی بنا پر ان کے جذبات وخیالات تو پہلے سے ہی مذہبی بغض و عداوت (Religious hostility) کے آئینہ دار تھے، اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے حقیقی مآخذ سے دور، صدیوں جہالت و بے خبری اور عدم واقفیت کا شکار رہے، اس کا واضح نتیجہ ایک طرف تو یہ سامنے آیا کہ اسلام اور داعی اعظمؐ کے بارے میں کم وبیش انیسویں صدی کے اواخر تک دانستہ یا نادانستہ طور پر وہ جو کچھ لکھتے رہے اور پھیلاتے رہے، وہ صریحاً ظن وتخمین اور وہم وگمان کی پیداوار تھا، چنانچہ بے سروپا روایات، من گھڑت حکایات، فسانہ وفسوں، لچر قصے، کہانیاں اور اسی طرح کا بلاتحقیق خام مواد مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی نفرت انگیز تصویر پیش کرنے کے لیے بڑی دلیری کے ساتھ صدیوں استعمال کرتے رہے (جس کا کچھ اندازہ پچھلے تاریخی جائزہ میں بھی سامنے آچکا ہے اور کچھ جھلکیاں

آئندہ فصل میں سامنے آئیں گی) پھر دوسری طرف جب جہالت و بے خبری کا پردہ چاک ہوا اور مستشرقین اسلامی مآخذ کی تحقیق و تفتیش میں منہمک ہوئے، تب بھی انہوں نے دانستہ طور پر قرآن و احادیث سے کھیلنے میں کوئی تکلف نہیں کیا، نیز مشرقی مصادر کی ترتیب و تبویب کے سلسلہ میں تمام محنتوں کے باوجود فاش قسم کی غلطیاں کرتے رہے۔(سیرۃ النبیؐ از مولانا شبلیؒ، ج اول، ص ۱۱۰، ۱۱۱) بہر حال ان تمام باتوں کا مقصد ایک تھا، یعنی تشکک و تذبذب کے بیج بو کر اسلام اور سرور عالمؐ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا اور انہیں آمادہ بہ نفرت کرنا، اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں بقول ایک مصنف ''ایسے خیالات کو خاموشی کے ساتھ اسلام کے نظام فکر میں داخل کر دیں جس کا ادراک راسخ العقیدہ لوگوں کے سوا دوسرے نہ کر سکیں، انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ ان کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر ان کی ہر بات کو بلا چوں و چرا درست مان لیا جائے گا، چنانچہ علوم اسلامی کا ہر میدان انہوں نے اپنی جولانگاہ کے لیے منتخب کیا اور علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں انہوں نے خلط مبحث سے کام نہ لیا ہو۔''

۵۔ مسلمانوں کا زوال و انحطاط بحیثیت مجموعی تحریکِ استشراق کے فروغ کا باعث ہوا، ادھر عالم اسلام سیاسی انتشار کا شکار رہا، اندلس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا اور پھر سیاسی انحطاط، معاشرتی و اخلاقی زوال اور تہذیب و ثقافت کے تنزل کا باعث ہوا تو ادھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں، بلکہ اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لے کر تو اتنا غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا، پھر پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے انہیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا تو اقوام یورپ نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی، اس کا نتیجہ واضح تھا، مغربی تہذیب کا غلبہ ہوتا چلا گیا اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا تو مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی اور تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی اور اس طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ

اپنے ہتھیار تیز کر لیں، انہوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں، ان کے افکار و علوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کے مآخذ کو استعمال کر سکیں اور یوں اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔

۶۔ پندرہویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے پھر انگڑائی لی، اس کے عہد تاریک کا خاتمہ ہوا اور ان کے ہاں علم و تحقیق، بیداری، تہذیب و تمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا، یہ ان کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا اور انہیں ضرورت تھی کہ ایشیا اور افریقہ میں انہوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں انہیں مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے مادی وسائل اور اسلحہ سے زیادہ توجہ علمی و ذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے، چنانچہ استعمار مغرب کے تحفظ کے لیے بجائے خود تحریکِ استشراق کی سرگرمی ناگزیر تھی، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم و فنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یورپی حکمرانوں کی تحریکِ استشراق کی مکمل سرپرستی کی، یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہیں تھی بلکہ مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں جو ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے ضروری تھی۔

۷۔ مذہبی اور سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریکِ استشراق سے وابستہ تھے، اقوام یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتدا، تجارتی تعلقات سے ہی ہوئی تھی، پھر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہی تجار بالآخر سیاہ و سفید کے مالک اور حکمراں بن بیٹھے، تاہم منڈی والی تجارت میں وہ اب بھی منہمک تھے، استشراقی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کتابوں کی اشاعت و طباعت، مورخین کی کتابوں کی جلد فروخت اور مستشرقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ اہل یورپ کے تجارتی مفادات کے تحفظ و فروغ کا باعث بھی ہوا۔

اسباب و محرکات کا یہ مختصر سا تجزیہ تحریکِ استشراق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے مالہ و ماعلیہ کو جاننے کے لیے کافی ہے، اس لیے اب ہم آگے بڑھ کر ایک نظر ان

اعتراضات، الزامات اور مفتریات پر ڈالنا چاہتے ہیں جو مستشرقین کی طرف سے ہمارے ہادی برحق سید الانبیاو الرسلؐ کی شخصیت و کردار کو (نعوذ باللہ) مجروح کرنے کے لیے ان کی تحریروں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔

اعتراضات، الزامات، مفتریات و ہفوات: مستشرقین کی جانب سے اسلام کے لیے بالعموم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بالخصوص جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا، اس کا مختصر سا خاکہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے، اب جہاں تک سیرتِ رسولؐ کے حوالہ سے ان کے اعتراضات والزامات کا تعلق ہے اس مختصر مقالہ میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، یہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ اعتراضات والزامات کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ مستشرقین کی تحریروں میں ان کے پیدا کردہ لٹریچر میں اور ان کے خرافات کے ذخیرہ میں بکثرت صدیوں سے پائے جاتے ہیں، ان کے ہاں الزامات واعتراضات کی بہتات اس لیے بھی قابل فہم ہے کہ الزامات واعتراضات قائم کر کے (خواہ وہ کتنے ہی بے بنیاد کیوں نہ ہوں) سیرتِ رسولؐ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا مستشرقین کی حکمتِ عملی کا مستقل لازمی حصہ رہا ہے، کیونکہ اس جہت سے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ معصوم الذہن لوگ اور وہ افراد جن کا علم ومطالعہ راسخ نہیں ان کے پروپیگنڈے سے بآسانی منفعل ومتاثر ہو سکتے ہیں، حق تو یہ ہے کہ مستشرقین کے تمام اعتراضات والزامات کو مرتب کر کے ان کا مفصل جواب دیا جائے لیکن اس کی نہ فرصت ہے، نہ موقع، تاہم ذیل میں ہم مختصراً سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے مستشرقین کے اعتراضات والزامات بلکہ مفتریات کو نقل کر رہے ہیں تا کہ عام قارئین یہ اندازہ کر سکیں کہ سیرتِ نبویؐ کے باب میں مستشرقین نے کیا کیا گل کھلائے ہیں اور کیسے کیسے الزامات و اعتراضات عائد کیے ہیں، ان میں سے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جن کے بودے پن کو عام پڑھا لکھا مسلمان بھی محسوس کر سکتا ہے۔

نام، حسب و نسب: (۱) یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلامؐ کا نامِ نامی اسم گرامی ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں تھا بلکہ ماہومٹ (Mahomet) تھا، بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں کے ساتھ ''ماہونڈ'' (Mahound) یعنی بقول ان کے ''شہزادۂ تاریکی'' کا نام تجویز کیا اور بعض کے نزدیک ''بافومٹ'' (Baphomet) اور ''بافم'' (Bafum) تھا، (۲) نیچ ذات (Lowbirth) تھے (العیاذ باللہ) اس الزام کو خاص طور پر مارگولیتھ نے بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی کتاب ''محمد اینڈ دی رائز آف اسلام'' مطبوعہ لندن ص ۴۷ میں پیش کیا ہے، اس الزام کو نہ صرف یہ کہ دوسرے مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم میور نے (لائف آف محمدؐ ایڈنبرا ۱۹۲۳ء، ص CXIV/CXV) ہی مسترد کر دیا، بلکہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی شریف النسب تھے، عرب کے شریف ترین گھرانے کے فرزند تھے، آپؐ کے جد امجد ہاشم تھے جن کے ذمہ شہری مملکت ''مکہ'' میں افادہ کی ذمہ داری تھی اور وہ اس پائے کے آدمی تھے کہ رومی امرا اور غسانی شہزادے ان سے معاہدہ کیا کرتے تھے (ملاحظہ ہو: صدیقی مظہر الدین ص ۱۴۳)، (۳) محمد دراصل خود ایک مسیحی پادری (Cardiual) تھے، خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں، یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً رومی کلیسا سے تعلق منقطع کر لیا اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب ''اسلام'' ایجاد کر لیا اور اپنے آپ کو مخالف پوپ قرار دے لیا، (۴) دنیائے مسیحیت میں نئے فرقے کے بانی تھے، (۵) مخالف مسیح (Anti Christ) اور دشمن عیسائیت تھے، (۶) ترکوں کے پیغمبر تھے، (۷) بت پرست تھے (نعوذ باللہ)، (۸) خود اپنے آپ کو مرکز پرستش قرار دے لیا تھا، (۹) آپ بقول ایک مصنف عرب منافق و ناپاک تھے، (۱۰) جین بررڈ (Genebrard) کے نزدیک (خدانخواستہ) آپؐ حیوان (Beast) تھے اور صرف حیوانی زبان یعنی عربی جانتے تھے جو ان کے حیوانی ماحول کے لیے مناسب تھی، (۱۱) آپؐ (حاشا للہ) شہوت پرست (Lescirous) تھے، خود بھی ملوث تھے، اپنے پیروکاروں کو بھی ملوث کیا، (۱۲) دھوکہ باز، مکار، کاذب، جھوٹے،

خوفناک حد تک بے شرم تھے (استغفر اللہ)، (۱۳) وہ ایک ہنرمند، مکمل سیاست داں تھے۔

نبوت ورسالت: نبوت نتیجہ تھی ان کی طویل خود خیالی (Auto Sugestion) یا خود ایعاذی اور القائے نفس کا، (۱۵) وہ خواب بہت دیکھا کرتے تھے، وحی بھی بطور خواب دیکھا کرتے تھے، (۱۶) وہ بزعم خود اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا، بہر حال دوسروں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ان پر وحی اترتی ہے، محمدؐ نے ایک سفید دودھیا رنگ کے کبوتر یا فاختہ کو سدھار رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور وقفہ وقفہ سے چونچ مار مار کر ان کے کان میں سے دانے چگا کرتا تھا اور اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ فرشتۂ ربانی (جبرئیلؑ) ان پر وحی نازل کر رہا ہے اور انہیں املا کرا رہا ہے، (۱۷) انہیں (نعوذ باللہ) اعصابی مرض لاحق تھا اور وہ توہمات، فریب حسّی میں مبتلا تھے[1] (۱۸) نزول وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا[2] (۱۹) مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی ضرور تھے کیوں کہ وہ غیر متوازن اعصابی مزاج والے آدمی تھے[3] (۲۰) اعصابی دورے پڑتے تھے اور وہم ہو جاتا تھا کہ تابع الہام ہیں، یہ نولدیکی کے ذہن کا اختراع اور بوالعجبی ہے، (۲۱) اپنے الہامی اور الٰہیاتی مشن کے بارے میں خود مشکوک و متذبذب تھے، میور کے نزدیک ابتداءً انہیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ ہیں، البتہ ایک طویل عرصہ تک شک و تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر آمادہ بہ تبلیغ ہوئے، (میور، لائف آف محمد ۱۹۲۳ء، ص ۴۶-۴۷) یہ الزام سراسر واقعات کے خلاف ہے اور تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے، اگر ذرا بھی تذبذب ہوتا تو اپنی زوجۂ محترمہ خدیجہؓ کو، اپنے بھائی علیؓ کو، اپنے جگری دوست ابوبکرؓ کو کیوں کر مطمئن کرتے، (۲۲) مذہبیت اور الٰہیات کی

---

[1] حماد کے ص ۵۶۔ [2] ایضاً، عہد حاضر کا مستشرق واٹ اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الزام صریحاً بے بنیاد ہے، (محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ء، ص ۱۹) تفصیل کے لیے دیکھیے صدیقی مظہر الدین، ص ۱۴۴۔ [3] حماد کے ص ۴۳-۔

تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل تھا، (۲۳) ان کو بائبل کی تعلیمات کا علم تھا، (۲۴) نبوت کا تسلسل برقرار نہیں رہا، یہ منٹگمری واٹ کا مفروضہ ہے، اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ یہود مدینہ سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی ورسول کی حیثیت سے تسلیم کر لیں۔ (ملاحظہ ہو تفصیل جناب مظہر الدین صدیقی کا مضمون اسلامک اسٹڈیز اسلام آباد، جلد ۹ نمبر ۳)

(۲۵) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لغو خیال میں نبی کاذب تھے، (۲۶) وہ (نعوذ باللہ) مکار، دغاباز، مدعی کاذب تھے، (۲۷) شیطان کے آلۂ کار اور اس کے توہین آمیز جاسوس تھے، (۲۸) ترویج واشاعت مذہب کے لیے تشدد کا سہارا لیا (۲۹) اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا، (۳۰) حِطی (Hitti) کے خیال میں حضورؐ کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا اور لامنس کے نزدیک ان کی مکی زندگی کے حالات محض افسانہ (Fiction) ہیں، (۳۱) اصل استفادہ عیسائیت سے کیا، چنانچہ مسیحی نسطوری راہب بحیرہ سے خاص ملاقات رہی، (۳۲) مستشرقین کے نزدیک ایک مقبول عام وزنی الزام یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی مکہ تک پیغمبرانہ رہی لیکن مدینہ جا کر بادشاہی میں بدل گئی اور وہاں لشکر کشی، انتقام اور خونریزی کا بازار گرم کر دیا۔

کارہائے نبوت ورسالت، واقعاتِ سیرت: (۳۳) دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی اختیار کی (۳۴) میور لکھتا ہے ”کار نبوت کی ابتدا میں تو ایمانداری سے یہودی اور عیسائی طور طریقوں اور نظام کو اپنایا گیا اور اپنے مذہب کی انہیں بنیاد بنایا گیا لیکن جب مطلب حاصل ہو گیا اور اقتدار حاصل ہو گیا تو ان سے برأت ظاہر کی اور پھر انہیں بالکل مردود قرار دے دیا (۳۵) اسلام کو یہودیت سے بدلنے کی کوشش کی، واٹ لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جا کر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہب قدیم ”یہودیت“ سے بدل دیا جائے (۳۶) تحویل قبلہ (ایک خاص وقت کے بعد یہودیت و عیسائیت سے بیزاری کی

کوشش) ہے (۳۷) شاید اسلام یہودیت کا ایک حصہ یا فرقہ بن جائے (۳۸) محمدؐ نے اپنے آپ کو پرستش کی دعوت دی (۳۹) منشور مدینہ (Chorter of Medineh) میں حضورؐ کا مقام و مرتبہ غیر معین تھا (۴۰) حضورؐ کی ہجرت سے قریش مکہ بڑے خوش ہوئے، مارگولیتھ لکھتا ہے کہ "عین ممکن ہے کہ قریشی سردار (محمدؐ کی ہجرت کے بعد) آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہوں کہ وہ اپنے تکلیف دہ وطن سے بغیر کسی خون خرابے کے نجات پاگئے" (صدیقی مظہر الدین ص ۱۴۸ تا ۱۵۰) مارگولیتھ کی یہ خیال آفرینی بھی تاریخی واقعات کے بالکل خلاف اور لغو ہے (۴۱) محمدؐ نے قریش مکہ کو (بلا وجہ) اپنے خلاف بھڑکایا[۱] (۴۲) غزوات محض لوٹ مار کی مہمیں تھیں[۲] اور عربوں کی غربت و تنگ دستی دور کرنے کا ذریعہ (۴۳) بعض یورپی مصنفین کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ کا لایا ہوا انقلاب اور مذہبی اصلاحات اس لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہاں کا ماحول دراصل ان کے موافق اور مناسب تھا اور اہل عرب مذہبی، معاشرتی تبدیلی کے متلاشی اور پیاسے تھے (۴۴) جنگ موتہ، اس جنگ کا مقصد متعین کرنا مشکل ہے۔

متفرقات: (۴۵) ٹائن بی کے خیال میں آنحضرتؐ محض قیصر عرب تھے، ایک سیاسی لیڈر تھے (۴۶) جے، سی، آر چر کے نزدیک محمدؐ محض ایک صوفی اور مجذوب تھے (۴۷) آپؐ (نعوذ باللہ) رہزن، قزاقوں کے سردار (Robber Chif) تھے، (۴۸) اسلام ایک بدقسمت تاریخی حادثہ تھا اور محمدؐ مرگی میں مبتلا ہو کر مر گئے جو شدت بھوک کا نتیجہ تھا (۴۹) اسلام ایک

۱۔ یہ مستشرقین کا عام الزام ہے اور وہ اس بات کے شدت سے قائل ہیں کہ غزوات پاکیزہ جذبات، اعلیٰ و ارفع مقاصد اور شوقِ شہادت کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب و مفلوک الحال عربوں کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور لوٹ مار کے تحت مال و دولت کے جمع کرنے کا شوق تھا، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو (قریشی، پروفیسر ظفر علی، ماہنامہ اسلامک لٹریچر XIV شمارہ ۵، مئی ۱۹۶۸ء، ص ۷۷، ۸۷، نیز شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۸۷۔

۲۔ دیکھیے صدیقی مظہر الدین ص ۱۶۳، ۱۶۴۔

اشتراکی رجحان تھا اور محمدؐ صرف ایک معاشرتی سماجی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر (۵۰) وہ ایک موقع پرست اور مفاد پرست تھے (۵۱) کثرت ازدواج اور میل الی النساء[۱]، عورتوں کے دوست، سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن، بہت شادیاں کرنے والے[۲] (۵۲) آنحضرتؐ اور قرآن، تہذیب وتمدن، حریت وآزادی اور سچائی کے بدترین مخالف اور ضدی وسرکش دشمن تھے کہ ان جیسا دشمن صفحۂ ہستی پر نمودار نہیں ہوا[۳]، (۵۳) لونڈی، غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا[۴] (۵۴) داستان غرانیق، شیطانی آیات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک دفعہ حرم میں نماز ادا کی اور قرآن کی بھی تلاوت کی، اس وقت وہاں کفار بھی موجود تھے، جب آپؐ نے سورۂ نجم کی یہ آیت پڑھی "ومناۃ الثالثۃ الاخری" تو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوادیے "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترجی" (یعنی یہ بت معظم ومحترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے) اس شیطانی آیت کے بارے میں واقعہ کو مستشرقین بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں (تفصیلات کے لیے دیکھیے سیرۃ النبیؐ ج ا، ص ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸)، (۵۵) واقعۂ حضرت زیدؓ وزینبؓ، حضورؐ نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ حضرت زیدؓ بن حارثہ کا نکاح کر دیا تھا لیکن پھر تعلقات قائم نہ رہ سکے اور شکر رنجی بڑھ گئی، آخر کار حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رسمِ جاہلیت مٹانے کے لیے اور حضرت زینبؓ کی دلجوئی کے لیے خود نکاح کر لیا، حضرت زینبؓ کا انتقال ۲۰ھ میں ہوا، مستشرقین کے نزدیک یہ صریحاً بوالہوسی تھی (۵۶) ان کا آہنی تابوت خانۂ کعبہ میں دو ستونوں کے درمیان معلق رہا

۱۔ سیرۃ النبیؐ، ج ا، ص ۱۱۴۔ ۲۔ صدیقی مظہر الدین، ص ۱۶۲ (حضورؐ کی شادیوں اور تعدد ازدواج کے بارے میں ذاتِ رسالتؐ پر اعتراض مستشرقین کا محبوب ترین موضوع ہے جس کے ذریعہ وہ (نعوذ باللہ) آپؐ کی بدمستی اور بوالہوسی ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان میں انہیں کوئی خیر، پاکیزگی عفت اور حکمت نظر نہیں آتی۔ ۳۔ حماد کے (ص ۶۶)۔ ۴۔ شبلی، ج ا، ص ۱۱۴۔

(۵۷) ابتدا میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لیے تمام انبیائے بنی اسرائیل کو تسلیم کیا لیکن جب قوت و اقتدار مل گیا تو سب سے بڑے نبی خود بن بیٹھے اور سلسلۂ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا (۵۸) بانیٔ اسلام سے معجزات کی نسبت محض انبیائے ماسبق کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لیے قائم کی گئی (۵۹) ایک نیا اور جھوٹا مذہب جاری کیا حالانکہ یہ ان کا خود ساختہ تھا۔

اعترافات: اگرچہ گزشتہ فصل کی روشنی میں مستشرقین کا انتہائی بے باکانہ، گستاخانہ اور معاندانہ رویہ بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے، تاہم یہ ان کے مطالعۂ سیرت کا صرف ایک رخ ہے جو اول تا آخر کذب و افترا سے عبارت ہے، ایک دوسرا رخ وہ ہے جس میں مستشرقین کے بعض سرکردہ افراد اپنے تعصب و تظلم کا برملا اعتراف کرتے ہیں اور جب ذرا انصاف و اعتدال سے کام لیتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے منزہ، ہر الزام سے مبرا، خَلق و خُلق کی تمام خوبیوں سے مرصع دنیائے انسانیت کا حاصل تھی اور ان کی کامیابیوں، کامرانیوں اور کارناموں کی بنا پر ان کا کوئی مثیل نہیں ہے، اس موضوع پر اگرچہ دفتر کے دفتر نقل کیے جا سکتے ہیں لیکن ہم یہاں صرف چند نمونوں پر اکتفا کر رہے ہیں۔

۱۔ اثر انگیز شخصیت: ''جسٹینین کی وفات کے چار سال بعد ۵۶۹ء میں مکہ میں وہ آدمی پیدا ہوا جس نے انسانیت پر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اثر ڈالا۔'' (ڈریپر) (۱)

۲۔ ناقابل فراموش: ''اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج، ان تین باتوں کو انسانی تعقل و تفکر کا معیار بلند مانا جائے تو کون ہے جو تاریخ کی کسی قدیم یا جدید شخصیت کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل لانے کی ہمت کر سکے، لوگوں میں شہرت ہوئی کہ انہوں نے فوجیں بنا ڈالیں، قوانین وضع کر دکھائے اور سلطنتیں قائم کر ڈالیں لیکن غور طلب

---

(۱) اور ہاٹ کی کتاب : "The 100 A Ranking of the most heflucut, all persons in History. 1978. P. 33"

یہ ہے کہ انہوں نے حاصل کیا کیا؟ صرف مادی قوتوں کی جمع پونجی؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی، بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے جس نے یہی نہیں کہ فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کیے اور مملکتیں اور سلطنتیں قائم کیں، بلکہ اس کی نظر کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دیے جو اس وقت کی معلوم دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے قربان گاہوں کو، خداؤں کو، دین و مذہب کے پیروکاروں کو، خیالات و افکار کو، عقائد و نظریات کو بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا، پھر صرف ایک کتاب کی بنیاد پر جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا، ایک ایسی روحانی امت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا، وہ ہمارے سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابل فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے خدا سے محبت اور ہر معبود باطل سے نفرت۔"

(لا مارٹن "History deca Turqui" ج ۲، ص ۷۷-۲۷۶، پیرس ۱۸۵۴ء)

۳۔ جامعیت کبریٰ: "عالم الٰہیات، فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار، رسول (بانیٔ مذہب) امین و قانون ساز (شارع) سپہ سالار، فاتح اصول و نظریات، معقول عقائد کو جلا بخشنے والے، بلا تصویر مذہب کے مبلغ، بیسیوں علاقائی سلطنتوں کے معمار، دینی و روحانی حکومت کے مؤسس، یہ ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جن کے سامنے پوری انسانیت کی عظمتیں ہیچ ہیں) اور انسانی عظمت کے ہر پیمانے کو سامنے رکھ کر ہم پوچھ سکتے ہیں، ہے کوئی جو ان سے زیادہ بڑا، ان سے بڑھ کر عظیم ہو؟" (لا مارٹن ایضاً)

۴۔ بے مثال کارنامہ: "کسی انسان نے اتنے قلیل ترین وسائل کے ساتھ اتنا جلیل ترین کارنامہ انجام نہیں دیا جو انسانی ہمت و طاقت سے اس قدر ماوراء تھا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی فکر کے ہر دائرے اور اپنے عمل کے ہر نقشہ میں جس بڑے منصوبہ کو روبہ عمل لائے، اس کی صورت گری بجز ان کے کسی کی مرہونِ منت نہ تھی اور مٹھی بھر صحرائیوں کے سوا ان کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا اور آخر کار ایک اتنے بڑے مگر دیرپا انقلاب کو برپا کر دیا

جو اس دنیا میں کسی انسان سے ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ اپنے ظہور سے لے کر اگلی دو صدیوں سے بھی کم عرصہ میں اسلام، فکر و عقیدہ اور طاقت و اسلحہ دونوں اعتبار سے سارے عرب پر اور پھر ایک اللہ کا پرچم بلند کرتے ہوئے فارس، خراسان، ماوراء النہر، مغربی ہند، شام، مصر، حبشہ، شمالی افریقہ کے تمام معلوم علاقوں پر، بحر متوسط کے جزیروں پر اور اندلس کے ایک حصہ پر بھی چھا گیا۔" (لامارٹن ایضاً)

۵۔ تاریخ کی پوری روشنی میں: "یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیات مسیحؑ کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں لیکن ان تیس برسوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو انہوں نے (نبوت سے پہلے) گزارے، جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور آئندہ مزید انکشافات متوقع ہیں، تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے کتنی قریب ہے کتنی دور! کتنی ممکن ہے اور کتنی ناممکن! ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے، ہم ان کی ماں کے بارے میں، ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان کے ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے میں اور اس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسند نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے، یا وحی پا کر یک دم خدائی مشن کے حامل بن گئے؟ بہرحال کتنے ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں سے اکثر ذہنوں سے ٹکراتے ہیں، مگر وہ بس سوالات ہیں جواب کے بغیر! البتہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ میں صورت یکسر مختلف ہے، یہاں ہمارے پاس اندھیروں کے بجائے تاریخ کی روشنی ہے، ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جانتے ہیں جتنا کہ لوتھر اور ملٹن کے بارے میں، یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس، تخمین و ظن ماورائے فطرت روایات اور فسانہ و افسوں سے آلودہ ہونے کے بجائے حقائق سے آراستہ ہے اور ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل و فریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو، یہاں ہر چیز صداقت کی روشنی میں جگمگا رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت کے

بہت سے پرت ہیں اور ان میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے، تاہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے متعلق ہم ہر چیز جانتے ہیں، ان کی جوانی، ان کی اٹھان، ان کے تعلقات، ان کی عادتیں، ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحہ، ذہنی سفر اور ارتقا وغیرہ، نیز ان کی داخلی اور باطنی زندگی کے متعلق بھی اور یہ کہ جب اعلان نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں جو اپنی ابتدا، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز و منفرد ہے اور اب تک ایسی کوئی معقول و مستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے۔"

(باسورتھ اسمتھ محمد اینڈ محمد نزم سندھ ساگر اکاڈمی، لاہور، ص ۱۲،۱۱)

۶۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب: بہر حال مختصراً عرب کے یہ معاشرتی اور مذہبی حالات تھے، جن میں اگر ہمیں والٹیر کی زبان کے استعمال کی اجازت دی جائے، عرب کا رخ بدل گیا، انقلاب آ گیا، انقلاب بھی کیسا؟ ایسا انقلاب کہ آج تک کسی سرزمین پر نہیں آیا: مکمل ترین، اچانک ترین اور سرتاسر غیر معمولی انقلاب۔ (باسورتھ اسمتھ ایضاً ص ۷۲)

۷۔ منفرد مقام: "تاریخ مذاہب وادیان میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے، وہ نہ ولی تھے، نہ فرشتہ اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کر کے دکھایا اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی اور ان کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی جو عام حالات میں ان کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز و ممیّز کر سکے۔"

(بوڈلے دی میسج ۱۹۴۶ء، ص ۳۳۸)

۸۔ سب سے بڑا انسان: "دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت، ایک نئی تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمدؐ بن عبداللہ قریشی،

عرب اور اسلام کا پیغمبر! اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیے۔" (مولانا سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء ج ۴، ص ۴۰۰) نیز بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک مسیحی عالم (داور مجاعص) نے یہ تبصرہ لکھا تھا۔

۹۔ عظیم و مخلص: "عظیم، محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک روحانی پیشوا تھے، انہوں نے ایک عظیم ملت کو جنم دیا اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی، بلکہ ان سب سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا، مزید برآں اس لیے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص و وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص تھے اور اپنے اللہ سے بھی مخلص و وفادار تھے، ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک کامل، سچا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔"

(لیونارڈ اسلام ہر مورل اینڈ اسپری ٹیویل ویلو لندن، ۱۹۲۷ء ص ۲۱، ۲۰)

۱۰۔ مقام و مرتبہ: "محمد (ﷺ) ایک رسول تھے نہ کہ صوفی، یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ کوئی کہہ کر بھی شرمندہ ہو جائے، وہ لوگ جو ان کے گرد جمع ہوئے اور جو ملت اسلامیہ کے اولین ارکان تھے، وہ قانون کی اطاعت پر، توحید الٰہی پر راضی تھے اور محمد (ﷺ) کی تعلیمات اور ان کے اسوہ کی پیروی پر اکتفا کرنے والے تھے، وہ مطمئن تھے کہ وہ ایک سیدھے سادھے اور مضبوط دین کے پیرو ہیں جو مختصر عبادات اور چند مراسم پر مشتمل تھا۔"

(گاڈفرے ڈی ممبائز مسلم انسٹیٹیوشن، لندن ۱۹۵۰ء ص ۲۰)

"محمد (ﷺ) نے از خود کبھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک موقع پر تو ایسی وحی نازل ہوئی جس میں انہیں تنبیہ کی گئی کہ انہوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے

میں ایک فقیر سے منہ کیوں موڑا؟ پھر انہوں نے اس وحی کو شائع بھی کیا، یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک مدعی کاذب (Imposter) تھے، جیسا کہ معصوم مسیحی اس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔" (لیکھر محمد نزم، لاہور ۱۸۹۳ء، ص ۴)

"محمد (ﷺ) نے اپنا جو مذہبی نظام قائم فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے ہم مشربوں کے فہم وادراک کے مطابق تھا اور اس ملک میں پائے جانے والے رسوم ورواج اور ان کے ساتھیوں کے جذبات سے ہم آہنگ تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ عام انسانی حالات ونظریات سے بھی ایسی مناسبت وہم آہنگی رکھتا تھا کہ جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی نصف سے زائد آبادی نے اسے قبول کیا اور یہ سب کچھ چالیس سال سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا۔"

(کاونٹ ڈی بولین ولنیر (La viede Mohamet) مسٹر ڈم ۱۷۳۱ء، ص ۴۴-۱۴۳)

۱۱۔ روشنی: "پس وہ روشنی آ گئی، عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لیے ایک ایسی تاریکی میں جو موت کی نقیب تھی، چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی، زندگی اور آسمانوں کا جاہ وجلال لیے ہوئے، اس نے اسے "وحی" کہا اور لانے والے فرشتہ کو جبرئیل اور ہم ابھی تک سوچ رہے ہیں کہ اسے کیا نام دیں؟ یہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے اشارہ ہے، ہمارے سمجھنے کے لیے کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی کوشش دراصل ایک روحانی عمل ہے جس کے بارے میں ہر منطق اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے، بقول نوالی، ایک خدا پر اعتقاد کا اعلان، کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد (ﷺ) کا وجود کامل، جسم وروح، اسی حقیقت اور سچائی کے نور سے مستنیر تھا۔" (کارلائل دی ہیروایز اے پرافٹ)

۱۲۔ نور ہی نور: عرب قوم کو یہی نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا، عرب کو اسی کے ذریعے پہلے پہل زندگی ملی، بھیڑوں بکریوں کے چرانے والے لوگ جو ازل سے صحراؤں میں بے کھٹکے، بے روک ٹوک گھومتے پھرتے تھے کہ ایک "ہیرو پیغمبر" ان کی طرف بھیجا گیا،

ایک پیغام کے ساتھ جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابل اعتنا نہ تھے، دنیا بھر کے لیے قابل ذکر بن گئے۔" (کارلائل)

۱۳۔ عظیم فاتح: فتح مکہ کے اس موقع پر یہ بات ان کے حق میں جائے گی اور وہ قابلِ تعریف ٹھہریں گے کہ اس وقت جب کہ اہل مکہ کے ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انہیں جتنا بھی طیش آتا، کم تھا اور ان کے آتشِ انتقام کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا، مگر انہوں نے اپنے لشکر و سپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے سے روکا اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی و عبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکرانہ بجالائے، صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے جنہیں پہلے سے ہی ان کے وحشیانہ رویہ کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور ان میں سے بھی صرف چار کو قتل کیا گیا لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال و حرکات کے مقابلہ میں اسے بہر حال انتہا درجہ کی شرافت و انسانیت سے تعبیر کیا جائے گا، (مثال کے طور پر صلیبیوں کے مظالم، کہ ۱۰۹۹ء میں فتحِ یروشلم کے موقع پر انہوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا، یا وہ انگریز فوج جس نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے ۱۸۷۴ء میں افریقہ کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذر آتش کر ڈالا) محمد (ﷺ) کی فتح درحقیقت دین کی فتح تھی، سیاست کی فتح تھی، انہوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پس پشت ڈالا اور کر و فر شاہی کے ہر نشان کو مسترد کر دیا اور جب قریش کے مغرور و متکبر سرداران کے سامنے سرنگوں ہو کے آئے تو محمد (ﷺ) نے ان سے پوچھا کہ "تمہیں مجھ سے کیا توقع ہے؟" "رحم! اے سخی و فیاض برادر، رحم! وہ بولے" "جاؤ تم سب آزاد ہو" انہوں نے فرمایا" (ارتھر گلمین دی سراسینز لندن ۱۸۸۷ء، ص ۸۵-۱۸۴)

۱۴۔ صاحبِ خلقِ عظیم: "اخلاق و عادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے، البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت محتاط تھے، ان کا کھانا، پینا، ان کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولی درجہ کا تھا اور ہمیشہ وہی رہا، جب کہ وہ اپنی طاقت و حکومت کی معراج تک پہنچے، انہیں تخیل و

تصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں، ان کا ذہن رسا تھا اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیا، عفت مآب اور شرمیلے تھے، اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اڑایا جائے، ان کے خادم انس کہتے ہیں کہ میں دس سال تک ان کی خدمت میں رہا لیکن انہوں نے کبھی اف تک نہ کہا، انہیں بچوں سے بہت محبت تھی، وہ انہیں راستے میں روک لیتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، انہوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا، اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو، جب ان سے کسی کے بارے میں بددعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے "میں بددعا کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں" وہ بیماروں کی عیادت کرتے، کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے، غلام کی دعوت کو بھی قبول کر لیتے، اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے، بکریوں کا دودھ دوہ لیتے اور دوسروں کا ہمہ تن انتظار کر لیتے، وہ اپنی ازواج کے ساتھ ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے تھے، وہ آگ خود جلا لیتے، فرش پر جھاڑو دے لیتے، تھوڑا بہت کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے، ان کے گھر کے باہر ایک چبوترہ (صفہ) تھا جہاں ایسے متعدد غریب افراد موجود رہتے جن کی گزر بسر کا تمام تر انحصار ان ہی کی فیاضی پر منحصر تھا۔"

(لین پول دی اسپیچ اینڈ ٹیبل ٹاک آف دی پرافٹ محمدؐ، لندن ۱۸۸۲ء، ص ۲۹-۲۷)

۱۵۔ سنجیدگی، اخلاص، وفاداری: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کارلائل کے خطبات کے بعد سے مغرب کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں، اپنے ایمان وعقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا، ان پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق وکردار اور ان کی طرف امام وپیشوا کی

حیثیت سے دیکھنا، پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں یہ سب دلیل ہیں ان کے اخلاص کامل کی، اس لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک مدعی کاذب (Imposter) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں، مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر کم سراہا گیا ہو جتنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو، اس لیے اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں اور مقصد سے ان کے خلوص اور وابستگی کے قائل ہو جائیں، اگر ہم ان غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ میں ان کے خلوص اور دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا، جب تک کہ کوئی الزام ان کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہو جائے۔" (واٹ محمدؐ ایٹ مکہ، آکسفورڈ، ۱۹۵۳ء، ص ۵۲)

"یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض و مفاد پرستی سے کلیۃً خالی تھی، مزید یہ کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اپنی نگاہوں کے سامنے دین کے مکمل قیام و استحکام اور لامحدود اختیارات حاصل ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ذات اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا، بلکہ آخر وقت تک اس سادہ طرز و انداز کو برقرار رکھا جو اول دن سے ان کے بود و باش سے نمایاں تھا" (ڈیون پورٹ اپالوجی فار محمدؐ اینڈ دی قرآن، لندن ۱۸۶۹ء نیز لاہور ایڈیشن، ص ۳۴-۱۳۳)

۱۶۔ مشن کی سچائی: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلا شک وشبہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا، وہ اس پر مطمئن تھے کہ اللہ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملک کی تعمیر و اصلاح کی ہے، ان کا اپنا مشن نہ تو بے بنیاد تھا اور نہ فریب دہی، جھوٹ و افترا پر مبنی تھا، بلکہ اپنے مشن کی تعلیم و تبلیغ کرنے میں نہ کسی لالچ یا دھمکی کا اثر قبول کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کے راہ کی رکاوٹیں بن سکیں، وہ سچائی کی تبلیغ مسلسل کرتے رہے۔ (ڈیون پورٹ ایضاً)

۱۷۔ سچے رسولؐ: جہالت! جس کا مظاہرہ اکثر و بیشتر مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، افسوسناک امر ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت کی اقوام میں ایک خدا پر یقین رکھتے تھے اور دوسرے خداؤں کی نفی کرتے تھے، انہوں نے بہ تاکید راست بازی اور دین داری کو کردار کا سرچشمہ قرار دیا اور بدرجۂ فرض متعدد نمازوں کی، حیّ و قیوم خدا کے لیے ادائیگی، تمام انسانوں کی عزت و احترام اور سب کے ساتھ رحم و شفقت برتنے پر زور دیا، ہر قسم کی نشہ آور چیزوں سے پرہیز، ہر معاملہ میں عدل و توازن اور ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین ان کے دین و مذہب کا حصہ تھی، للہذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نفس روحانی کے مالک اور ایک سچے رسول تھے، مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور سرچشمۂ روحانی سے ان پر وحی اترتی تھی۔''

(لنڈ سے مضمون، مطبوعہ ٹو ورلڈ، مانچسٹر ۱۰/۱۱ اگست ۱۹۴۰ء)

۱۸۔ امتحانِ سخت سے گزرے: ''ان سے پہلے کوئی پیغمبر اتنے سخت امتحان سے نہ گزرا تھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیونکہ منصبِ نبوت پر سرفراز ہوتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو انہیں سب سے زیادہ جانتے تھے اور جو ان کی بشری کمزوریوں سے بھی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے تھے لیکن دوسرے پیغمبروں کا معاملہ برعکس رہا، کہ وہ سب جگہ، سب کے نزدیک معزز و محترم ٹھہرے، الّا یہ کہ جو انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔'' (گبن زوال سلطنت رومہ ص ۱۰۸)

۱۹۔ آسمانوں کی بادشاہت زمین پر: ''اسلام کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، مزاج و انتشار کو، رقابت و عداوت کو نکال پھینکا، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سود خواری، شراب خوری، قتل و غارت گری، دختر کشی کی رسوماتِ قبیحہ کا استیصال کیا اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات و توہمات اور مادیت و اشیا پرستی سے نجات دلائی، پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اس

بادشاہت کو انہوں نے عملاً اس زمین پر قائم کر دیا جس کی بشارت بڑے ذوق وشوق سے جناب مسیح نے دی تھی۔" (گبن ایضاً ص ۶۹، ۷۰)

۲۰۔ ہمہ گیر اصلاح: "ممکن ہے یہ سوچا جائے کہ وہ آدمی جس نے اتنی بہت سی اور تا دیر قائم رہنے والی اصلاحات کیں، انواع واقسام کی بت پرستی کے بدلے جس میں لوگ مدتوں سے مبتلا تھے، ایک خدا کی عبادت کا داعی بنا جس نے دختر کشی کی رسمِ قبیح کو مٹایا، شراب اور دوسری نشہ آور اشیا کو حرام ٹھہرایا، جوئے کی ممانعت کی، نسبتاً ایک دائرہ میں رہتے ہوئے تعدد ازدواج کو محدود کیا، وغیرہ وغیرہ، کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کا خدائی مشن اس کے ذہن کی محض اختراع تھی؟ اور کیا وہ جھوٹ کو جانتے بوجھتے نبھاتا رہا؟ نہیں، ہرگز نہیں! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو درحقیقت سچے مذہبی ادراکات اور روحانی احساسات حاصل تھے جن کے سبب انہوں نے اپنے مشن کو انتہائی مستقل مزاجی، پامردی واستقلال سے آگے بڑھایا اور نہ اس کے جھٹلائے جانے کی پرواہ کی، نہ اس کی راہ میں مصائب و مشکلات کی، یہ سچائی، یہ حق کی معرفت انہیں ابتدا سے انتہا تک حاصل رہی، یعنی حضرت خدیجہؓ کے سامنے پہلی وحی کے نزول سے لے کر حضرت عائشہؓ کی بانہوں میں آخری سانس لینے تک۔" (ڈیون پورٹ)

۲۱۔ عظمتوں کے نشان: "حالات، مواقع اور وقت سب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دیا اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی زندگی میں کامیابیوں کی اور ان کے بعد اسلام کی توسیع وترقی کی راہ ہموار کی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں صفات وکمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا، اس کی تین جہتیں تھیں، ایک نبوت کا فیضان، دوسرے سیاست وحکمرانی میں ان کی بصیرت اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مہارت و حذاقت اور تمام مناصب پر اہل ترین افراد کا انتخاب، جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے وہ اسی حد تک ان کی کامیابیوں اور

کامرانیوں پر حیران وششدر رہ جاتا ہے، حالات نے انہیں کس درجہ سازگاری عطا کی، اس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذ ونادر حاصل ہوتے ہیں بالکل وقت کی آواز بن کر، ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انہیں اگر حاصل نہ ہوتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انہیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا اگر وہ اس یقین محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ انسانیت کا ایک اہم اور قابل ذکر باب رقم ہونے سے رہ جاتا۔"

(واٹ محمدؐ پرافٹ اینڈ اسٹیٹسں مین، آکسفورڈ پریس ۱۹۶۱ء، ص ۳۷-۲۳۶)

۲۲۔صدق وصفا: "یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صدق کی دلیلِ قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ ان پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ان کے اسرار ورموز سے پوری طرح واقف تھے اور اگر انہیں ان کی صداقت میں ذرہ برابر بھی شبہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔" (ایچ، جی، ویلز بحوالہ زکریا ہاشم زکریا، ص ۲۷۰)

۲۳۔اتمام وکمال: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپؐ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی ومذہبی دارالسلطنت مقرر تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپؐ نے منتشر قبائل کو ایک قوم بنادیا تھا، آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا تھا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔"

(مارگولیتھ بحوالہ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جلد چہارم، از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۳۹۹)

☆☆☆

(۲)

مستشرقین کی زیر نظر فہرست دو حصوں میں منقسم ہے، حصہ اول میں اکثر و بیشتر وہ مستشرقین ہیں جنہوں نے سیرت رسولؐ پر مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے یا جو مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے مشہور و معروف ہیں اور جن کا مکمل حوالہ بھی مل گیا ہے، دوسرے حصہ میں وہ مستشرقین شامل ہیں جن کی سیرت پر اگرچہ مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن ان کے مضامین، مقالات اور کتابوں میں سیرت کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن کا پورا حوالہ بھی دستیاب نہیں ہوا، دونوں حصوں میں ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے زمانی تقدم و تاخر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

اس فہرست کی تیاری میں اگرچہ ان تمام کتابوں سے مدد لی گئی ہے جن کا حوالہ وقتاً فوقتاً تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے، تاہم بطور خاص تین کتابوں سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے، یعنی (۱) العقیقی، نجیب، المستشرقون (۲) الزرکلی، خیر الدین، الاعلام (۳) حماد کے، محمدؐ دی پرافٹ، اے سلیکٹیڈ ببلیو گرافی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وقت اور وسائل کی کمیابی کے سبب یہ ممکن نہ تھا کہ مستشرقین کے ناموں کے تلفظ اور ہجے، وطن، ملک اور زبان کی رعایت سے تحقیق کر کے لکھے جاتے، اس سلسلہ میں عام انگریزی مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے، تاہم یہ توقع ہے کہ تحقیق مزید کے ضمن میں یہ سرسری فہرست انشاء اللہ نقطۂ آغاز ثابت ہوگی اور دوسرے کام کرنے والوں کے لیے مدد و معاون ہوگی۔

وما توفیقی الا باللہ ......

فہرست مستشرقین حصہ اول

۱۔ آدم	Adams, Issac.	Mohammad and Mohammednism. (Chicago1900)

۲ ۔ ایڈیسن	Addison,Lencelat.	The life and Death of Muhammad, the author of the Turkish religion (London 1619
۳ ۔ ایڈلر	Addler,Felix.H.	Moyammad (Philladelphia 1901)
۴ ۔ اہرن	Ahren, Karl	Mohammad al Religious Stifter. (Leipzig 1935)
۵ ۔ ایٹن	Aiton, John	The land of the Messiah, Mahomet and the Pope (London 1854)
۶ ۔ آرنلڈ	Arnold.T.W.	The Preaching of Islam (London 1896)
۷ ۔ آرنلڈ	Arnold J.M.	Islam, its History, Character and relation to Christianity (London. 1874)
۸ ۔ اروِنگ	Irving,Washington.	Life of Mahomet (Newyork 1911)
۹ ۔ اوکلے	Oekley Simon	History of the Saracens (London 1874)
۱۰ ۔ اوکس گان	Oksegon,L.de	Confutacion del Alooany Secta Mahometsna(Granada 1555)
۱۱ ۔ اتیج مین	Eigeman Jakob	Mohammadmde Profet der Arabieren, (Amesterdom 1898)
۱۲ ۔ اوسز	Oel Isne C.E.	Des effets de tareligion de Mohamed
۱۳ ۔ اوسم	Osbom R.D.	Islam under the Arabs (Lnodon 1876)

۱۴۔ اوزرن	Osztern S.	Vizlat Muhamad Kuranjanak ethikaja-biz (Bujapest 1902)
۱۵۔ اسٹیب	Stubb, H.	An Account of the Rise and Progress of Mahometanism (Lnodon 1911)
۱۶۔ افام	Upham, Edward	History of the ottomon Empire Preeaded by the life of Muhammd. (Hurst 1826- 35)
۱۷۔ ارثبنوٹ	Arabuthnot,F.F.	(i) تاریخ العرب وآدابہم (لندن ۱۸۹۰) (ii) ترجمہ روضۃ الصفائی حیاۃ محمد المصطفیٰ (لندن ۱۸۹۳ء) معادۃ ریاستک
۱۸۔ اسپرنگر	Sprenger, A.	Life of Mohammad (Allahabd 1851) Das lesa und die. Lehredes Mohammad (1851-1861)
۱۹۔ اسمتھ	Smith,Bosworth.	Muhammad and Muhammadenism London 1874 (Reprint-Lahore)
۲۰۔ تخیلات	Bachelat,thoedore.	Mahomet at les Arabes.(Rome 1878)
۲۱۔ بیکن	Becon.a.s.	Mohammad and Islam a comparision with orthodox christianity, (Newyork, x 1911)
۲۲۔ بیکن ڈارف	Beckendrof,H.C	*Mohammd and de Seinen.(Leipzig* 1907)

۲۳ ۔ بارٹن	Barton,theodor	Talks on Mohammed and his followers (London 1933)
۲۴ ۔ بائیل	Bayle.Pierre	The dictionary historical and critical of Mr.Peter Bayle (Ed) (London 1734-1735)
۲۵ ۔ بیڈویل	Bedwell.W.	Mohammed is imposturae. (London 1615)
۲۶ ۔ برن فیلڈ	Bernfeld,Simon.	Muhammad, his Biography and the begning of the Religion of Islam (Warsaw 1914)
۲۷ ۔ انی بیسنٹ	Besant annie	The life and Teaching of Muhammed. (Adyar 1932)
۲۸ ۔ بلاخر	Blachor,Begis.	Le Problems de Mahomet. (Paris-1952)
۲۹ ۔ بلام	Blom,P.	Mohammad of Koranen(Hamar.1904)
۳۰ ۔ بلائٹ	Blytt, Eva.	Muhammad Islam Stroe Profet, Kristiannica 1911
۳۱ ۔ بووین	Bowen,George	Life of Mohammed(Bambey 1851)
۳۲ ۔ برانڈے	Brandes.C.E.S	Muhammed Skuespiel. The akter. Ohenbava 1895)
۳۳ ۔ بوڈلے	Bodley.R.V.C.	The Messenger the life of Mohammad. (London 1946)

۳۴ ۔ بولین ویلیرز	BoulainViiliers	(i) Historiues Arabes, Aved lavie de Mahomet (Amesterdom 1731) (ii) Vie de Mahomet (1730)
۳۵ ۔ بری گگنی	Brequigny,H.D	Veber Muhmemed (Frankfnrt 1791)
۳۶ ۔ بریم	Briem,G.E.	Budha, Muhammed, Jesus (London 1938)
۳۷ ۔ بروکلمان	Brockelmann.C	History of the Islamic People (New-york 1974) English Tr.
۳۸ ۔ بروکس	Brooks,Archibaid	Islam: A short Study
۳۹ ۔ براؤن	Brown D.A.	The way of the Prophet An introdu-ction to Islam (London 1962)
۴۰ ۔ براؤن	Brown.G.L.	The Era of Mahomet (London 1856)
۴۱ ۔ بکل	Buckly.Henery	The Begger or the Soldier Gautama or Mahomet (London 1903)
۴۲ ۔ بوہل	Buhl.F.P.W.	Des leban Muhameds (Leipzig 1930)
۴۳ ۔ براؤز	Burrows,Miller	Founders of Great Religion Being personal sketches of Fomous leaders (Newyork 1931)
۴۴ ۔ بش	Bush,George	The Life of Mohammad Founder of the Religion of Islam and the Empire of the Saracens. (Newyork 1830)

۴۵۔ باسے	Bassetmrene	قصیدۃ البردۃ، بوصیری مع سیرت مصنف، نقد و شرح ۱۸۹۴ء
۴۶۔ برٹن	Burten	Pilgrimage to Mecca and Medina (1856)
۴۷۔ پونی	Ponet, Rudi	Mohammad and der Koran (Stuttzart 1951)
۴۸۔ پائنی	Payne,P.S.R.	The Holy Sword of the Story of Islam from Muhammad to the Present (London 1961)
۴۹۔ پیڈیو	Pedio,Sau Paswal	Contra los parts listau Mahometanos (Rome 1905-06)
۵۰۔ پروخش	Pruckscn,otto	Uber die Bluc traehe deideu Vornla-misschen Arubern Und Mahomeds (Leipzig 1899)
۵۱۔ ٹیلر	Taylor,Vil	History of Mohametanism and its sects. (London 1834)
۵۲۔ ٹنسڈال	Tinsdall.W.St.C	Sances of the Quren (London 1905)
۵۳۔ ٹاؤن سینڈ	Townsend,Med.W	Muhammad the Great Arabian (Houston 1912)
۵۴۔ ٹائن بی	Toynbee,A.J.	A study of History (London 1954-51)
۵۵۔ ٹرمپے	Trampe.E.Von	Muhammed (Leipzig 1907)

۵۶۔ ٹروٹر	Troter,H.J.	Studeis in Biography (London 1865)
۵۷۔ ٹرپن	Turpin,F.R.	Histrie de la vie de Mahomet Lagi- sltive de i Arabie (Paris 1776)
۵۸۔ جبرئیلی	Gabrieli, Franc- essco	Muhammad an tne Conquests of Islam (Newyork 1968)
۵۹۔ جیگنیر	Gagner	Vie de Mahomet(Amesterdarm 1748)
۶۰۔ جینوے	Genevay	Mohammed (Paris 1838)
۶۱۔ جیورگن	Georgen,E.P.	Mohammed ein Cheracerbild (Berlin 1878)
۶۲۔ جیفرے	Jaffery,Arthur	Islam Mohammad and his Religion (Newyork 1958)
۶۳۔ جانسٹن	Johnston, P- Lacy de	Muhammad and his power (Newyork 1901)
۶۴۔ جونگ	Jong,P.de	سیرت ابن ہشام مع متن وترجمہ لاطینی، لیڈن ۱۸۸۱ء، بمعاونتہ ڈی خویہ
۶۵۔ جیورغیو	Chaorghiu,C.V.	La vie de Mohamet (Paris 1962)
۶۶۔ چگاوٹ	Chagavat,Michel.s	Mahomet less Khalifes (Paris 1912)
۶۷۔ درمنگھم	Dermanghsm.E.	La vie de Mahomet (Peris 1929)
۶۸۔ دوکات	Ducati,Brumo	Mohomet (1931)
۶۹۔ ڈالے	Dale,Codetrey	Maishaya Muhammad(London 1909)
۷۰۔ ڈبلے	Dibble,R.F.	Mohammad (Newyork 1926)

۷۱ ۔ ڈیون پورٹ	Davenport.John.	Apology for Mohammed and the Quran. (London 1879). Reprint Lahor-1975
۷۲ ۔ ڈوریر	Du Ryer,Andre	The Alcoran of Mahomet (London 1649)
۷۳ ۔ ڈریکاٹ	Dray cott,G.M	Mohomet, Founder of Islam (London 1915)
۷۴ ۔ ڈوکاسے	Ducasse Ray-mond	Mahomet daus Son Lemps (Geneval 1908)
۷۵ ۔ ڈیورجرس	Desvergers N.	Vie de Mohammed (Paris 1873)
۷۶ ۔ ڈوزی	Dozy R.P.A.	Spanish Islam (1863) Het Islami Sime (Kruseman 1863)
۷۷ ۔ ریلے	Raleigh.Sir,W.	The Life and Death of Mahomet (London 1637)
۷۸ ۔ رام پوڈی	Ram Poldi	Vita di Manometto (Milano 1922)
۷۹ ۔ ریکینڈر	Reckender, H.	Mohamad und die Seuinen (Leipzig 1907)
۸۰ ۔ ریلینڈ	Reelandh	Reflections on Mohamedanism and the conduct of Mohamad (London 1712)
۸۱ ۔ ریم	Rehm,H.S.	Mohamed and die welt des Islam (Leipzig 1755)

۸۲۔ رینو	Reinand,J.T.	Notice Sur Mahomet (Paris 1860)
۸۳۔ ریلان	Realnd, H.	De religione Mohamedica libra due (Utruht 1704)
۸۴۔ رینان	Ranan,Ernest	Mahomet et ler origines de L.Islam-ism (Paris 1880)
۸۵۔ رنک	Rink,F.Th	Islam et son Prophet(Lausaune 1870)
۸۶۔ ریولین	Rivlin,Jcsef.J	Hayyey Muhammad (Mizz) 1932
۸۷۔ روڈنسن	Rodinson, M	(i) Islam Mahomet et les brigines de L. Islam (Paris 1957) (ii) Mahomet. (Paris 1961)
۸۸۔ روبک	Roebuck,J.A.	Life of Mahomet. (London 1833)
۸۹۔ رومرو	Romro,Jacob	Mohomed (Newyork 1907)
۹۰۔ زکریا	Zakirias,Heuna	Voici le Vraj Mohamed it la Faul X Coran (Paris 1960)
۹۱۔ سیکو	Sacco,G.	Le Cedenze religiose de Maomettd. (Rome 1922)
۹۲۔ سیل	Sale,George	The Koran or Al-coran of Mohammed. (London 1734)
۹۳۔ سوارے	Sawary Clau-de.E	morale de mahomet (Paris 1784)
۹۴۔ سیل	Sell,por	The life of muhamed (London 1913)
۹۵۔ سوان	Swan Borg	Ono Successn Davidiros Hymsnas Unitatosis muhamad.(Upsalise.1886)

۹۶ ۔ سونڈرز	Saunders,J.J.	A History of medieval Islam (London 1965)
۹۷ ۔ شروڈر	Schrocders,J.J	Muhammad testics veritatis Contrasoipsum (Leipzig 1718)
۹۸ ۔ طورا ینڈرے	Tor Andrae	Muhammad: The man and his faith (Tr.) London 1956
۹۹ ۔ فیورٹ	Favrot,Alexis	Mahomet: Da Science Chezles Arabs (Paris 1866)
۱۰۰ ۔ فارسٹر	Forster Charles	Mahometnism Unveiled(London1829)
۱۰۱ ۔ فرائڈ	Fried,Dezro	Mohammad a Regebbi Zeridosag megitelaseben (Bedapest 1934)
۱۰۲ ۔ فوربنگ	Forbing,J.C.	Mohamad, muuzer und Bockold (Hamover 1788)
۱۰۳ ۔ کیتانی	Caetani,Leone	(i) Annalidell's Islam (Hepoli 1905-26) (ii) Maomette Proheta d. Arabia Islam 1910
۱۰۴ ۔ کارلائل	Carlyle,Thomas	The Hero as Prophet Mahomet (Newyork 1902)
۱۰۵ ۔ کاستری	Casiries Henri-delac	Comte dp.L. Islam Impressions et etudes (Paris 1912)

۱۰۶۔ کلیمن	Clemens,J.F.G	**Leban Muhammed des Stifters der Mu-hammadnism Religion(Himberg 1814)**
۱۰۷۔ کلاڈیس	Claudius,AH.	Muhmeds Religiou aus dem Koren (Atonal 1908)
۱۰۸۔ کورینالڈی	Corinaldi,Gino	Maometto egli Ebrie (Milans 1925)
۱۰۹۔ کریمی	Karimi,R.W	Anacdotes of Hazrat Mohammed (London 1939)
۱۱۰۔ کاسٹ مین	Kastman cari	Muhammed Haus Lefnad beratted (Stockholm 1908)
۱۱۱۔ کوئیل	Koelle,S.W.	Mohamed and Mohamedenism (London 1889)
۱۱۲۔ کروپن	Kroppen.P	Mohamed der Prophet (Himberg 1851)
۱۱۳۔ کاسن ڈی پرسیوال	Caussin de Pe-rceval,A.P.	Essai Sur I Histoire des Arabes (1847)
۱۱۴۔ الکندی عبدالمسیح بن اسحٰق	Al-Kindi	Risalah-Ed. Tien (London 1880) The Apology of al-Kindi (London 1887) by Muir
۱۱۵۔ گارساں دی تاسی	Garcin de Tussy	Le Doctrine et les Deviors de la Religion Musulmane (Paris 1826)
۱۱۶۔ گاڈفرے ڈی ممبائن	Caudefroy de-Mombynes	Mahomet (Paris 1957)

Mohamedanism Historical Survey (London 1953)	Gibb,H.A.R.	۱۱۷۔ گب
Life of Mahomet (Newyork 1879)	Gibbon,Edward	۱۱۸۔ گبن
Mohamed and Islam (Tr) Yale 1917	Goldziher,Ignac	۱۱۹۔ گولڈزیہر
The Saraceus (London 1887)	Gilman,Arthur	۱۲۰۔ گلیمن
Mahomet et Son Denure(Paris 1897)	Gold,I.L	۱۲۱۔ گولڈ
The Life of Mahomet, founder of the Religion of Islam and the Empire of the Saraseus (London 1840)	Green Samuel	۱۲۲۔ گرین
Mohammad, Des Leban Nachden Qeullen (Minister 1892-95)	Hubert,Grimme	۱۲۳۔ گریم
Muhammad (London 1983)	Lings,Martin	۱۲۴۔ لنگز
Vide de Mahomet d' apres la tradition (1897-98)	Lamairesse,E.D.G	۱۲۵۔ لیمیریسی
(i) Mahomet in les Crand Bommes-De orient (Paris 1889) (ii) Histore de la Turquie (Paris 1854)	Lomartine,A.M	۱۲۶۔ لامارٹن
Muhammadnism (Working 1889) Repring Lahore 1893	Leitner,G.W	۱۲۷۔ لیٹنر
Vie de Mahomet (Paris 1939)	Lerouge, R.	۱۲۸۔ لیروگ
Moise, Jesus et Mahomet on less	Levy, Simon	۱۲۹۔ لیوی

		Trios Grands (Paris 1887)
۱۳۰ ۔ لیو چی فی	Lew,Che,Fi	The Arabian Prophet: a life of Mohammad from Chinese and Arabic Sources (Shanghai 1921)
۱۳۱ ۔ لینارڈ	Leonard,Arthur,G.	Islam, Her moral and Spiritual Value (London 1927)
۱۳۲ ۔ لین پول	Lane-Pool, Stainley	The Speeches and Table Talk of the Prophet Moammad (London 1882)
۱۳۳ ۔ لامنس	Lammens,P.H	اخلاص محمدؐ (۱۹۱۱ء)، فاطمہ وبنات محمدؐ (روم ۱۹۱۲ء) عہد الاسلام (روم ۱۹۱۴ء)
۱۳۴ ۔ میڈن	Madan, A.C.	Muhammsi, mans Hayake Pannoje na habariza Wasliuin na matu ruki (London 1888) Eng Tr.London 1896)
۱۳۵ ۔ مگنامی	Magnami,L.	(i) Allahe il su Prefeta Psrnis (Estre 1922) **(ii) Mahomet ne imposter (London1923)**
۱۳۶ ۔ مینفریدی	Manfredi Vit	La Vita di Maometto (Milano 1888)
۱۳۷ ۔ مارگولیتھ	Margoliuith,D,S.	Mohammad and the rise of Islam (Newyork 1905)
۱۳۸ ۔ مراکی	Maracci,Loiws	Mehumeti-Wita rerurrque gestarm Synopsis (Roma 1691)

۱۳۹ ۔ مارٹن	Martin,M.J.	Historia del falsay perver so Profeta Mahoma (Madrid 1781)
۱۴۰ ۔ مینازیس	Menezes,J.L.	The life and the religion ofMohammad the Prophet of Abarbia (London 1921)
۱۴۱ ۔ مسارا	Messara,Pina	Maomettoeil peradise (Milano 1946)
۱۴۲ ۔ مل	Mills,Charles	An History of Muhamedenism (London 1817)
۱۴۳ ۔ مل مین	Milman,H.H.	Memories of the life of Mahomet (London 1727)
۱۴۴ ۔ مونٹیرو	Monters Yvidalg	Mahoma, Su Vida (Madrid 1727)
۱۴۵ ۔ موسس	Mosts the Lawagiver	False divinities: On Moses christ and Mahomet and othe religious deceptives (London 1870)
۱۴۶ ۔ مور	Moore,G.F.	History of Religis: Judaism Christianty, Mohamedanis (Newyork 1929)
۱۴۷ ۔ میور	Muir,Sir,William	The life of Mahomat pom original Sourca (London 1977)
۱۴۸ ۔ موزے	Muzzay,D.S	Spiritual heroes, a study of the world's Prophets (Newyork 1955)
۱۴۹ ۔ ناتھن	Nathene,C.A.	Vite de Maometto. (Rome 1946)

۱۵۰ ۔ نکلسن	Nicholson,R.A	A Literary History of the Arabs (Newyork 1907)
۱۵۱ ۔ نولدیکے	Noldke theodar	Das Heben muhamed's nach der Quellen Popular darqistett.(Hemover 1863)
۱۵۲ ۔ نارتھ	North,C.R	An outline of Islam (London 1934)
۱۵۳ ۔ واٹ	Watt,W.M.	(i) muhammad at mecca (1953) (ii) Muhammad at Madina (1956) (iii) Muhammad Prophet and Statesman (London 1961)
۱۵۴ ۔ ویل	Well,Gustav	mohammad de Prophet Seinleban and Scine Lehre (Stuttgart 1843)
۱۵۵ ۔ ویلجس	Wellejus,H.	Fra missionen Blanat muhammedaners (Denmark 1909)
۱۵۶ ۔ والسٹن	Wollaston,Sir, A. N.	Half Hours with muhammad: Being a Popular Account of the Prophet of Arabia and of His more immediate followers together with a short Synopsis of the relegion he founded. (London)
۱۵۷ ۔ ویاز	Wueaz Friechich	Muhamed und sein werk (Stuttgurt 1923)

۱۵۸ ۔ وسٹنفلڈ	Westenfeld,F	(تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات، اراضی مدینہ منورہ، تاریخ اشراف مکہ وغیرہ)
۱۵۹ ۔ ویٹیر	Vattier,pierre	L Histore mahometane (Paris 1657)
۱۶۰ ۔ ویلارڈ	Vieillard,Pane	(i) Mohammad, messenger d' Allah (Philip 1657) (ii) Mohammed (A Bengali Account of the life of muhammed) (Calcutta 1892)
۱۶۱ ۔ والش	Wallich,J.U.	Religio Turcico, mahometisvita (Suecorum 1659)
۱۶۲ ۔ ہوس	Hoas,Hans	Das Bild Muhameds in Wandel der Zeiten (Berlin 1916)
۱۶۳ ۔ ہٹالا	Hatala,Peter	Mohamad elete estan a (Budapest 1878)
۱۶۴ ۔ ہیڈلے	Headley Row-land.G	The Three Great Prophets of the World. (Woking 1923)
۱۶۵ ۔ ہگنز	Higgins,God-fray	An Apology for the life and chara-cter of the celebrated Prophet of Arabia, Called Mohammad or the illustrious (London 1829)

۱۶۶۔ ہلارڈ	Hillard, Frede-rick.H.	History of Mahomet the Great imposture (Falkink 1821)
۱۶۷۔ ہوویل	Hoevell,W.R.V	Mohammed (Bataria 1939)
۱۶۸۔ ہولباش	Hollach,Panl,H	Moisesgesus, Mahamet (Valencia 1903)
۱۶۹۔ ہولما	Holma Harri	Mahomet, Prophete des Arabes (Paris 1946)
۱۷۰۔ ہالینڈ	Holland,Edith	The Story of Mohamed (London 1914)
۱۷۱۔ ہرگرونج	Hur Gronj,C.S	Muhamed in Selected works (ed) (Leiden 1957)

فہرست مستشرقین "حصہ دوم"

۱۷۲۔ اتین مارک (Etieunne Marc Quatreimere)

۱۷۳۔ اڈمنڈ کاسل (Edumund Castell)

۱۷۴۔ اڈولف وارمنڈ (Adolf Wahrmund)

۱۷۵۔ البرتوس شولتز (Albertus Schultens)

۱۷۶۔ الفرڈ اکتاف بل (Alfred octave Bel)

۱۷۷۔ امیلو لافونتے الکنترا (Emilo Lafouentey Alcomtara)

۱۷۸۔ ارپی نیوس (Erpenuis)

۱۷۹۔ ایڈلر (Adler J.G.)

۱۸۰۔ اسٹینلے ڈین (Stanley Dean)

۱۸۱ ۔ الفسٹن	(Elphistone)
۱۸۲ ۔ امبریکوآف منز	(Embrico of Mainz)
۱۸۳ ۔ اسمتھ	(Smith. W.C.)
۱۸۴ ۔ اوٹو	(Otto, Richard)
۱۸۵ ۔ الیگزینڈر روس	(Allexander Ross)
۱۸۶ ۔ الیس	Alles, T.W
۱۸۷ ۔ الکوک	Alcocke, Nathan
۱۸۸ ۔ اموس	Amos Psend
۱۸۹ ۔ اجودی سامتالہ	Ugodi Samatalla
۱۹۰ ۔ ایڈورڈ جے جرجی	Edward, J. Jurji
۱۹۱ ۔ احرٹ	Ehrharth, Jacob
۱۹۲ ۔ الورٹ	Ahlwardt, Wilheln
۱۹۳ ۔ امبرڈس	Imberdis, Victor
۱۹۴ ۔ اشپرہر	Sperher, Jakob
۱۹۵ ۔ اسپائن	Spien, Bernard
۱۹۶ ۔ اسپائرو	Spiro, gean
۱۹۷ ۔ اڈیلرآف باث	Adelard of Bath
۱۹۸ ۔ براؤن	Brown, E.G.
۱۹۹ ۔ بیریزین	Beresine, N.
۲۰۰ ۔ بارتھولڈ	Barthold,V.V.
۲۰۱ ۔ برخارٹ	Burchardt, L.

۲۰۲ ۔ بی وائز		Beawais Vincentde
۲۰۳ ۔ بیجر		Badger,G .P.
۲۰۴ ۔ بارو		Barrau,J. J.
۲۰۵ ۔ بارٹول		Bartol
۲۰۶ ۔ باڈیر		Baudier, Maichel
۲۰۷ ۔ بازن		Bazin, Lowis
۲۰۸ ۔ بنسن		Benson, A.C.
۲۰۹ ۔ بتمان		Bethman, W.C.
۲۱۰ ۔ بیون		Bevan, a. a.
۲۱۱ ۔ بھلیانڈر		Bihliander, theoder
۲۱۲ ۔ بلم		Blum, Erner Alfred
۲۱۳ ۔ بوساشیو		Boccacio, Giorami
۲۱۴ ۔ بولیتھو		Bolitho, William
۲۱۵ ۔ بیکر		Becker, C. H.
۲۱۶ ۔ برلفالٹ		briffault, Rs.
۲۱۷ ۔ بنگ		beyng, E. J.
۲۱۸ ۔ بارکر		barker E.
۲۱۹ ۔ برنارڈ لوئیس		Blewis, b.
۲۲۰ ۔ بیل		bell, R
۲۲۱ ۔ پوکاک		Pococke E.
۲۲۲ ۔ پوسٹل	قواعد اللغۃ العربیۃ ۱۵۳۸ء	Postel, G.
۲۲۳ ۔ پیرون	ترجمہ الطب النبوی از جلال الدین ابی سلیمان داؤد ۱۸۶۰ء	Perrona, A.

۲۲۴ ۔ پکتھال Pickthel M.W. (ترجمۃ القرآن، الثقافۃ الاسلامیۃ)

۲ ۔ پامر Palmer E. H.

۲۲۶ ۔ پالگریو Aarbia 1867 Palgrave

۲۲۷ ۔ پرائس (Price) History of Mohammadens (London 1812)

۲۲۸ ۔ پیٹر Peter the Venerable

۲۲۹ ۔ تھیوفین Theophanes Saint

۲۳۰ ۔ تھامس برٹران Thomas bertran

۲۳۱ ۔ تھامر Thompsor, J.W.

۲۳۲ ۔ تھامسن Thomson, William

۲۳۳ ۔ ٹیٹس Titus, M. T.

۲۳۴ ۔ ٹوری Tory, Fawford, H.

۲۳۵ ۔ ٹرٹین Tritton, a. s.

۲۳۶ ۔ ٹرولش Troltsch, charltorule F. K.

۲۳۷ ۔ تشودی Tochudi, R.

۲۳۸ ۔ تھیوڈور فیلم جان Thoedore Wilhelun Gean

۲۳۹ ۔ جرترو مارگریٹ (انگریز مستشرقہ) juynboll

۲۴۰ ۔ جوتلف برک Gertrude Margaret Lorothian bell

۲۴۱ ۔ جارج جیکب Gotlhelf bergstrasser

۲۴۲ ۔ جویدی Jacob, George

Jgnazio Gudi

۲۴۳ ۔ جلازر	Edward Glaser
۲۴۴ ۔ جان ارثو کی	Gean arthorki
۲۴۵ ۔ جبرئیل فیران	Gabriel Ferrand
۲۴۶ ۔ جبرئیل لیوان	Gablricel Leveng
۲۴۷ ۔ جربردی اورلیاک	Gesbert de oraliac
۲۴۸ ۔ جیر	Geer, b. j
۲۴۹ ۔ جرازبری	jarazbhry, a. q. a.
۲۵۰ ۔ جیکل	(Jackel, R,)
۲۵۱ ۔ جیمز ڈی روڈا	(Juinez de Roda, R)
۲۵۲ ۔ جان	(John, V.)
۲۵۳ ۔ جونز	(Jones, David)
۲۵۴ ۔ جونگ	(Jong P, De)
۲۵۵ ۔ جانسن	(Johnson, E. N.)
۲۵۶ ۔ جان کینٹیو	(John contineau)
۲۵۷ ۔ جونز	(Sir William Jons)
۲۵۸ ۔ جان آف دمشق	John of Damasens)
۲۵۹ ۔ جانسٹن	(Johnston)
۲۶۰ ۔ جان لڈگیٹ	(John lydgate)
۲۶۱ ۔ جین بررڈ	(Gene berard)
۲۶۲ ۔ چازکو	Chadzko A. B.)
۲۶۳ ۔ حتی	(Hitti, P. K.)

۲۶۴ ۔ درنبرگ	(Derenbourg, H.)
۲۶۵ ۔ دینی	(Etienne Duiret)
۲۶۶ ۔ دی ساسی	(Antoine Isac Sihestre de Sacy)
۲۶۷ ۔ دورن	(Bernhardt Dorn)
۲۶۸ ۔ دانتے	(Dante)
۲۶۹ ۔ دی خویہ	Goeje. M. J. de
۲۷۰ ۔ ڈی کوئل	(Decuil)
۲۷۱ ۔ ڈلبرگ	(Dalberg. F.V.)
۲۷۲ ۔ ڈالاپورٹ	(Dalaporte, p. h.)
۲۷۳ ۔ ڈائس	(Dias, Eduardo)
۲۷۴ ۔ ڈیل	Diehal, charles
۲۷۵ ۔ ڈابس	Dobs, Narcus
۲۷۶ ۔ ڈی لنگر	Declinger, J. J. I. V.
۲۷۷ ۔ ڈوگارگ	Dugarric, F.
۲۷۸ ۔ ڈن	Dunn
۲۷۹ ۔ ڈیلاویڈالیوی	Della Vida, G. Levi
۲۸۰ ۔ ڈیفریمرے	Chades Francors Defremery
۲۸۱ ۔ رینکے	Ranke, Leopold, Von
۲۸۲ ۔ راتی جی	Rattigea, W. H.
۲۸۳ ۔ ریناخ	Reinach, Salneon
۲۸۴ ۔ رسک	Reiske, G. K.

۲۸۵ ۔ ریوش	Reusch, R.
۲۸۶ ۔ رائمنڈ	Reymond, J.
۲۸۷ ۔ رٹر	Ritter, H.
۲۸۸ ۔ روپر	Ruper, C.L.
۲۸۹ ۔ راجر بیکن	Roger Bacon
۲۹۰ ۔ راڈویل	Rodwell, J.M.
۲۹۱ ۔ ریکنڈوف	Reckendorf
۲۹۲ ۔ روزنتھال	Rosenthal. E.I.J.
۲۹۳ ۔ روزنتھال	Rosenthcl, F.
۲۹۴ ۔ رونزیوال	Sabastien Ronzevalle
۲۹۵ ۔ روزن	Victor Romamoiche Rosen
۲۹۶ ۔ رازموسن	Lassen Rasmussen
۲۹۷ ۔ زمبرینی	Žam Brini, F.
۲۹۸ ۔ زویمر	Zwemer, S. M.
۲۹۹ ۔ زخاؤ	Sachau. E.
۳۰۰ ۔ زیٹرسٹین	Zettersteen, K.V.
۳۰۱ ۔ ساسمنٹو	Sasmients Mantin
۳۰۲ ۔ سرسانو	Sarsano, M.Y.S.
۳۰۳ ۔ سرویر	Servier, Andic
۳۰۴ ۔ سائن	Sinc, W.
۳۰۵ ۔ سائمن	Simion, Gottefried

۳۰۶ ۔ سلیرو	Solero, Silvio
۳۰۷ ۔ سارڈل	Sourdel, D.
۳۰۸ ۔ سودے	Southey. R.
۳۰۹ ۔ سائیکس	Sykes, Sir Percy
۳۱۰ ۔ سائبرگ	Syburg, F.
۳۱۱ ۔ سیورے	Savery
۳۱۲ ۔ سینٹ ہلیر	Barthelonyst Hailaire
۳۱۳ ۔ سان پیڈروپیسکال	San Pedeo Persenal
۳۱۴ ۔ سدیوجان جاک	Sedillot, JJ.
۳۱۵ ۔ سلیم نوفل	
۳۱۶ ۔ شن	Schuon, F. J.
۳۱۷ ۔ شول	Scholl, Addf
۳۱۸ ۔ شروڈر	Schroeder, E.
۳۱۹ ۔ شوون	Victor Chamvin
۳۲۰ ۔ شولتز	Henrik Alber Schnltens
۳۲۱ ۔ شاخت	Schacht, T.
۳۲۲ ۔ شولتز	Schnltens, J. J.
۳۲۳ ۔ شوفاجیہ	Geen Saunvaget
۳۲۴ ۔ شیخاس	Francis Goseph Steingan
۳۲۵ ۔ طنطاوی، الشیخ محمد عیاد	
۳۲۶ ۔ غریفینی	Engenio Griffini

۳۲۷ ۔ فلکے	Falke, Robest
۳۲۸ ۔ فنگر	Finger. Charler
۳۲۹ ۔ فنلے	Finlay, G.
۳۳۰ ۔ فشر	Fisher, A. M.
۳۳۱ ۔ فلیگل	Flugel, G. L.
۳۳۲ ۔ فوئیٹن	Foutane Marivo, E.
۳۳۳ ۔ فوسٹر	Foster, H. F.
۳۳۴ ۔ فری مین	Freeman, E.A.
۳۳۵ ۔ فک	Fuck, J.
۳۳٦ ۔ فان کریمر	Alfred Von Kremer
۳۳۷ ۔ فلایشر	Fleiseher H. L.
۳۳۸ ۔ فرڈینٹڈ	Augerst Ferdinand Mehren
۳۳۹ ۔ فیل	Gotthold wail
۳۴۰ ۔ قسطنطین الافریقی	Constantinus African
۳۴۱ ۔ کانتو	Cantu, Ceoase
۳۴۲ ۔ کارا	Carra de von, B.
۳۴۳ ۔ کیش	Cash.W.W.
۳۴۴ ۔ کیو	Cawe, Sydney
۳۴۵ ۔ کلارک	Clarke, James, F.
۳۴٦ ۔ کلینارڈس	Clenardus, N.
۳۴۷ ۔ کریگ	Cragg, Kemath.

۳۴۸۔ کیوریو	Curio. C.A.
۳۴۹۔ کیبل	Kaibel. F.V.
۳۵۰۔ کلرہال	Kellerhal, E.
۳۵۱۔ کلین	Klein, F.A.P.
۳۵۲۔ کرے ہل	Krchl, C.L.E.
۳۵۳۔ کارلائل	carlyl H.H. Macartney
۳۵۴۔ کیورٹین	William curreton
۳۵۵۔ کوزے گارٹن	J. G. L. Kosegarton
۳۵۶۔ کونڈے	conde
۳۵۷۔ کوڈیرا	Eraucescus condera Zaydin
۳۵۸۔ کروگر	Kruger
۳۵۹۔ کلودکاہن	cohen, cl
۳۶۰۔ کولن جارج	colin, G.S.
۳۶۱۔ کاظم مرزا بک	
۳۶۲۔ کریمسکی	Krymsky, A.F.
۳۶۳۔ کراتشوفسکی	Kratch Kovsky, I.J.
۳۶۴۔ کلورلے	Calverley E. E.
۳۶۵۔ کلسٹینو	clestino Scheaparelli
۳۶۶۔ گیر	Gear, Josegah
۳۶۷۔ گارڈے	Cardet, L.
۳۶۸۔ گولڈسیک	Goldsack, William

۳۶۹ ۔ گڈرچ	Goodrich, c.a.
۳۷۰ ۔ گیبرٹس	Guibertus
۳۷۱ ۔ گیدی	Gnidi, M.
۳۷۲ ۔ گیام	Gui llanome, Alpend
۳۷۳ ۔ گوئٹے	Gocthe
۳۷۴ ۔ گرینیام	Grun cbaume, G.E.V.
۳۷۵ ۔ لسڈن	Leusden gohan
۳۷۶ ۔ لابیوم	La Beaneme, J.
۳۷۷ ۔ لفیٹے	Laffitte, Piesse
۳۷۸ ۔ لنٹ	Lunt, theodore
۳۷۹ ۔ لائتھ	Lyth, Hemricus
۳۸۰ ۔ لیبان	Lebon Dr.G.
۳۸۱ ۔ لیفی پروفنسال	(Levi Provencal, E.)
۳۸۲ ۔ لارنس	Lawrence, T.E.
۳۸۳ ۔ لین	(Edward william lane)
۳۸۴ ۔ لینڈبرگ	Carlo Landberg
۳۸۵ ۔ لیس	williorm nassan lees
۳۸۶ ۔ میکڈونلڈ	Macdonald, D.E.
۳۸۷ ۔ ماس	Mass'e Henri
۳۸۸ ۔ مازاس	Mazas, Alexende
۳۸۹ ۔ مورلے	Willianr Hook Morley

۳۹۰۔ میسنگ	(J. Petrns M. Mevsing)
۳۹۱۔ مل مین	milman
۳۹۲۔ مورس	Maurice, F.D.
۳۹۳۔ میلبو گنار	Melbo Gummar
۳۹۴۔ مرکاڈیر	Mercadier, G.
۳۹۵۔ مارکیل	Markel, G.H.G.
۳۹۶۔ میار	Mayer, Edward
۳۹۷۔ میر	Mayer, J.J.
۳۹۸۔ میرس	Meyerns, P.
۳۹۹۔ میمیر	Meymier, E.
۴۰۰۔ میرو	Mierow, C.C.
۴۰۱۔ میور	Muirgohn
۴۰۲۔ موزرے	Mouzaray, F. de
۴۰۳۔ مویر	Moyer, E.S.
۴۰۴۔ منرو	Munro, D.C.
۴۰۵۔ مینارڈ	Meynard Barbierde
۴۰۶۔ مونٹے	Montet, Ed
۴۰۷۔ میشو	Michaux
	Bellaise, E.
۴۰۸۔ ملر	Augents Muller
۴۰۹۔ متوخ	Eugen Mittwoch

۴۱۰۔ مرکس ملر	Marcus gosopn Muller
۴۱۱۔ ناتھر	Nather, E.S
۴۱۲۔ نوفال	Nanphal, I.
۴۱۳۔ نیل	Neale,W.H.
۴۱۴۔ نیلسن	Neilson, J.B.
۴۱۵۔ نی مین	Niemanu, A.K.
۴۱۶۔ نللینو	Nallino Carlo Alfousa
۴۱۷۔ نبیہ عبود	Abbot, N
۴۱۸۔ نسطاس بازنطینی	Nicetas of Byzantni
۴۱۹۔ والٹیر	Voltair, F. M.
۴۲۰۔ وارف	Wayriffe, V.
۴۲۱۔ ولہاوزن	Welihausen
۴۲۲۔ ویلز	Wellw, H.G.
۴۲۳۔ ویلزوفر	welzhofer, H.
۴۲۴۔ ونیسنک	Wensinck, A. J.
۴۲۵۔ ولیم	William Monier
۴۲۶۔ وڈس	Woods, Mathew
۴۲۷۔ وہائٹ	White goseph Planco
۴۲۸۔ ویبرن	Wybarne, goreph
۴۲۹۔ ولیم مارسہ	marcais W.
۴۳۰۔ ولیم رائٹ	Wright, W.

۴۳۱۔ وپکے	Frantz woepcke
۴۳۲۔ ویٹسٹین	goham, G. Wetzstien
۴۳۳۔ ہانجر	Hottenger J. H.
۴۳۴۔ ہالان	Hallan
۴۳۵۔ ہیکس پین	Hackspam
۴۳۶۔ ہال	Hall, m.p.
۴۳۷۔ ہارٹ مین	Hartman, m.
۴۳۸۔ ہیمر	Haumer, P.J.
۴۳۹۔ ہوری	Hanri, goh
۴۴۰۔ ہارٹ	Haurt, C.L.
۴۴۱۔ ہیوٹ	Havet, Erset
۴۴۲۔ ہاکنس	Hawkins, A.F.H.
۴۴۳۔ ہربیلوٹ	Herbelold
۴۴۴۔ ہیل	Hell, goseph
۴۴۵۔ ہربل	Herbel of de molainville
۴۴۶۔ ہالفن	Halphen, L.
۴۴۷۔ ہرمیلن	Hermalin, D.
۴۴۸۔ ہجین	Hagden, Rannlk.
۴۴۹۔ ہنڈاس	Hondas, O.V.
۴۵۰۔ ہبز	Hubrer, F.
۴۵۱۔ ہیوز	Huzhes, J.P.

۴۵۲ ۔ ہیوز	Huzhes, Willin
۴۵۳ ۔ ہاروے	New Comb Harvey
۴۵۴ ۔ ہمفرے	Prideau humphrey
۴۵۵ ۔ یوپی نیوس	Eupeuins Thomas
۴۵۶ ۔ یولوجیس قرطبی	Enlociuu Cordovem
۴۵۷ ۔ یوجین یونگ	Eugenc yomg

☆☆☆

حضرت ابراہیمؑ اور مستشرقین

از

جناب مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم (سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند)

”کلام پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر جس طرح آیا ہے، اس پر بعض مستشرقین نے اپنے خیالات کا اظہار کر کے آپؑ کی ذاتِ مقدس سے متعلق شک وشبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس پر مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے اپنی مشہور کتاب قصص القرآن جلد ا، ص ۱۵۶ تا ۱۶۷ میں بڑی اچھی بحث کی ہے۔“ (ص ع)

مستشرقین یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں ید طولیٰ رکھتی ہے اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآن عزیز کے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے، ایک موقع پر حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (۱) نے ونسنک کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دین حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی، البتہ عرصۂ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر

---

(۱) جلد ا، ص ۲۷-۲۸۔

آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا، اس لیے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعویٰ کو سنوک ہیکر ویدیہ نے بڑے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب ورنگ سے رنگین بنایا، اس نے کہا:

''قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں، ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ ان کو اول مسلمین بتایا گیا ہے، بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، ان کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو ان کو مؤسسِ کعبہ، اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر و ہادی اور ملت حنفی کا داعی ظاہر کرتی ہو، سورۃ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب مکی سورتیں ہیں، ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں، اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمین عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے تھے اور انہی کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے، للہذا اس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی انہوں نے اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچ کر انہوں نے یہود کو اپنے

مشن ''اسلام'' کی دعوت دی تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہ آپؐ کے دشمن ہو گئے، اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودت طبع نے رہنمائی کی اور انہوں نے عرب کے لیے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیت ابراہیمی کہنا چاہیے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملت حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیلؑ کے والد، کعبہ کے مؤسس نظر آتے ہیں۔'' (Het Mehheansop Feest ص ۴۰)

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور ونسینک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب سے محض اس لیے اختراع کیے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور نیز یہ کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی لیکن جب ایک مؤرخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض و عناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اس لیے کہ اس سلسلہ کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سر تا سر غلط بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ علمی بد دیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف انہی کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں حضرت ابراہیمؑ کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیمؑ کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لیے ان کے نام ہی سے معنون کر کے نازل کی گئی ہے، یعنی سورۂ ابراہیم، اس کو نظر انداز کر دیا گیا

تاکہ قرآن عزیز سے براہ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے اور کورانہ تقلید میں وہ ان کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے:

ا۔ حضرت ابراہیمؑ عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امن عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ○ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (سورہ ابراہیم ۱۴: ۳۵، ۳۶)

اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ، اے پروردگار! بلاشبہ ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے، پس بلاشبہ تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور انہوں نے ہی اس کو بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں بیتِ محرم (کعبہ) کے مؤسس ہیں:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ

اے ہمارے پروردگار! بے شک میں نے اپنی بعض ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں ترے گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے،

تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ○ (ابراہیم ۱۴:۳۷)

اے ہمارے پروردگار! یہ اس لیے تا کہ وہ نماز قائم کریں، پس تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ وہ اس کعبہ کی بدولت ان کی جانب مائل ہوں اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کرتا کہ شکر گزار بنیں۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ و حضرت اسحٰقؑ کے والد ہیں اور یہی اسمٰعیلؑ اہل عرب کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ملتِ حنیفی کے شعار ''صلوٰۃ'' کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ○ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ○ رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ○

(ابراہیم ۱۴:۳۹-۴۱)

سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ بخشے، بلاشبہ میرا پروردگار ضرور دعا کا سننے والا ہے، اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے، اے ہمارے پروردگار، ہماری دعا سن، اے ہمارے پروردگار تو مجھ کو اور میرے والدین کو اور کل مومنوں کو قیام حساب (قیامت) کے روز بخش دے۔

ان آیات کے مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سر و پا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقین یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے۔

۴۔ اسی طرح سورۂ ابراہیم کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۃ النحل بھی مکی سورتیں

ہیں، ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ شرک کے مقابلہ میں ملت حنیفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (الانعام ۶:۸۰)	بلا شبہ میں اپنے چہرہ کو اسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔
قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (الانعام ۶:۱۶۲)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو، بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کی ہے جو کج مج راہ سے الگ، صاف اور سیدھا دین ہے، ملت ہے ابراہیمؑ کی، جو تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (سورۃ النحل ۱۶:۱۲۰)	بے شک ابراہیمؑ تھا راہ ڈالنے والا، حکم بردار، صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے۔
ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (سورۃ النحل ۱۶:۱۲۳)	پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کی، تو پیروی کر اس ابراہیمؑ کی ملت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے اور نہیں ہے مشرکوں میں سے۔

تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہم نواؤں نے بیان کیے ہیں؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی،

دونوں جگہ ابراہیمؑ کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملت حنیفی کے داعی، حضرت اسمٰعیلؑ اور عرب کے باپ، کعبہ کے مؤسس و بانی اور عرب کے ہادی ہیں اور اس لیے مستشرقین یورپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے، کذب اور صریح بہتان ہے، نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گزرا، اس لیے کہ ابراہیم و اسمٰعیل اور ہود و صالح علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔

ان مدعیانِ علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں، اس لیے کہ تورات میں تصریح ہے کہ اسمٰعیلؑ ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں اور اسمٰعیلؑ ہی عرب کے باپ ہیں اور ابراہیمؑ کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی اور یہ دونوں باپ اور بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ مکہ کی زندگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور ان کے مذہبی امور کی تبلیغ کی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور ان کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی اور اس کو ملت ابراہیمی کا لقب دیا، اس لیے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آکر آپؐ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لیے کہ وہ اس کے عقیدہ کے مطابق دین موسوی کے پیرو تھے، اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے اور ان محرف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے ایسے جملے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور ان سے آپؐ کے حق میں بشارات نکلتی

ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحی الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دین موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں، اس لیے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملت ابراہیمی یعنی اسلام قبول کر لیں گے لیکن جب آپؐ نے ان کے انکار، بغض وحسد کا تجربہ کر لیا تو پھر ان کے ساتھ بھی آپؐ کا معاملہ وہی ہو گیا جو مشرکین کے ساتھ تھا اور بمصداق ''الکفر ملة واحدة'' (کفر سب ایک ملت ہے) آپؐ نے ان سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اسپرنگر، سنوک اور ان کے ہم نوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیلؑ کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو ان کا یہ کہنا کہ ابراہیمؑ بھی یہودی تھے، کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے گزرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔

پس اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن عزیز نے یہ اعلان کیا:

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًاؕ	ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، البتہ وہ تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے مسلمان۔

(آل عمران ۳:۶۷)

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے ان کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوت طبع سے یہودیت ابراہیمی ایجاد کر لی۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (نور ۲۴:۱۶)

سنوک اور اس کے ہم نواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گزرا، قرآن عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ (القصص ۲۸: ۴۶)

تا کہ تو اے محمد (ﷺ) ڈرائے ایسی قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآن عزیز امت عربیہ کے متعلق اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہ کرتا۔

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآن عزیز کے طرز خطابت، اسلوب بیان اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بنا پر ہوا ہے، یا گزشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض وعناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بت پرستی میں مبتلا تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لیے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد وضوابط وغیرہ، اس لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک و بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بددین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے، ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں اور وہ ہمارے باپ دادا کا قدیمی دین ہے:

قَالُوْا قَدْ وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (اعراف ۷: ۲۸)

مشرکین نے کہا ہم نے اسی (بت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔

تب قرآن عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لیے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں کہ حسّی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اس کا

مرغوب مذہب ہے اور یا نقلی روایات اس کا قطعی یقینی اور نا قابل انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لیے بند ہیں تو وہ دعویٰ باطل اور اس کا مدعی کاذب ہے۔

پس قرآن عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لیے آیات قرآنی کے تین حصے کر دیے، ایک حصہ میں اس کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ "اَللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا" (ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سرتاپا باطل ہے، اس لیے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○	بلاشبہ اللہ تعالیٰ بیہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا (اے مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ
(سورۃ الاعراف ۷:۲۸)	بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

اور دوسرا حصہ ان کے باطل دعوے پر حسّی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انہوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر ان کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے وہ کس طرح صحیح اور اہل عقل کے نزدیک قابل تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ○ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ○ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ○ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○	پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان سے دریافت کرو کیا تمہارے پروردگار کے لیے لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا اور وہ اس وقت موجود تھے، خبردار! بلاشبہ یہ سب ان کی بہتان طرازی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے
(الصّٰفّٰت ۳۷:۱۴۹-۱۵۵)	اولاد ہیں، بلاشبہ یہ قطعاً غلط جھوٹے ہیں

(یہ کہتے ہیں کہ خدا نے) اپنے لیے
بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کرلیا
ہے (اے مشرکین) تم کو کیا ہوا، یہ تم کیسا
(جھوٹا) حکم کرتے ہو، پس کیا تم نصیحت
نہ حاصل کرو گے؟

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآن عزیز ان سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اس کے لیے خدا کی جانب سے کوئی حجت اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اس کے پاس سے ان عقائد کی صداقت کے لیے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے، اگر ایسا ہے تو پیش کرو؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ (الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۵۶-۱۵۷)	کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف دلیل ہے، پس تم اپنی (خدا کی جانب سے نازل شدہ) وہ کتاب لاؤ، اگر تم سچے ہو۔

اب اگر ان کے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے ان کے پاس نہ کوئی حسّی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب، تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کا دین موجود ہے اور اس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہارے پاس اپنے دعوائے باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے نہ نقلی اور ان کو لاجواب بنانے کے لیے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے:

اَرَاَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ	تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن کو تم پوجتے ہو مجھے دکھلاؤ کہ انہوں نے زمین سے کیا بنایا،

فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیۡتُوۡنِیۡ بِکِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ هٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَةٍ مِّنۡ عِلۡمٍ (سورۃ الاحقاف ۴:۴۶)

یا کیا ان کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ) کوئی شرکت ہے، اس سے پہلے کوئی کتاب اگر تمہارے پاس ہے (جو اس دعوے کی تصدیق کرتی ہو) تو وہ لے آؤ یا علم (اولین میں سے کوئی بقیہ علم) تمہارے پاس ہو تو وہ پیش کرو۔

پس یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآن عزیز کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمین عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے اور اس ملک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سب سے پہلی آواز ہے، قرآن عزیز ایسی خلاف حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا، جب کہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النحل کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے عربی نبیؑ ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں اور قرآن عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات کا اقرار، اس لیے کہ وہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا کلام ہے، نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ وَلَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِیۡهِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا ○ (نساء ۴:۸۲)

کیا انہوں نے قرآن میں غور نہیں کیا اور اگر وہ ہوتا اللہ کے سوا کسی اور کا کلام تو ضرور پاتے اس میں بہت سا اختلاف۔

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنک کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افترا ہیں اور ان کے طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآن عزیز پر علمی دیانت کے

ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ ان کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے، بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں، بلکہ اس قسم کے الزامات سے ان کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جس کو قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لیے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (نساء۴:۸۹)

یہ (منکرین قرآن واسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی ان کی طرح منکر بن جاؤ تاکہ وہ اور تم سب یکساں ہو جائیں۔

اس لیے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (آل عمران۳:۸)

اے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہ یاب کرنے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا۔

بہر حال قرآن حکیم کی سطورہ بالا زیر بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اس کے درمیان الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبر عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل وتشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں موجود تھے، ان کے گزشتہ آباواجداد اور گزشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆☆☆

تاریخ ارض القرآن میں

مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات

(از حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دارالمصنّفین)

"تاریخ ارض القرآن" مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے، مگر علم ونظر اور تحقیق وتنقید کی وسعت اور جامعیت کے لحاظ سے اس کا شماران کی شاہکار تصنیفات میں ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں عرب کی قدیم قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین، سبا اور قوم تبع وغیرہ کا ذکر بار بار آیا ہے، پیغمبروں اوران کی قوموں کے ساتھ ان کے علاقوں اور بستیوں کا بھی ذکر ہے، قدیم مفسرین کا اصل مقصد جغرافی اور تاریخی اکتشافات کی تحقیق نہ تھا، اس لیے ان سے بعض اسرائیلی روایات کے نقل کرنے میں کچھ تسامح ہوا اور ایک زمانہ کے بعد جب مستشرقین یورپ کے سامنے جدید جغرافی وتاریخی حقیقتیں آئیں تو ان کی کلیسانہ فطرت کو مسلمان مفسرین ومؤرخین پر حتیٰ کہ خود قرآن مجید کے بیانات پر شک اور اعتراض کرنے کا موقع ہاتھ آیا، ان کی ظاہری علمی سنجیدگی نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو بھی کچھ حد تک متاثر کیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے پیش نظر یہ سارے حقائق تھے، چنانچہ ارض القرآن میں جہاں جہاں عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق ہے وہاں مستشرقین کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی ہیں، سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں بھی اسی جذبہ کی خاص کارفرمائی تھی،

ارض القرآن کو سیرۃ النبیؐ کا دیباچہ سمجھنا چاہیے، جیسا کہ خود سید صاحب نے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ لکھنو میں دفتر سیرتِ نبویؐ کے جب وہ اسسٹنٹ تھے تو اس موضوع کا خیال آیا، بلکہ اصل میں سیرت نبویؐ کے دیباچہ ہی کے طور پر اس کے لکھنے کی تحریک ہوئی، (دیباچہ ج ۱، ص ۶، اڈیشن ۴، ۱۹۵۵ء) لیکن جیسے جیسے سید صاحب آگے بڑھتے گئے میدان زیادہ وسیع اور کشادہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ یہ بالکل مستقل ایک تصنیف بن گئی۔

سیرۃ النبیؐ کی طرح سید صاحبؒ کا طرز تحریر اس کتاب میں بھی مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ ہے، اس میں جہاں مستشرقین کے غلط اور باطل نظریات وتصورات کی نشاندہی کی گئی ہے وہاں ان کی محنت وکاوش کی داد بھی دی گئی ہے، البتہ جب ذات رسالت مآبؐ پر کسی نے انگشت نمائی کی کوشش کی ہے تو سید صاحبؒ کے قلم میں ایک شدت ضرور پیدا ہو گئی ہے۔

اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات جواہر ریزوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، اس مضمون میں ان کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس طرح اس کتاب کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے، ورنہ درحقیقت اس کتاب کی علمی افادیت اور تاریخی اہمیت کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا تھا کہ اس کتاب میں ایک خاص پہلو سے ''قرآن فہمی'' کے معیار میں فکری انقلاب پیدا ہو گیا۔
(حوالہ مضمون تاریخ القرآن از مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف سلیمان نمبر، ص ۲۱۷)

سید صاحبؒ نے شروع میں ایک بڑا قیمتی مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں اس کتاب کے موضوع اور اس کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی ہے کہ مقصد یہ ہے کہ قدیم وجدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن (عرب) کے حالات کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکارا ہو جائے۔

قرآن مجید نے عبرت کے طور پر عرب کی کئی قوموں اور ان کے انبیا کے حالات بیان کیے ہیں، چونکہ عرب کی قوم تصنیف وتالیف سے آشنا نہیں تھی، اس لیے ان انبیا واقوام

اور ان کے تاریخی، سیاسی، قومی، مذہبی اور جغرافی حالات کی تفصیل میں مسلمان مصنفوں نے غیر محتاط طریقہ پر زبانی روایات سے کام لیا، جب کہ یورپ نے اس کے برخلاف یونانی ورومی سیاحوں کے تحریری بیانات اور عرب کے آثار قدیمہ اور نقوش و کتبات کو دلیل میں پیش کیا، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا، قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں، جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علما تک ناواقف ہیں اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی اور دوسری طرف غیروں کو انہیں افسانہ کہنے کی جرأت ہوئی۔" (تاریخ ارض القرآن ج۱،ص۴، ایڈیشن چہارم ۱۹۵۵ء)

سید صاحبؒ کو مستشرقین کی محنت وکاوش اور جانفشانی وکوشش کا بخوبی احساس تھا، وہ ان جرمن، فرانسیسی، اٹالین اور انگریز مستشرقوں کے کام سے واقف تھے کہ ان لوگوں نے یونانی ورومی تصنیفات سے جو عرب قبل اسلام کے حالات سے پر تھیں، ان کا انتخاب وخلاصہ کیا، قرآن مجید نے جن قوموں اور بستیوں کا ذکر کیا ہے، ان کے کھنڈروں کا ان لوگوں نے مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا اور پھر ان سے عجیب وغریب نتائج کا استنباط کیا، مگر سید صاحبؒ کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ یہ مستشرق مسلمان نہیں، یہودی یا عیسائی ہیں اور ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن مجید کے فوائد کو پامال کیا ہے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

"بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے، اٹھارہویں صدی کے وسط میں ریورنڈ فارسٹر نے عرب کا تاریخی جغرافیہ لکھا جس میں اس نے اپنی جہالت کے

عجیب وغریب نمونے پیش کیے جن کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور کبھی رونا آتا ہے
لیکن کیا کیجئے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن کی صداقت تاریخی کا معیار
ہے......... نولدیکی نے عمالقہ وعاد کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے جس
میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں، ڈلکن اور روبرٹسن اسمتھ عرب
کے ادعائے نسب کا انکار کرتے ہیں، عرب کے بعض اثری اکتشافات کی بنا
پر یورپ کے بعض سبک مغز مصنفین جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ "قرآن
کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا" لیکن ایک
فرانسیسی مستشرق سینٹ ہلیر نے اس کا عمدہ جواب بھی دے دیا کہ اگر یہ صحیح
ہوتا قرآن تمدن وتہذیب کے عام ابتدائی تعلیمات اور کم از کم محرمات نکاح
کے بیان کی تکلیف گوارانہ کرتا۔" (تاریخ ارض القرآن ج ا ص ۵)

سید صاحبؒ نے ارض القرآن کی تاریخ وتحقیق کے لیے چار مآخذ کو سامنے رکھا ہے (۱) ادبیات اسلامیہ (۲) ادبیات اسرائیلیہ (۳) ادبیات یونانیہ ورومانیہ اور (۴) اکتشافات اثریہ (آرکیالوجیکل ڈسکوریز) اس سلسلہ میں انہوں نے چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو مستشرقین نے بہ نظر استحسان دیکھا ہے، مثلاً ابن الحائک ہمدانی ایک عرب جغرافیہ نولیس تھے، ان کی دو کتابیں "صفۃ جزیرۃ العرب" اور "اکلیل" ہیں، پہلی کتاب عام جزیرۃ العرب کا جغرافیہ اور دوسری کتاب الاکلیل صرف یمن کی تاریخ ہے، یورپ میں اس کتاب کا اکثر حصہ برٹش میوزیم لندن اور رائل لائبریری برلن میں موجود ہے، ان کے علاوہ سید صاحبؒ نے کئی اور کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (ایضاً ص ۱۷-۱۹)

انساب اور مستشرقین: فن انساب، عرب کا ایک محبوب فن تھا، فخر ومباہات کے اظہار کے لیے عرب کا بچہ بچہ اپنے نسب کا یاد رکھنا ضروری سمجھتا تھا، شعرائے عرب اکثر قبائل کے سلسلۂ انساب کو محفوظ رکھتے تھے اور ان کے لیے یہ اس لیے ضروری تھا کہ مدح وہجو کے

موقعوں پر اس کا ذکر کر سکیں، زمانہ جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی، عرب میں بڑے بڑے علمائے انساب گزرے ہیں جو عرب کے تمام قبائل کے اور اکثر ہر قبیلہ کے مشاہیر کے نسب سے واقف تھے اور جب دوسرے علوم کی تدوین کا کام شروع ہوا تو یہ فن بھی مدون ہوا اور علمائے انساب نے اس فن میں کئی کتابیں لکھیں، دغفل بکری، ہشام کلبی، محمد بن سائب کلبی، مدائنی، فاکہانی، زبیری، زبیر بن بکار، اصمعی، ابوعبیدہ بن ہشام، مبرد، ازرقی، بلاذری، سمعانی، ابن حزم اور قلقشندی وغیرہ اس فن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں، ان میں سے بعض کی روایات کمزور اور یقینی صحت میں کمتر درجہ کی بھی ہیں لیکن روبرٹسن اسمتھ اور نولدیکی ان روایات سے آگے بڑھ کر اس پورے فن کا ہی انکار کرتے ہیں، نولدیکی لکھتا ہے:

> "اب علماء کے لیے موقع آ گیا ہے کہ ان طفلانہ خیالات کو پس پشت ڈال دیں جو چاہتے ہیں کہ عرب کی کتب انساب کو جن کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام کلبی نے گھڑ لیا ہے مان لیں، تاکہ باہم قبائل عرب قدیمہ و جدیدہ کے تعلقات تحقیق و یقین کے ساتھ ظاہر ہوں، کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ تمام قبائل بنی قیس جو وسط ملک عرب میں آباد ہیں، وہ صرف ایک شخص کی نسل سے ہوں، یعنی قیس کی جو مسیح سے کچھ پہلے تھا، اس لیے ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ درحقیقت اپنے اس پدر اول سے واقف نہیں جس کی طرف وہ منسوب ہے۔" (ایضاً ص ۲۰)

روبرٹسن اسمتھ کا خیال بھی یہی ہے کہ:

> "یہ محقق ہو چکا ہے کہ چند قبائل زمانہ ماضی غیر قدیم میں کسی تاریخی شخص کی طرف منسوب ہیں۔" (ایضاً ص ۲۱)

سید صاحبؒ نے ان دونوں مستشرقوں کی رائے کو نقل کر کے ان سے دریافت کیا ہے کہ آخر اس بے اعتباری کے دلائل کیا ہیں؟ وہ لکھتے ہیں کہ:

''عرب کے ایک ایک قبیلہ کے لیے ضروری تھا کہ دوستوں کی مدح اور دشمنوں کی ہجو کے لیے انساب محفوظ رکھے، عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر پدر کی طرف انتساب کرتا وہ عرب میں حقیر و ذلیل سمجھا جاتا اور بطور نشان ملامت کے اس کا نام لیا جاتا، شعرائے عرب مختلف مواقع کے لیے انساب کے زبانی یاد رکھنے پر مجبور رہتے تھے، کیا ان واقعات کے بعد بھی اس عام بے اعتباری کی کوئی مناسب وجہ ہے؟ بنو قیس کی طرح چھ سو برس کی مدت میں ایک شخص کی اولاد سے چند بطون و قبائل کا پیدا ہو جانا کوئی محال امر نہیں۔'' (ایضاً ص ۲۱)

سید صاحبؒ اس کے بعد ان مستشرقین کے اعتراض کی اصل وجہ بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''یورپ کے ان علمی توہم پرستوں کے انکار انساب کی بنیاد مسئلہ طوطمیت (ٹوٹزم) پر ہے، طوطمیت اس کا نام ہے کہ ''اشخاص و قبائل کا اپنے کو دیویوں، ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی طرف منسوب کرنا'' قدیم زمانہ میں جب انسان بچہ تھا، جب کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا تھا تو وہ انسانوں کی ولدیت سے نکل کر دیویوں کی نسل قرار پاتا تھا، وہ دیویاں خواہ ستارے ہوں یا حیوانات ہوں، یا درخت ہوں، ہندوؤں میں سورج بنسی اور چندر بنسی وغیرہ قبائل تھے جو اپنے کو انسانوں کے نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کے بیٹے کہتے تھے، اس لیے سورج اور چاند کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اس قبیلہ کے مورث اول کا نام ہے، بلکہ وہ اس قبیلہ کی دیوی کا نام ہے۔''

''قبائل عرب میں بھی بنو شمس وغیرہ اسی قسم کے نام ہیں اور حیوانات کے نام تو بکثرت آتے ہیں، جیسے بنو اسد، بنو فہد، بنو ثعلب، بنو کلب، بنو نمل، بنو عجل وغیرہ، نظریہ طوطمیت کے مطابق شمس، اسد، فہد، ثعلب،

کلب، نمل، عجل، اشخاص تاریخی نہیں ہیں اور نہ ان قبائل کے مورث اول کے نام ہیں، بلکہ یہ ان ستاروں اور جانوروں کے نام ہیں جن کی پرستش وہ قبیلے کرتے تھے اور ان ہی کی طرف اپنے کو منسوب سمجھتے تھے لیکن یہ محض علمی توہم پرستی ہے، عرب میں کبھی اس قسم کا خیال نہیں پیدا ہوا، اس خیال کی پیدائش عراق، ہندوستان، مصر اور یونان کی میتھالوجی (علم الاصنام) میں ممکن ہے، اس قسم کے نام عرب میں صرف چند ہیں اور جو ہیں ان میں کلب (کتا) نمل (چیونٹی) ثعلب (لومڑی) کون سی گرامی قدر ہستیاں ہیں جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہو اور یہ اس قسم کے نام ہیں جن سے اس زمانۂ روشن کا طبقۂ متمدن بھی خالی نہیں، تم نے بعض انگریزوں کے نام Fox (لومڑی) بل (Bull) سنے ہوں گے، کیا یہ بھی طوطمیت ہے؟'' (ایضاً ص ۲۰، ۲۱، ۲۲)

سید صاحبؒ کی مذکورۂ بالا عبارت سے نولدیکی اور ان کے ہم نواؤں کے اعتراضات کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

ادبیات رومانیہ کا ایک جغرافیہ نویس: سید صاحبؒ نے ادبیات یونانیہ ورومانیہ کے زیر عنوان ایک باب قائم کیا جس میں ان یونانی ورومانی مؤرخوں اور سیاحوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے جو قرآن کی مذکورہ قوموں کے معاصر یا قریب العصر تھے، ان میں بطلیموس اسکندریہ کا مشہور ہیئت داں وجغرافیہ نویس تھا، اس نے خود تو عرب کی سیاحت نہیں کی تھی، تاہم اسکندریہ میں عرب تاجروں سے وہ ملاقاتیں کرتا تھا، ان تاجروں اور دوکانداروں سے دریافت کرکے اس نے عرب کا جغرافیہ ترتیب دیا تھا اور اس میں عرب کے مشہور قبائل، شہر، گاؤں، پہاڑ، سواحل، تجارتی منازل اور تجارتی راستوں کو بیان کیا تھا، عرب آبادان میں اس کے بیان کے مطابق ایک سو چودہ آبادیاں تھیں لیکن سید صاحب لکھتے ہیں کہ چند ناموں کے سوا

اب ان قبائل ومنازل کے نام خارج از فہم ہیں، جرمن مستشرق اسپرنگر کی کتاب ''قدیم جغرافیہ عرب'' جو ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس میں بطلیموس کے ناموں اور مقاموں کا عرب جغرافیہ نویسوں اور موجودہ سیاحوں کے بیانات سے مقابلہ کیا گیا تھا اور بطلیموس کے مذکورہ ناموں کی صحت ثابت کی گئی تھی لیکن سید صاحبؒ اسپرنگر کی اس تحقیق وتطبیق سے متفق نہیں ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ چند ناموں کے سوا اور تمام ناموں کی تطبیق بہ تکلف ہوسکتی ہے اور اس کی مثالیں ہماری کتاب میں جابجا ملیں گی اور یہی شکایت مسعودی اور یاقوت حموی تقریباً آٹھ سو برس پہلے کرچکے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبائل عرب زیادہ تر بدویانہ زندگی کے عادی تھے، اس لیے ان کے مقامات کی تعیین نہایت مشکل ہے، پھر بطلیموس کی، قافلوں اور کاروانوں کی زبانوں سے ان کی تحقیق اور یونانی حروف ولہجہ میں ان کی تعبیر اور پھر انقلابات وحوادث روزگار کا تواتر، کاتبوں کی جہالت اور ناآشنائی فن، ان وجوہ سے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ایک لفظ اپنے صحیح مخرج سے کہاں کہاں جاپڑا ہوگا۔'' (ایضاً ص ۲۸،۲۹)

اکتشافات اثریہ اور مستشرقین: اکتشافات اثریہ (ص ۳۱) کے زیرعنوان سید صاحب نے قدیم عربوں کے بہت سے آثار، عمارات اور یادگاروں کی بازیافت کی مہم میں علمائے یورپ کی کوششوں کی تعریف کی ہے، کتبات اور نقوش زیادہ تر حمیری، سبائی، آرامی اور نبطی خط میں ہیں، ان کتبات کو حل کرنے کے فن کو مستشرقین نے بے حد ترقی دی اور اس شاخ میں بے انتہا برگ وبار پیدا کرکے اس کو مستقل ایک فن بنا دیا لیکن سید صاحب کی تحقیق کے مطابق بہرحال اولیت کا سہرا ان کے سر نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:

''دولت بنی امیہ اور عباسیہ کے ابتدائی زمانہ میں جبکہ تاریخی مذاق

مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا، ان آثار کی تحقیق کی گئی اور ان میں سے اکثر خطوط اور زبانوں سے اس عہد کے علما واقف تھے، ذوالنون مصریؒ جو دوسری صدی میں تھے مصر کے خط برابی (ہیروگلفی) پڑھتے تھے، حمیری محقق علامہ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب اور الاکلیل میں تمام مشہور آثار کے نام گنائے ہیں اور ان کے تفصیلی حالات کے لیے اپنی کتاب 'اکلیل' کا حوالہ دیاہ، قلعۂ ناعط جو سلاطین یمن نے پہاڑ کی چوٹی پر بنایا تھا، اسلام سے تقریباً پندرہ سو برس قبل کی تعمیر ہے، وہب بن منبہ نے (جنھوں نے صحابہ کا زمانہ پایا تھا) اس کا ایک کتبہ پڑھا تھا، ہمدانی کے علاوہ مقدسی نے اپنے سفرنامہ میں، یاقوت نے اپنی معجم میں، نویری نے اپنے جغرافیہ میں اور قزوینی نے اپنی آثار البلاد میں اسی قسم کے آثار و کتبات کا ذکر کیا ہے۔''

(ایضاً، ج ۱، ص ۳۲، ۳۴، ۳۵)

لیکن سید صاحبؒ نے فراخ دلی سے اس کا اعتراف کیا کہ یہ بہر حال ادھوری کوششیں تھیں، علمائے یورپ نے ان کو بہت ترقی دی، اس کے بعد سید صاحبؒ نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور مختلف سیاحوں مثلاً نیوبھر، ہزبرگ، ہمپرچ، ارناؤ، ہالوے، وریڈے، ہریش، برکھارڈ، بیڈے اپلچ، چارلس ڈوٹے اور ہیوبر کی تحقیقات و اکتشافات کا ذکر ایجاز کے ساتھ کیا ہے، ہیوبر کی تحقیقات کو وہ عام حالات و واقعات سے بلند تر اور زیادہ علمی سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ہیوبر کو عرب کی آرکیالوجی اور ٹاپوگرافی کا محسن سمجھتے ہیں۔ (ارض القرآن، ص ۴۴)

تاریخ قدیم کے بعض اصول: سید صاحب نے تاریخ قدیم کے بعض اصول کے تحت مختصر مگر نہایت عالمانہ بحث کی ہے، تاریخ قدیم کی ترتیب و تدوین میں سب سے بڑی دقت اور دشواری جو پیش آتی ہے وہ زمانہ کی تعیین اور ناموں کے اتحاد و اختلاف کی ہوتی ہے، سید صاحبؒ نے اس ضمن میں چند اصول مقرر کیے ہیں، مثلاً اصول تعیین زمانہ یعنی

جدید طرز تاریخ کی رو سے قبائل کے دور اور عہد کی تعیین کی جائے، عام طور سے کسی مجہول العہد قوم کے زمانہ کی تعیین اس طور پر کی جاتی ہے کہ اسی قوم کی ہم عصر قوم یا کسی شخص کے زمانہ سے اس کا قیاس کیا جاتا ہے، ایک اصول یہ بھی ہے کہ تاریخی اشخاص اور ان کے مقامات سکونت کے ناموں کی یا دو قوموں کی زبان، اشخاص اور دیوتاؤں کے ناموں کی آپس میں تطبیق دی جائے جس سے مقامات سکونت اور اتحاد قومیت کی طرف اشارہ مل سکتا ہے، مستشرق فارسٹر نے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنی کتاب ''عرب کا تاریخی جغرافیہ'' میں چند نتائج پیدا کیے، سید صاحبؒ ان نتائج کو کارآمد قرار دیتے ہیں، گو بعض مقامات پر فارسٹر صاحب کے استنباطات سید صاحب کی رائے کے مطابق وہم وظن سے آگے کا علم نہیں بخشتے اور کہیں علم کے بجائے وہ جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں، فارسٹر کے اخذ کردہ اصول کے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''اس اصول کے اجرا میں دو بہت بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، پہلی یہ کہ زمانہ کے امتداد، قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیر سے نام کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، اس لیے مقامات اور باشندوں کے ناموں میں تطابق کے بجائے کبھی صرف تشابہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے، دوسری دقت جو پہلے سے سہل تر ہے، یہ ہے کہ سامی زبانوں میں باہم اور نیز یونانی زبان میں جس میں تورات کا قدیم ترجمہ ہے اور اب زیادہ تر وہی پھیلا ہوا ہے، جب ایک نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو بعض حروف کا خصوصیت زبان کی وجہ سے مبادلہ ہو جاتا ہے، مثلاً آجر اور ہاجر، اسمائیل اور اسماعیل، تھمود اور ثمود، حصارموت اور حضرموت، اضحاک اور اسحاق، حدرموت اور حضرموت، ابی رہام اور ابراہیم وغیرہ۔''
>
> (ارض القرآن ج ۱ ص ۵۱ تا ۵۴)

اس کے بعد سید صاحب نے اصول اتحاد اسماء والسنہ کو اس بحث میں سب سے مفید اور کار آمد قرار دیا ہے کہ ہر قوم کے ناموں کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے، جس میں اس کی قومیت کا امتیاز پوشیدہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر دو قوموں کے ناموں میں باہمی تشابہ نظر آئے گا تو یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں قومیں حقیقت میں متحد الاصل ہیں، یہی حال مذہبی اعتقادات کے تشابہ اور زبان کے الفاظ کی مماثلت کا بھی ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں اقوام کے اتحاد نسل کی یہ بھی ایک دلیل ہے، گو مبہم ہے۔

جغرافیہ عرب اور فارسٹر: اوپر بطلیموس کا ذکر آ چکا ہے جس نے عرب کی جغرافی تقسیم کو مرتب کیا اور اس کی یہ ترتیب سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہوئی، اس نے جغرافیہ میں عرب کے ۵۴ قبائل، ۱۶۴ مقامات، ۵۰۷ کوہستانی سلسلے اور ۴ دریاؤں کا ذکر کیا ہے لیکن بطلیموس کے مخالفوں کو ان ناموں کو تسلیم کرنے میں پس و پیش ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان ناموں کا وجود و مصداق بطلیموس کے دماغ کے سوا خارج میں کہیں نہیں ہے لیکن بطلیموس کے معتقدین اس الزام سے برہم نظر آتے ہیں، ان کی نمائندگی فارسٹر کرتے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میں ۱۵۷ ناموں کی تحقیق کی ہے، سید صاحبؒ اس تحقیق کو "عالمانہ جہالت" سے تعبیر کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

> "غریب فارسٹر کو نہیں معلوم کہ یہ قبائل کب پیدا ہوئے، ان مقامات میں کب آباد ہوئے اور عربی میں ان کا صحیح نام کیا ہے، وہ بطلیموسی قبائل کے ناموں کو حروف کے ہیر پھیر سے موجودہ قبائل سے تطبیق دیتا ہے، اس کو نہیں معلوم کہ اب قدیم قبائل کے نام بالکل نئے ہیں۔" (ایضاً، ج ۱، ص ۷۱)

بطلیموسی جغرافیہ کے تحت تین قبیلوں کو سب سے زیادہ اور پرزور طاقتور بتایا گیا ہے، یہ قبائل ہیں (۱) بنی زومین (۲) سیڈینی اور (۳) بنو بری، ان تینوں قبیلوں کو بحر احمر کے ساحلی علاقوں میں خلیج عقبہ سے عسیر تک حجاز و تہامہ میں متوطن ظاہر کیا گیا ہے، لیکن سید صاحب

پوچھتے ہیں ''کہ ان کے اصلی اور صحیح نام کیا ہیں؟'' کیونکہ ان ناموں کا قبیلہ عرب میں تو موجود نہیں ہے لیکن ریورنڈ فارسٹر بغیر کسی شک وسوال کے یقینی انداز میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بنی زومین بنی عمران ہیں، سیڈینی قبیلہ جہینہ کا نام ہے اور بنی بری، یہ کنویں والا قبیلہ ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ بطلیموس کے دو ہزار برس کے بعد یورپین سیاحوں برکھارٹ اور نیوبھر نے انہی مقامات میں مذکورہ قبائل کو دیکھا ہے، سید صاحب اس دلیل کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

> ''صاف ظاہر ہے کہ زومین خزیمین ہے، سیڈینی سیدمین ہے اور بنو بری بنو بربر ہیں، فارسٹر کی عربی دانی ملاحظہ ہو کہ عربی میں چونکہ کنویں کو بئر کہتے ہیں، اس لیے انہوں نے بری کے معنی بھی کنویں کے ہی سمجھے، خزیمہ حجاز میں، سیدین اور بربر دیگر اطراف میں مشہور قبائل ہیں۔'' (ص ۷۸)

اس کے بعد سید صاحب نے بطلیموسی قبائل کے ناموں کی ایک فہرست دی ہے، جس میں یونانی تلفظ انگریزی وفارسی رسم الخط میں دیا گیا ہے، پھر فارسٹر کی رائے دی ہے اور اس کے مقابل انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مثلاً ڈیبائی کو فارسٹر زبید کہتے ہیں لیکن سید صاحب اس کو ضبہ کہتے ہیں، الاثیاری کو فارسٹر بنی یام اور سید صاحب بنو عیلام قرار دیتے ہیں، مانی ٹائی اور کیتیمی بانی تائی کو فارسٹر اہل منی اور بنو قحطان سمجھتے ہیں لیکن سید صاحب معین (واقع یمن) اور قتابین (قتاب واقع یمن) قرار دیتے ہیں، ایک نام واخری مونزائی ہے، اس کو فارسٹر دار القرامطہ (واقع بحرین) سمجھتے ہیں، سید صاحب اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ:

> ''غریب مستشرق کو معلوم نہیں کہ بحرین میں قرامطہ کا وجود بطلیموس کے آٹھ سو برس بعد ہوا ہے۔'' (ایضاً ص ۸۱، ج ۱)

ریورنڈ فارسٹر کو صرف اسی پر اصرار نہیں ہے کہ بنی زومین بنی عمران ہیں اور یہ کہ

ان کا مسکن حجاز نہیں ہے، بلکہ خلیج عقبہ ہے اور اس اصرار کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسیح سے سولہ سو برس پہلے سسلی کے ڈائڈورس نے لکھا تھا کہ "بنی زومین کے ملک میں ایک معبد ہے جس کی تمام عرب عزت کرتے ہیں" اس معبد کو ان علمائے یورپ نے جو کہ ریورنڈ یعنی پادری نہیں ہیں، انہوں نے بھی کعبہ سمجھا ہے، ظاہر ہے کہ کعبۂ حجاز کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سید صاحب نے اس نکتہ کو بھی محسوس کیا اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کی بحث وہ الگ کریں گے۔

امم سامیہ کا مسکن اول: اس عنوان کے تحت سید صاحب نے نہایت محققانہ بحث کی ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے، اس بحث میں سید صاحبؒ نے مستشرقین کی ایک جماعت کے خیالات کو قبول کیا ہے، بحث یہ ہے کہ زمانۂ تاریخ سے پہلے جو سامی قومیں الگ الگ لیکن متصل مقامات میں آباد تھیں اور صرف چند کنبوں میں تقسیم تھیں تو ان کا مسکن کہاں تھا؟ عرب کے مؤرخین کے پاس تو اس کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا مسکن عرب تھا لیکن یورپ کے علماء و محققین نے اس سوال کے جواب میں چار نظریے پیش کیے ہیں، ان کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ ان سامی قوموں کا پہلا مسکن افریقہ ہے جہاں سام کے بھائی حام کی اولاد، زمانۂ تاریخی میں آباد ملتی ہے، ان محققین کی دلیل یہ ہے کہ سامی اور حامی زبانوں میں بہت مشابہت ہے، نیز یہ کہ سامی اور حامی اور خصوصاً جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں (حبشی) کے بعض اعضا میں مکمل مشابہت پائی جاتی ہے لیکن سید صاحب اس دلیل کی پرزور تردید کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

> "یہ دلیل نہایت عجیب ہے، دو بھائیوں میں اگر مشابہت پائی جاتی ہے اور ایک افریقہ میں رہتا ہو تو کیا ضرور ہے کہ دوسرا بھی افریقہ ہی میں پہلے رہتا ہو، یہ کیوں نہیں فرض کیا جاسکتا کہ خود حامی پہلے سامی خاندانوں کے ساتھ رہتے تھے اور ایک مدت کی یکجائی کے بعد ان سے الگ ہوئے،

اسی یکجائی واجتماع واتحاد نسل کے بقیہ آثار دونوں میں موجود ہیں۔"

(ارض القرآن، ج ا،ص ۱۰۷)

جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں میں مشابہت کی دلیل سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

"جنوبی عرب (یمن) اور حبشیوں میں یقیناً تشابہ ہے لیکن اس کا سبب بالکل ظاہر ہے، حبش کی کوئی مستقل آبادی و نسل نہیں ہے بلکہ وہ یمنی عربوں کی ایک نوآبادی ہے اور ان کی نسل کا مخلوط حصہ ہے، اسی لیے عرب ان کو حبش (مخلوط) کہتے ہیں اور اسی بنا پر قدیم مؤرخین، یمن و حبش کو دو مستقل ملک نہیں قرار دیتے ہیں، بلکہ ایک ہی ملک (ایتوبیا) کے ان کو دو ٹکڑے سمجھتے ہیں۔" (ارض القرآن، ص ۱۰۷، ۱۰۸)

مستشرقین کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بنو سام کا پہلا وطن آرمینیہ اور کردستان ہے لیکن سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ اس تھیوری کی صحت پر تورات کے چند الفاظ کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے، خود نولدیکی بھی اس نظریہ کو صحیح نہیں مانتا۔ (ایضاً ص ۱۰۸)

تیسرا نظریہ ایک اطالوی مستشرق پروفیسر گیڈی کا ہے، ان کا خیال ہے کہ سامیوں کا مسکن اول فرات کا نشیبی حصہ تھا، پروفیسر گیڈی نے اپنے اس دعویٰ کو ان مقدمات پر قائم کیا ہے کہ "ابتدائی زبان میں سب سے پہلے ابتدائی ضروریات اور گردو پیش کی چیزوں کے لیے الفاظ پیدا ہوں گے اور اس لیے یہ الفاظ عموماً مختلف خاندانوں اور زبانوں میں تقسیم ہونے کے بعد بطور ترکہ موروثی کے مشترک طور پر باقی رہیں گے، سامی زبان میں اس قسم کی چیزوں کے لیے جو مشترک الفاظ ہیں مجموعی طور پر ان کا وجود جہاں پایا جائے گا وہی ام سامیہ کا مسکن اول ہوگا، اس حیثیت سے جو مشترک چیزیں معلوم ہوتی ہیں ان کی شہادت ہے کہ وہ فرات کے حصہ زیریں کی پیداوار ہیں۔" (ارض القرآن جلد اول صفحہ ۱۰۸)

پروفیسر گیڈی کی ان رایوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں کہ ان سے پہلے اسی قسم کی دلیل وان کریمر نے قائم کی تھی اور ان کا خیال یہ تھا کہ سامی قوموں کا ابتدائی مسکن ایشیائے وسطیٰ میں نہر جیحون وسیحون کے پاس ہے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک ہی قسم کی دلیل سے دو مختلف نتائج کا ظہور دونوں کے ابطال کی دلیل ہے۔'' (ارض القرآن، ج ۱، ص ۱۰۹)

چوتھی دلیل اس بحث میں یہ ہے کہ بنو سام کا مسکن اول عرب ملک ہے، سید صاحب کی رائے میں یہ دلیل قرین صواب اور باعتبار دلائل مستحکم ہے، مستشرقین کی ایک بڑی جماعت بھی اسی رائے کی مؤید ہے، ان لوگوں میں ڈی فوئی، شریڈر، اسپرنگر، نولدیکی، روبرٹسن اسمتھ، سموال لے انگ، ولیم رائٹ اور راجرس وغیرہ شامل ہیں، سید صاحب نے ان لوگوں کی رایوں کو تلخیص کے ساتھ نقل کیا ہے بالخصوص انہوں نے نولدیکی کے ساتھ خاص اعتنا کیا ہے، ان کی رائے کو نقل کرنے سے پہلے ان کو ''موجودہ یورپ میں مشرقی زبان و تاریخ کا سب سے بڑا فاضل'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، ہم یہاں نولدیکی کی رائے کو نقل کرتے ہیں کہ اس کی افادیت کا یہی تقاضا ہے، نولدیکی کی عبارت یہ ہے:

> ''بعض مشہور محققین خیال کرتے ہیں کہ جنس سامی کا مولد عرب ہوسکتا ہے، بہت سی چیزیں ہیں جو اس تھیوری کی تائید کیا کرتی ہیں، تاریخ ثابت کرتی ہے کہ نہایت قدیم زمانہ سے عرب کے ریگستان سے قبائل نکل نکل کر قریب کے سرسبز ممالک میں آباد ہوتے رہے ہیں، آرامی اور عربی زبانوں میں بہت سے ایسے نشانات پائے جاتے ہیں جن سے ابتدائی خانہ بدوشانہ حالت پائی جاتی ہے اور عرب کا شمال حصہ صحرائے مابین شام و عرب خانہ بدوش قبائل کا مسکن ہے اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان قریب ترین اصل زبان ہے۔''

''ہم خوشی سے قبول کرتے ہیں کہ یہ تھیوری کہ عرب امم سامیہ کا مسکن اول ہے، کسی معنی سے غیر معقول نہیں ہے۔'' (ارض القرآن ج ا، ص ۱۱۲)

سید صاحبؒ اس بحث کے آخر میں اسی فیصلہ کا اعلان کرتے ہیں کہ عرب کے سوا قدیم زمانہ سے کوئی قوم اس کی مدعی نہیں ہے کہ ان کا ملک بنوسام کا مسکن اور امم سامیہ کا مسقط الراس ہے، عرب عام طور پر اس کے مدعی ہیں اور حق یہ ہے کہ شواہد و قرائن کی شہادت کے ساتھ جب کوئی دوسرا مدعی موجود نہیں ہے تو مقدمہ ان ہی کے حق میں فیصل ہونا چاہیے، اس کے بعد سید صاحب نے ابن قتیبہ اور یعقوبی کی دو تحریروں کو پیش کیا ہے اور آخر میں یہ بلیغ فقرہ بھی سپرد تحریر کردیا کہ:

''ان مقدمات پر ایک دفعہ کا اور اضافہ کرو کہ قرآن مکہ کو ام القریٰ (آبادیوں کی ماں) کا خطاب دیتا ہے، لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا''

(ایضاً، ص ۱۱۵)

مسکن اول سے ہجرت: اس عنوان کے تحت سید صاحبؒ نے عرب سے نکل کر دوسرے علاقوں کی طرف امم سامیہ کی ہجرت پر بحث کی ہے اور اس ضمن میں ولیم راجرس، سموال لے انگ اور فرانسیسی مؤرخ ہوآرٹ اور شریڈر کی تشریحات کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:

''عرب کے ملک میں پانی کا دریا نہیں لیکن وہاں انسانوں کا دریا ہے، تاریخ نے چار بار اس دریا میں طوفان آتے دیکھا ہے، ایک مسیحؑ سے ڈھائی ہزار یا تین ہزار برس پہلے، جب یہاں سے قبائل کا سیلاب موجیں مارتا ہوا بابل و سیریا، مصر اور فینیشیا (کنعان) میں پھیل گیا، اس سیلاب کا زور کم ہو رہا تھا کہ ۱۵۰۰ ق م میں ایک اور طوفان آ دوی، موابی اور مدیانی قبائل کا اٹھا اور پاس کے ملکوں میں پھیل گیا لیکن اس کا دائرہ پہلے سے کم تھا، تیسری بار

معینی، سبائی وغیرہ اٹھے اور پھیلے لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی
ہجری میں مسیح سے چھ سو برس بعد اٹھا، وہ سب سے زیادہ وسیع الاثر تھا جو ایک
طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا اور دوسری طرف بحر محیط سے۔"

(تاریخ ارض القرآن ج ۱، ص ۱۱۶)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے امم سامیہ سے متعلق ایک طویل بحث کی ہے، عاد کے ذکر میں بعض مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ یہ نام صرف ایک فرضی اور مذہبی داستان کی حیثیت رکھتا ہے لیکن سید صاحب اس کو انتہائی غلطی تصور کرتے ہیں اور جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ عرب کے تمام قدیم باشندے (امم سامیہ) ایک ایسی بڑی اور باعظمت جمعیت تھے جنہوں نے بابل، مصر، شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں، اب اگر عرب والے اپنی زبان میں ان قدیم باشندوں اور ان کی جماعت کے افراد کو عاد، ثمود، ملسم، جدلیس کہتے ہیں تو کیا ان ناموں کے وضع کرنے کے جرم میں حقیقت اور نفس واقعہ مٹ جائے گا، وہ لکھتے ہیں:

"کوئی قوم جب برسر اقتدار ہوتی ہے تو حقیقت میں اس کل کے
ضمن میں کوئی جزو ممتاز ہوتا ہے اور اس کے انتساب سے مجموعی قوم مقتدر
اور ممتاز تسلیم کر لی جاتی ہے، امم سامیہ کی کثیر الافراد جمعیت میں ضروری
ہے کہ کوئی خاص جزو قوت حاکمہ کا مالک ہو اور بقیہ اجزا اس کے اشارہ پر
حرکت کرتے ہوں، اس جزو کا حقیقی نام کچھ ہو لیکن اہل عرب اس کا نام
عاد بتاتے ہیں، ولا مشاحتہ فی الاصطلاحات۔" (ج ۱، ص ۱۲۶)

اس کے علاوہ سید صاحب سب سے مستند ذریعہ قرآن کو سمجھتے ہیں جس نے عاد کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ۔اِرَمَ ایک اور جگہ آتا ہے وَاذْکُرُوْا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ تو قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمراں جماعت ظہور میں آئی، قرآن پاک کی زبان

میں اس کا نام عاد ہے اور یہی قدیم و ابتدائی امم سامیہ کی حقیقت ہے، فرانس کے مشہور مؤرخ موسیو سیدیو نے اپنی تاریخ عرب میں عاد کی حکمرانی کو ایک مفروضہ قرار دیا ہے لیکن سید صاحب کی رائے یہ ہے کہ "امم سامیہ کی حقیقت سمجھنے کے بعد یہ "فرض" یقین سے بدل سکتا ہے۔" (ایضاً، ج۱، ص ۱۲۷)

سید صاحب نے اس حقیقت کو صفحہ ۱۲۸ سے صفحہ ۱۸۵ تک جس انداز میں واضح کیا ہے وہ اعلیٰ تحقیق کی ایسی مثال ہے جس پر خود تحقیق کو ناز ہے، تورات، تاریخ قدیم، تحقیقات جدیدہ اور قرآن مجید کے بے شمار ماخذ سے انہوں نے جس طرح اس بحث پر داد تحقیق دی ہے اس کی قدر صرف اس حصہ کے مطالعہ سے ہی ہو سکتی ہے، ایک انتہائی خشک موضوع پر لکھتے ہوئے بھی سید صاحب کے قلم کی شگفتگی میں کمی کا احساس نہیں ہوتا، مثلاً تحقیقات جدیدہ کی بحث میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> "آرکیالوجی کی اعانت سے بابل کے مفریات و آثار نے قدامت کے پردہ کو چاک کر دیا ہے، اب نئے سرے سے بابل کا تمدن زندہ ہو رہا ہے اور علم الآثار کے چراغِ طلسمی میں اب نظر آ رہا ہے کہ بابل و سیریا کا ہر پتھر درحقیقت ان کی تاریخ کا صفحہ ہے۔" (جلد ۱، ص ۱۳۵)

عاد کی بحث میں شہر عدن پر بھی گفتگو کی گئی ہے، فارسٹر عدن کو عدنان سے نسبت دیتے ہیں لیکن سید صاحب اس رائے کو قطعی غلط مانتے ہیں، کیونکہ عدنان کا مسکن تو شمالی عرب تھا، عدن جنوبی یمن میں ہے، اس لیے دونوں میں کوئی تعلق نہیں، سید صاحب کی تحریر میں استدلال کا پرزور انداز ملاحظہ ہو:

> "عہد قدیم میں عموماً سامی مذاق یہ رہا ہے کہ شہر کا نام بعینہٖ بانی شہر کے نام پر رکھتے تھے، عرب کے شہر رقیم، سبا، حضر موت، عمان، مدین، اوفر، حویلہ، تیماء وغیرہ کے اسی قسم کے نام ہیں، اس بنا پر اگر یمن کے قدیم شہر

''عدن'' کو جس کے قریب وہ تمام عمارات واقع ہیں جن کو عرب عادیات کہتے ہیں اور تاریخ جس کے قریب عاد کی آبادی کا نشان بتاتی ہے، اگر ہم عادیین کا مخفف سمجھیں تو کیوں غلط ہوگا؟ عادیین کی جمعیت پر اعتراض نہ کرو کہ قبیلہ کے نام کے پہلے بنو (فرزندان) کا اضافہ کرنا شمالی عرب کی زبان ہے، عموماً قدیم طریقہ یہی ہے کہ پدر قبیلہ کے نام کی جمعیت سے قبیلہ کا نام پیدا کر لیتے ہیں، مثلاً لودیم، مصرایم، جرائم وغیرہ، عربی میں جمع مکسر میں اب تک یہ قاعدہ جاری ہے، مثلاً منذر سے مناذرہ، غسان سے غسانہ، ارقم سے اراقمہ۔'' (تاریخ ارض القرآن، ج۱، ص۱۸۴)

مستشرق نیوبھر نے عدن کو (نعیم) کے دوان کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے لیکن سید صاحب ایک خاص انداز میں اس کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''شاید نیوبھر کو حز قیال کے اس درس کی خبر نہیں جس میں عدن اور دوان ایک ساتھ واقع ہیں۔'' (ج۱، ص۱۸۵)

ایک موقع پر یارح، یعرب اور جرہم کی بحث میں فارسٹر کا ذکر پھر آیا ہے، فارسٹر نے یارح، یعرب اور جرہم کو ایک ہی نام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

''یارح اور یعرب کا اتحاد تو ظاہر ہے لیکن یارح اور جرہم میں باہم کیا تعلق ہے؟ یہ تعلق اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ یونانی تلفظ میں جس کی تمام السنۂ یورپ میں تقلید کی جاتی ہے، ''ی'' ج سے بدل کر یرح کا جرح ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ جرہم خاص سامی التلفظ نام ہے، یونانی نہیں، کیونکہ اسمائے قدیم کے متعلق عربوں کے معلومات براہ راست یہودیوں سے ماخوذ ہیں جن کی زبان یونانی و سریانی تھی اور یا خود ان کے عربی موروثی روایات ہیں اور ان دونوں کے لحاظ سے ی اور ج کا مبادلہ غیر مسلم ہے، یہ مبادلہ سامی (عبری و

عربی) اور غیر سامی (یونانی ولاطینی) زبانوں کے مابین ہوتا ہے، ورنہ خود سامی زبانوں کے اندر اس قسم کا مبادلہ کبھی نہیں ہوتا۔" (ج ۱، ص ۲۲۶)

ہالوے کا اعتراض: حمیر وسبا کی بحث میں سید صاحب نے ہالوے کی ایک بحث کا جائزہ لیا ہے، جنہوں کتبات کے اصول کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "شاہان سبا وحمیر کا آئین تحریر یہ تھا کہ وہ کتبات میں عام طور سے لفظ ملک (شاہ) کے بعد قلعہ حکومت کا اور پھر اپنے شہر حکومت کا ذکر کرتے تھے، چنانچہ "ملک حمیر وریدان وسبا وسلحین" میں سبا وسلحین میں جو تعلق ہے یعنی پہلا شہر ہے اور دوسرا قلعہ ہے تو یہی تعلق حمیر وریدان میں بھی ہے، اس بنا پر حمیر قوم کا نام نہیں، بلکہ قلعہ شاہی کا نام ہے، رفتہ رفتہ اس نے حکومت کا اور پھر تمام قوم کا نام اختیار کر لیا۔" (ج ۱، ص ۲۷۴)

سید صاحب کو متعدد وجوہ سے اس تحقیق سے انکار ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس تاریخ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ سامی قوموں میں شخص کے نام پر ملک کے نام رکھنے کا رواج عام تھا لیکن ملک کے نام پر قوم کا نام کبھی نہیں رکھا گیا، اس کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں، سبا، ایک قوم کا اصل میں نام ہے لیکن چونکہ اس قوم کا پایہ تخت شہر مارب تھا، اس لیے خود شہر مارب کو سبا کہنے لگے، جیسا کہ شاہ اذینہ حبشی کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ قاعدہ یہ ہے کہ لفظ مذکور اگر کسی مقام کا نام ہوتا ہے تو اس کے پہلے لفظ "ذو" (مالک) یا لفظ "حضر" (شہر) یا لفظ "بیت" (قلعہ) آتا ہے، جیسا کہ "ذوریدان وذوسلحین" کہ یہ دونوں مقامات کے نام ہیں، حضر موت وبیت ابین یعنی شہر عدن وقلعہ سلحین وشہر مارب لیکن اس قسم کا استعمال لفظ حمیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا، مزید برآں اب تک کتبات میں جس قدر شہروں اور قلعوں کے نام ملے ہیں وہ تمام تر عربی جغرافیوں

میں مذکور ہیں لیکن حمیر کا بحیثیت قلعہ یا شہر کے کہیں ذکر نہیں ہے۔''

(تاریخ ارض القرآن ج ا، ص ۲۷۵)

حضرت ایوبؑ اور فارسٹر: حضرت ایوبؑ کے ذکر میں بھی حسب سابق سید صاحبؒ نے حضرت ایوبؑ کے خاندان، قبیلہ اور ان کے زمانہ کی تعیین میں حد درجہ تحقیق سے کام لیا ہے، دوران بحث وہ فارسٹر کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اس بحث پر کئی صفحے سیاہ کیے ہیں کہ ایوبؑ عرب تھے اور نسل ادوم سے تھے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں تک تو صحیح ہے لیکن فارسٹر یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ ایوبؑ کا شہر دنابا تھا اور یہ غلطی ان سے اس لیے ہوئی کہ ان کی نقل کردہ ایک عبارت میں یہ تحریر ہے:

والملوک الذی ملکوا فی ادوم الذی	اور جو سلاطین پہلے ادوم پر حکمراں ہوئے
کان ملک علی تلک الارض من قبل	تھے وہ بالق بن باعور تھے اور ان کے پایۂ
یاتی ابن باعور واسم مدینة دنابا و من	تخت کا نام دنابا تھا، اس کے بعد یوباب
بعدہ یوباب (ایضاً ج ۲، ص ۳۱)	بادشاہ ہوئے۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ یہ عبارت عربی قواعد کی رو سے بھی غلط ہے اور مدینہ کی ضمیر یوباب کی طرف راجع کرنے سے فارسٹر کو غلطی ہوئی، یہ صریحاً غلط ہے جس کو عربی داں سمجھ سکتا ہے۔ (ارض القرآن ج ۲، ص ۳۲)

فاران کی بحث: وادی فاران کے سلسلہ میں مستشرقین میں باہم اختلاف رائے ہے، ان کو حقیقی طور سے یہ معلوم نہیں ہے کہ فاران کس مقام کا نام ہے، بعض نے جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں مصر سے متصل علاقہ کو فاران قرار دیا ہے، بعض نے کوہِ سینا کے دامن میں اس کو جگہ دی ہے لیکن اجماعی طور سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان مستشرقین کے خیال میں فاران کوہِ سینا میں واقع ہے، سید صاحب نے ان کی رائے کی غلطی اور اسلام کے دعوی کی صحت کو متعدد طریقوں سے واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''سب سے اول یہ سمجھنا چاہیے کہ عرب، حجاز، مکہ، کعبہ، یہ جتنے الفاظ و
اسماء ہیں اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، لفظ عرب دسویں صدی ق م
میں پیدا ہوا ہے، حجاز کا لفظ اس سے بھی زیادہ مستحدث ہے، مکہ کا نام
دوسری مسیحی میں بطلیموس کے ہاں سب سے پہلے مکاربا کی شکل میں نظر آتا
ہے، اسی لیے توراۃ نے اس مقام کا نام اولاً صرف مدبار رکھا ہے اور قرآن
نے اسی کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی زمین) کہا کہ اس کے سوا اس
وقت کوئی دوسرا نام نہ تھا، مدبار وادی غیر ذی زرع اور عرب ہم معنی لفظ
ہیں، اسی لیے توراۃ کا یہ کہنا کہ اسماعیل نے بادیہ میں سکونت کی، اس کے
بالکل یہ معنی ہیں کہ اس نے عرب میں سکونت کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ممالک عرب میں سے سب سے پہلا نام توراۃ
میں مدیان (مدین) نظر آتا ہے، فاران کی طرح مدین غیر معروف نہیں ہے،
شہر مدین تحقیقی اور یقینی طور سے حجاز میں ساحل بحر احمر و عقبہ کے سرے پر واقع
تھا اور اب تک اسی نام سے وہیں موجود ہے، قدیم تاریخ میں جہاں کہیں بھی
مدیانی لوگوں کا ذکر ہے ساتھ ہی اتحاد نام کے ساتھ اسماعیلیوں کا ذکر ہے،
بلکہ توراۃ نے اکثر دونوں کو ایک سمجھا ہے، یہ اتحاد حضرت ابراہیمؑ کی ایک ہی
پشت کے بعد توراۃ میں نظر آتا ہے۔'' (ایضاً ص ۴۸)

اس کے بعد سید صاحب نے توراۃ کی مختلف عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا
ہے کہ ان عبارتوں میں جو اختلاف اور تشابہ ہے، کیا اس کا حل بغیر اس کے ہوسکتا ہے کہ ان
لوگوں کو نسلاً اسماعیلی اور وطناً مدیانی یعنی حجازی فرض کیا جائے! اس کے علاوہ سید صاحب
نے توراۃ کے دوسرے حوالوں سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ فاران سے مراد ملک حجاز ہے ا
مستشرقین کے شکوک وشبہات ناروا ہیں۔ (جلد۲ص ۴۹)

سید صاحب مستشرقین کی محض غلط بیانیوں کی ہی تصحیح نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کی تحقیق اور تحریر میں اگر کہیں کوئی نقص یا کمی نظر آتی ہے تو اس کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں، مثلاً شاہان انباط کے سلسلہ میں تاریخ و آثار نے جو انکشاف حال بیان کیا، اس کی اعانت سے ڈوسے نام ایک فرانسیسی مستشرق نے بادشاہوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کی، یہ فہرست ۱۶۹ ق م سے شروع ہو کر ۱۰۶ء پر ختم ہوتی ہے، سید صاحب نے اس فہرست کو نقل کیا ہے اور اس میں ایک نام "مالک اول" کا اضافہ کیا ہے، یہ اضافہ انہوں نے مشہور یہودی مؤرخ یوسیفوس کے حوالہ سے کیا ہے۔ (جلد۲، صفحہ ۶۲)

قریش کی وجہ تسمیہ: خاندان قریش کے بانی کا نام فہر تھا اور لقب قریش تھا، قریش کے معنی متعدد ہیں، اس کا ایک ماخذ تقریش و تقرش ہے جس کے معنی "اکتساب و تحصیل" کے ہیں، چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ قریش کے نام سے موسوم ہوا لیکن قریش کا ایک لفظ دریائی درندہ جانور کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، فہر نے ممکن ہے اپنے غلبہ و استیلا اور طاقت و قوت کے اظہار کے لیے اس لقب کو اختیار کیا ہو، مستشرقین (مارگولیوتھ) نے اسی دوسری رائے کو پسند کیا، سید صاحب کہتے ہیں کہ یہ قبول روایت اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ روایۃً صحیح تر ہے بلکہ یہ اس لیے قبول کی گئی ہے کہ اس سے طوطمیت (ٹوٹزم) کے ثبوت کے لیے سند ہاتھ آتی ہے، (لائف آف مارگولیوتھ) حالانکہ اس کی تردید کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس خاندان میں قریش کے نام کی نہ پوجا ہوتی تھی نہ اس نام کا دیوتا پوجا جاتا تھا۔ (جلد۲، ص ۹۸)

نولدیکی: سید صاحبؒ نے ارض القرآن میں مستشرقین نولدیکی کے لیے داد تحسین کے الفاظ استعمال کیے ہیں، مثلاً اس کو یورپ کا سرمایۂ ناز محقق، محققین ترین مستشرق، محقق کبیر اور موجودہ یورپ میں مشرقی زبان و تاریخ کا سب سے بڑا فاضل وغیرہ وغیرہ کہا ہے، تاہم انہوں نے نولدیکی کی غلطی کی سخت گرفت کی ہے، ایک جگہ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ عاد و ثمود وغیرہ امم بائدہ کی زبان عربی آرامی تھی، شمالی عرب کے جن مقامات میں ثمود کی

سکونت ثابت ہوتی ہے، وہاں ایک خاص خط کے بہت سے کتبات پائے گئے ہیں جن کی زبان آرامی عربی ہے، زیادہ تر لوگ اس زبان کو ثمودی کہتے ہیں لیکن تھیوڈر نولدیکی ان کتبات کی زبان کو ثمودی کہنا پسند نہیں کرتا، ان کی دلیل یہ ہے:

> ''بہت قدیم زمانہ میں......شمالی عرب اپنی زبان کو قید تحریر میں لائے ......ان کتبات کا نام ثمودی ہے، کیونکہ وہ ثمود کے مقامات پر پائے گئے ہیں لیکن یہ وصف بہ مشکل مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جس زمانہ میں ثمود پوری ترقی پر تھے اور وہ مکانات جن کو قرآن نے بیان کیا ہے کہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنا رہے تھے، اس ملک کی زبان نبطی تھی۔'' (جلد ۲، ص ۱۴۳)

سید صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس کی دلیل غالباً نولدیکی کے پاس یہ ہوگی کہ حجر جو عام طور پر ثمود کا دارالحکومت سمجھا جاتا ہے وہاں کے عمارات کے کتبات کی زبان نبطی ہے......لیکن اس خیال کی غلطی ہم انباط کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں، ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ انباط کی یادگار ہیں، اس کو کون صاحب عقل تسلیم کر سکتا ہے کہ ایک طاقت ور قوم اپنے شباب اور ترقی کے عہد میں اپنی یادگاروں کے لیے غیر قومی زبان اختیار کر لے گی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثمود جب اپنی پوری ترقی پر تھے تو ملک کی زبان نبطی نہ تھی۔'' (ج ۲ ص ۱۴۴)

ڈوزی کی ایک رائے میں ترمیم: سید صاحب نے اسلام سے پہلے عرب کے مذاہب پر جو بحث کی ہے اس میں تفصیل کے ساتھ امم سامیہ کا مذہب، شہروں اور ہر ہر شہر کے معبودوں کے نام، سورج، چاند کی دیوتائی حیثیتیں اور پھر ان میں بھی بڑھنے والے اور گھٹنے والے چاند کی مختلف شکلوں میں ان کی معبودانہ حیثیت تمام قبائل عرب کے ممتاز معبودان کے علاوہ دیگر مذاہب کی عجیب و غریب تفصیل بیان کی گئی ہے اور اس میں جا بجا انسائیکلو پیڈیا کے ایک مؤلف

ایف ہومل کی تحریر کے اقتباسات دیے ہیں اور ان کے خیالات سے تعرض بھی نہیں کیا ہے، تاہم پروفیسر ڈوزی کے ایک نظریہ میں سید صاحب نے ذرا ترمیم کی ہے، پروفیسر ڈوزی نے مکہ میں بنی اسرائیل کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ بنی اسرائیل شام سے بھاگ کر حجاز کے شہر میں آ کر آباد ہو گئے اور کعبہ ان کا ہی بنایا ہوا معبد ہے جس کو انہوں نے ہبعل (بعل) دیوتا کے نام سے تعمیر کیا تھا، عربوں میں اسی دیوتا کا نام ہبل تھا اور جو (حضرت) محمدؐ کے زمانہ تک خانۂ کعبہ میں نصب تھا، سید صاحب ڈوزی کی اس رائے کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر موصوف کے اس نظریہ نے گو جرمنی کے اکثر یہودی علما میں برافروختگی پیدا کر دی لیکن ہم مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے اس رائے میں صرف اتنی ترمیم چاہتے ہیں کہ مکہ میں بنی اسرائیل نہیں بلکہ اسرائیل کے عم زاد بھائی بنی اسماعیل آ کر آباد ہوئے تھے، اس گھر کو بنی اسرائیل نے نہیں بلکہ ان کے دادا ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا، وہ ہبل کے نام سے نہیں بلکہ خدائے عزوجل کے نام سے بنایا گیا تھا۔'' (ج ۲ ص ۱۸۳)

عرب میں عیسائیت: عیسائیت کے زیر عنوان سید صاحب نے ایک بحث کی ہے، اس کے آخر میں وہ مستشرقین کے تضاد رائے پر لطیف طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عرب میں عیسائیوں کا کون سا فرقہ آباد تھا، خود عرب میں تو عیسائی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ سے ناپید ہیں، اس لیے عیسائیوں کا ہر فرقہ مدعی ہے کہ وہ ہمارے ہم مذہب تھے، ابوالفرج ملطی جو چھٹی صدی میں ایک یعقوبی العقیدہ، عرب عیسائی مورخ تھا، بوثوق تمام کہتا ہے کہ عرب تمام تر یعقوبی (جاگو بائیست) تھے، اس کی تاریخ کا عیسائی محشی جو بیروت کا ایک مشہور کیتھولک فاضل ہے، دعویٰ کرتا ہے کہ نہیں وہ کیتھولک تھے، کیونکہ کیتھولک رومیوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے، ڈریپر کا منشا

یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسطوری تھے، ہم کو حافظ کا یہ فیصلہ پسند ہے ع

بیا کایں داوریہارا بہ پیش داور اندازیم

(ایضاً، ج ۲، ص ۱۸۹)

دین حنیف: عرب کے مذاہب میں عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ ساتھ سید صاحب نے مجوسی اور صابی وغیرہ الفاظ سے بھی بحث کی ہے اور آخر میں ملت حنیف پر روشنی ڈالی ہے، حنیف کا لفظ حنف سے مشتق ہے اور حنف کے معنی ہٹنے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں، حالانکہ اسلام دین حق ہے، اس لیے اس کے معنی سیدھے کے ہونا چاہیے تھا، مستشرقین کو اعتراض کا عمدہ موقع ملا، چنانچہ مارگولیوتھ لکھتے ہیں کہ:

"سریانی میں اس کے (حنیف) معنی کافر کے اور عبرانی میں منافق کے ہیں، مقدس پیروان محمد نے اس کی لفظی تحقیق کی پرواہ نہیں کی۔"

(لائف آف محمد، مارگولیوتھ، بحوالہ ایضاً، ص ۲۰۹)

مارگولیوتھ کا یہ بھی مشورہ ہے کہ:

"مسلمان قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے نام کو اس لفظ کا ماخذ بنائیں، یعنی یہ کہ مسیلمہ سے مسلم اور حنیفہ سے حنیف لیا گیا ہے۔"

(ایضاً ص ۲۰۹)

سید صاحبؒ نے اس علمی بددیانتی پر پہلے تو سخت رائے کا اظہار کیا کہ:

"یورپ کے مشرقی تبحر کا ظرف بایں ہمہ ادعائے وسعت بہر حال تنگ ہے، اس لیے اس کی ہم کو شکایت نہیں کہ مایۂ ناز فرنگ نہ صرف آغازِ تاریخ اسلام سے نا آشنا بلکہ آئین زبان عرب سے بھی آگاہ نہیں، دنیا میں کس نے اپنا امتیازی لقب دشمن کے نام و خاندان پر رکھا ہے، اصل یہ ہے کہ نری عربی زبان دانی اور بات ہے اور اسلامی واقفیت اور چیز ہے۔

عشق بازاں دیگر اند و عشق سازاں دیگر اند آنچہ در فرہاد می بینم در پرویز نیست
(ایضاً ص ۲۰۹)

اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

اہل عرب کے نزدیک حنیف، حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا، اس لیے ان کے مذہب کا نام ملتِ حنیف رکھا گیا، عرب کے بعض نیک دل لوگ جو عرب کے تمام موجودہ مذاہب بت پرستی، یہودیت اور عیسائیت کے مفاسد سے گھبرا کر تلاش مذہب میں نکلتے تھے، وہ آخر اسی آستانہ دین حنیف پر آکر تسلی اور اطمینان پاتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۰۹)

اس کے بعد سید صاحب نے آٹھ صفحات پر حنیف کے لغوی معنی کی تحقیق کی ہے اور زبان و قرآن کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ حق کے متلاشی اور دین ابراہیم کے متبعین کے لیے یہ لفظ عام طور سے رائج تھا، جہاں تک اس کے لغوی معنی کا معاملہ ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''حنیف'' ''حنف'' سے مشتق ہے، عربی میں اس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں، اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے، یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہوسکتا ہے، اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی تو حنیف کے وہ معنی ہو سکتے ہیں جس میں عبرانی و سریانی میں وہ مستعمل ہے، یعنی کافر و منافق اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام کو ترک کر کے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس میں اہل عرب اس کو بولتے ہیں، یعنی دین دار اور خدا پرست، اس بنا پر اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تعیین موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی، اصل میں اس کا ابتدائی استعمال للہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، یعنی الحنیف للہ خدا کی طرف جھکنے والا اور الحنیف للدین، سچے مذہب

کی طرف جھکنے والا، کثرت استعمال اور زبان زدگی عام سے اس قید کی ضرورت نہیں رہی اور مطلق حنیف کے معنی بھی حنیف للہ اور حنیف للدین کے سمجھے جانے لگے، چنانچہ قرآن مجید میں دونوں طرح سے اس کا استعمال ہوا، حُنَفَآءَ لِلّٰہِ اور مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ حُنَفَآءَ۔" (ایضاً ص ۲۱۰)

اس انداز سے سید صاحب نے مستشرقین کے اعتراض بلکہ طنز کا مسکت جواب دے دیا اور ان کے علمی ظرف کی وسعت کو بھی ظاہر کر دیا۔

آخر میں مذکورہ بالا بحث کے دوران عرب میں شرک، بت پرستی اور دہریت کے بارہ میں ایک مفصل مضمون ہے جس میں عرب کے بتوں اور ان کے ناموں کی لغوی و معنوی تحقیق ہے، سید صاحب نے لات بت کی بحث کے موقع پر مستشرقین اور خصوصاً سیل اور مارگولیوتھ کے اس الزام کا ذکر کیا ہے کہ:

"اللہ اور اللات ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں، اللہ مذکر دیوتا کے لیے قریش میں مستعمل تھا اور اللات یعنی دیوی، اس لفظ اللہ کی قریش نے تانیث بنائی تھی۔" (ایضاً ص ۲۲۶)

سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

"ان عقلمندوں سے پوچھنا چاہیے کہ اللہ کی تانیث، عربی قواعد کے مطابق اللات کیونکر ہو سکتی ہے، اس کی تانیث اگر ممکن ہو تو اللٰہۃ ہونا چاہیے یا الآلہۃ، اللہ کی ہائے اصلی کیونکر تانیث سے ساقط ہو گئی، اگر ہمارا مشورہ مستحق قبول ہو تو اس زمانہ میں لفظ کی پیدائش کے لیے عربی کی خشک سرزمین کے بجائے ملک شام کا سرسبز علاقہ مناسب ہوگا، کیونکہ عرب کے اکثر دیوتا ملک شام ہی کے باشندے تھے، یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہیروڈٹس مؤرخ نے مسیح سے چار سو برس پہلے عرب کے ایک دیوتا کا نام لیلات بتایا

ہے، حالانکہ اس وقت قریش کا وجود نہیں تھا، اس لیے ان کی زبان کا لفظ بھی اس وقت موجود نہیں ہو سکتا۔" (ایضاً ص ۲۲۷)

اس کے بعد انہوں نے اس لفظ کی لغوی و تاریخی تحقیق میں یہ ثابت کیا کہ لات، لَتّ سے مشتق ہے، جس کے معنی گھولنے کے ہیں (اردو میں اسی سے لتنا یا لت کرنا بنا ہے) واقعہ یہ ہے کہ عرب میں ایک شخص تھا جو زمانہ حج میں ایک چٹان پر بیٹھ کر ستو گھول گھول کر حاجیوں کو پلاتا تھا، اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے اسی چٹان کو پوجنا شروع کر دیا اور اس کا نام لات یعنی گھولنے والا رکھا۔ (ایضاً ص ۲۲۷)

اس کے علاوہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"قدیم سامی زبانوں میں خدائی کے لیے ال یا ایل کا لفظ عام طور سے موجود تھا، تائے تانیث لگنے سے ایلوت ہو گیا، جس کے معنی دیوی کے ہوں گے، عربوں نے جب اس لفظ کو اختیار کیا تو اپنا الف لام تعریفی اس پر اضافہ کیا اور پہلے الف کو اپنے قاعدہ کے مطابق جیسا کہ اللہ میں ہوا ہے، گرا کر اللوات بنا لیا اور اس سے اللات ہو گیا، لات کا نام نبطی کتبات میں ایلات کی صورت میں ملا ہے۔" (ایضاً ص ۲۲۷)

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ کیا اس فیلالوجی کو ہمارے یورپین محققین پسند کرتے ہیں؟ لفظ اللہ کے متعلق مارگولیوتھ کی تحقیق یہ ہے کہ:

یہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا، اس لیے محمدؐ کی توحید پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوایا (ایضاً ص ۲۲۷)

اس اعتراض کی لغویت اور زہرناکی عبارت سے ہی ظاہر ہے، سید صاحب ہر بات کو تحقیق کی میزان و معیار پر رکھتے تھے، اس لیے اس بے سروپا دعوی سے ان کے جذبۂ تحقیق کو ٹھیس لگنا ضروری تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''یہ یورپ کے مشرقی تبحر علمی کی شرمناک مثال ہے۔'' (ایضاً ص ۲۲۷)

اور پھر جواب دیتے ہیں:

''پہلا سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں ''حقیقی خدا'' کے مفہوم کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں تھا، تم کہتے ہو کہ محمدؐ سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے۔

بہتر ہے لیکن کیا وہ اپنے خدا کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ پیش کرتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیان کے مطابق عرب میں بکثرت عیسائی شعرا پیدا ہوئے ہیں، ہاں سچ ہے، لیکن کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سنا؟ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفات خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کیے ہیں، وہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں؟ سب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل تو الالہ ہے، الہ تو صرف عربی میں نہیں بلکہ تمام سامی زبانوں میں خدائے تعالیٰ ہی کے لیے مستعمل ہے، کم از کم الوۃ اور الوہیم سے تو ناواقفیت نہیں ہوگی، قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بنا کر پوجتے تھے، کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں مجسمہ تھا۔'' (ایضاً ص ۲۲۸)

ہم یہیں اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، سید صاحب نے بالقصد مستشرقین کے جواب نہیں دیے بلکہ ارض القرآن کی تحقیق میں اگر کسی مستشرق کی غلطی، غلط بیانی اور غلط اندیشی نظر آئی تو تسلسل مضمون کے ساتھ اس کا بھی جواب آگیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے مستشرقین کی رایوں کی بنیاد پر ضرب پڑی ہے اور اس کے بعد وہ ساری عمارت ہی ناقص اور کمزور ہو کر رہ گئی جو انہوں نے اسلام اور تاریخ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بلند کی، مستشرقین کے اعتراضات کو سید صاحبؒ نے حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن ہم نے اس مضمون میں صرف تاریخ ارض القرآن کے صفحات کے درج کردہ حوالوں کو دینا ہی مناسب سمجھا ہے۔

سر سید احمد خاں اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دار المصنّفین

۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے برسر اقتدار ہوتے ہی عیسائی مشنریوں نے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کر دیا تو ان کے مقابلہ میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بحث و مناظرہ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دیں، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے وجود تو ردعیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہ تھا، ان عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پیہم حملے کر کے یورپ میں اور پھر ہندوستان میں بھی اسلام کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، دوسری جانب یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں، جن کو جدید اسلوب میں دور کرنے کی ضرورت تھی، مستشرقین بھی علمی انداز میں اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے، ان الجھنوں کو دور کرتے اور مستشرقین کے اعتراضوں کا جواب دینے کے لیے جو لوگ ہندوستان میں آگے بڑھے ان میں سر سید احمد خاں مرحوم پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے زمانہ میں سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی تو یہ دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب

عیسائی مشنریوں کی مدد کے لیے تیار کی گئی تھی، چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

''پادری فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے مباحثے میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی، اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو، ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں۔''

(خطبات احمدیہ، ص ۱۷)

سر ولیم میور اضلاع شمال مغرب (یو، پی) کے لفٹنٹ گورنر تھے، جب کہ سر سید احمد خاں بنارس میں منصفی (جج اسمال کاز کورٹ) کے منصب پر تھے، سر ولیم میور اور دوسرے انگریز افسروں سے دوستانہ مراسم کے علاوہ وہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ چکے تھے جس سے وہ بدنام ہوئے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں، انہوں نے ''احکام طعام اہل کتاب'' لکھی، جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی روابط استوار کرنے کی ترغیب دی، اس لیے وہ ''کرسٹان'' سمجھے جانے لگے تھے اور علما کا ایک گروہ ان سے بہت بدظن ہو چکا تھا لیکن سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' شائع ہوئی تو ان کی حمیت اسلامی بھڑک اٹھی، اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی سر ولیم میور کو بری، بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں تو اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے وہ بے چین ہو گئے، وہ اکثر اس کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ ''اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں'' (حیات جاوید حصہ دوم، ص ۱۲۰)

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہو چکے تھے اور سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ یہاں دستیاب نہ تھیں، اس لیے سر سید کو ولایت جانے کا خیال ہوا، چنانچہ وہ بعض سرکاری عہدیداروں کے منع کرنے کے باوجود

یورپ گئے، اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال دیا، برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کی پرواہ نہیں کی، سیاسی مصلحتوں کو نظر انداز کیا، ان کے لڑکے سید محمود لندن تعلیم کے لیے بھیجے جانے والے تھے، ان کے سرکاری وظیفہ کا مسئلہ درپیش تھا، اس کا بھی خیال نہیں کیا اور وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے لندن پہنچ گئے، انڈیا آفس کے کتب خانہ اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے استفادہ کے علاوہ سیر و تاریخ کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں، وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں، بہت گراں قدر قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ اسیز (Essays) یعنی خطبے لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شائع کیا (حیات جاوید ص ۱۲۰) اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں اپنے جذبات اور مالی مشکلات کے بارے میں انگلستان سے مولوی سید مہدی علی خاں یعنی محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے، ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر اور بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں۔''
>
> (حیات جاوید ص ۱۲۱)

ایک اور خط میں یہ لکھتے ہیں کہ ''مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا، ملنا جلنا سب بند ہے، آپ اس خط کے پہنچنے پر...... کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض لیجیے...... ہزار روپے

بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو...... کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے، خدا مدد کرے۔"

ایک اور خط میں یہ لکھا ہے کہ میں شب و روز تحریر کتاب میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے، ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا ہے، روپیہ کہاں سے آئے گا۔" (حیات جاوید ص ۱۲۱)

خطبات احمدیہ کی جلد اول تمام ہوئی تو اس کی طباعت میں چار ہزار کے قریب لاگت آئی، کچھ روپے ان کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے روانہ کیے اور کچھ انہوں نے دوسروں سے قرض لیے، یہاں تک کہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہ تھا اور وہ نہایت پریشان تھے، اسی عرصہ میں ان کی صاحبزادی یعنی ہمشیرۂ حامد و محمود کا انتقال ہو گیا، کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اخراجات نے اور زیادہ فکر مند بنا رکھا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ "جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا۔ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر (حیات جاوید ص ۱۲۰)

وہ اس کتاب کی تالیف کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے، حصۂ اول کی تکمیل پر ایک خط میں اپنی کتاب کی غرض و غایت اس طرح بیان کرتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو، اگر وہ کہے

کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔"

(حیات جاوید ص ۱۲۳)

مستشرقین کی تردید میں

خطبات احمدیہ کا امتیاز: لاہور ڈیونٹی کالج کے پرنسپل ریورنڈ ہوپر نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا کہ:

"ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے، وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے، ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جا کر انہی کی زبان میں وعظ کہتے اور ان ہی کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے، میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برسوں میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔" (حیات جاوید ص ۱۲۴)

اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناظرہ کے مخاصمانہ طریق کے بجائے دوستانہ اور غیر متعصّبانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مخاطب کو خاموش کرنے کے لیے الزامی جواب دینے کے بجائے اس کو مطمئن کرنے کی راہ اپنائی گئی ہے اور تحقیقی جوابات دیے گئے ہیں، چنانچہ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کے اس امتیاز کا اعتراف کیا ہے، ان کے خیال میں اس کتاب سے "مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب" ظاہر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"جو لوگ مذہبی باتوں میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں، دین محمدی انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک

غیر معقول دین ہے اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں اور
ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے
لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں جب سید احمد خاں کی
اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے
خیالات لے کر اٹھیں گے، ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے
دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کی تحریروں کی مخالفت
کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور
نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ
دینے میں اتفاق کریں گے۔" (حیات جاوید ص ۱۲۶)

سر ولیم میور سے پہلے مستشرقین اسلام کے روحانی اور الہامی پہلو پر اپنا زور تحقیق صرف کر رہے تھے لیکن اس نے تاریخی شہادتوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات، جدید دور کی شائستگی، تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف ہیں، اس نے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا، (خطبات احمدیہ ص ۲۳۷) یہ نکتہ چینی کا ایک نیا طریقہ تھا جس میں غیر مستند روایتوں، کمزور تاریخی داستانوں اور رطب ویابس واقعات سے جن کے بیان کرنے والے خواہ کم رتبہ اور غیر معتبر ہوں، مدد لی گئی تھی، سر سید مرحوم نے دو طویل خطبوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں اور ان کی روایتوں کی تفصیل بیان کی ہے، روایات کی تنقید کے جو اصول وقواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں اور جو معیار انہوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے ان کی تشریح کی ہے جس سے سر ولیم میور کے استدلال کی ساری عمارتیں منہدم ہو جاتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات میں مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال و کردار جن کے نتائج وہ آج بھگت رہے ہیں ان کے جواب وہ خود

سلمان ہیں نہ کہ اسلام، انہوں نے سر ولیم میور کے مغالطوں کا نہایت معقول دلائل اور
بنشیں پیرائے میں جواب دیا ہے۔(خطبات احمدیہ،ص ۲۹۲)

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کی سادگی، عام فہم انداز بیان اور منصفانہ
طریق استدلال ہے، وہ اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے اپنی شرافت، نرم خوئی اور
ہمدردانہ لب ولہجہ کو برقرار رکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ ہی میں چند مستشرقین کا
ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"(میں) ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مؤرخوں
کا ذکر کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، جنہوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل
بغیر تعصب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور مذہب اسلام کی
نسبت ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے، بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں
کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں
انہوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کیے ہیں لیکن صاف معلوم
ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت
وہ نہیں سمجھے، یا غلط سمجھ گئے۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۰)

انہوں نے اپنی کتاب میں مختلف موقعوں پر مستشرقین کے اقوال بھی اسلام کی
حمایت میں نقل کیے ہیں۔

خطبات احمدیہ کی ایک اور خصوصیت جس کا مولانا الطاف حسین حالی نے بھی
حیات جاوید (ص ۱۶۷) میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان خطبات میں کوئی بات ایسی نہیں
جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے، سوائے دو ایک مسئلوں کے جہاں
بعض محققین نے بھی وہی لکھا ہے جس کو سر سید احمد خاں نے ترجیح دی ہے، مثلاً معراج کے
واقعہ کو جیسا کہ بعض صحابہ کا مسلک ہے، انہوں نے رویا پر محمول کیا ہے اور شق صدر اور براق

کی سواری کو بھی اسی رویا میں داخل کیا ہے، یا ایک آدھ بات اور، ورنہ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ تک سرسید مرحوم نے وہ بحثیں نہ کی تھیں جو ان کی تفسیر القرآن میں ملتی ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مذہبی خیالات پر اعتراضات کیے گئے، خطبات احمدیہ میں انہوں نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علما ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی اور اس نے اگر ایک طرف مستشرقین کے گروہ کو اور صاف ذہن عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ اور مطمئن کیا تو دوسری طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے بارہ میں مختلف غلط فہمیوں کے دور کرنے میں مدد دی۔

مستشرقین کے اعتراضات

اور ان کے جوابات: سرسید مرحوم نے مستشرقین کے اعتراضات کے جو جوابات دیے ہیں ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہیں، انہوں نے اپنی اس کتاب میں سر ولیم میور کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے خیالات کا بھی جابجا تجزیہ کیا ہے، مستشرقین نے سب سے پہلے تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبی وابستگی کا انکار کیا ہے، وہ مکہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت سے بھی انکار کرتے ہیں، قیدار کی عدنان سے اور عدنان کی حضرت اسمٰعیلؑ سے نسبت خاندانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور اس بارے میں عربوں کی علم الانساب میں مہارت اور واقفیت کو مشکوک قرار دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ توراۃ میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں ان سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مراد نہیں ہے۔

سرسید مرحوم نے بائبل کے فارسی ترجمہ سے توراۃ کی پیشین گوئی نقل کی ہے لیکن ہم یہاں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۵۸ء سے اردو ترجمہ درج کرتے ہیں

''اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے، جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس کی بات مان، کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے ٥ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا، سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی ٥ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ٥ اور آپ اس کے مقابل پر ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں، سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی ٥ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے ٥ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ٥ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا ٥

اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس
کے لیے بیوی لی ○ (پیدائش باب ۲۱ ورس ۹-۲۱)

مذکورۂ بالا پیشین گوئی واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دے رہی ہے، اسی لیے سر ولیم میور اور بعض اور مستشرقین نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے نہ تھے، حضرت اسماعیلؑ یا ان کی اولاد مکہ میں آباد نہیں ہوئی اور فاران سے حجاز کی وادی یا مکہ کو مراد لینا درست نہیں۔

فاران: سر سید مرحوم نے سر ولیم کو جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ:

"عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بہ مقام لگڈنی بٹاورم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے اور وہ عبارت یہ ہے "وسکن فی بریة فران (الحجاز) واخذت له امه امرأة من ارض مصر" (عربی ترجمہ توراۃ سامری) (خطبات احمدیہ ص ۱۱۲)

اس کے بعد وہ وضاحت کرتے ہیں کہ "عموماً عیسائی مؤرخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد ہے، تسلیم نہیں کرتے، اس کے تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو اس بات کو تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے، بلا شبہ اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا مراد ہے۔"
(ایضاً ص ۱۱۲)

فاران سے ایک قول کے مطابق وہ وسیع قطعۂ زمین مراد ہے جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے اور فاران کے نام سے مشہور ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں: شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر، اس میں

بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علاحدہ علاحدہ ناموں سے معروف ہیں، مثلاً شور، بیرشبع، ایثام، سین، زین، عیدام وغیرہ لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں:

> ''اس بیان کی تردید کے لیے.........اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ.........توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دیں، کیونکہ ان سے صاف منکشف ہو جاتا ہے کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے اور گرد و نواح کے بیابان اس میں شامل نہیں۔
>
> (الف) تب بنی اسرائیل دشت سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا، (گنتی باب ۱۰ ورس ۱۲) اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا اور بیابان فاران میں مقام کیا، قرار واقعی ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علاحدہ اور جداگانہ بیابان تھے۔
>
> (ب) اور چودھویں برس کدرلاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور فائیم کو عستارات قرنیم میں اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ سعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے ○ (پیدائش باب ۱۴ ورس ۵ تا ۷) پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علاحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے اس ورس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۱۵)

مزید وضاحت کے لیے وہ توراۃ سے درج ذیل اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں:

> (ج) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ○ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں، ان کے باپ دادا کے

ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جو ان کے ہاں کا رئیس ہو ٥ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران سے ایسے آدمی روانہ کیے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (گنتی باب ۱۳ ورس ۱ تا ۳)

(د) اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی اور اس ملک کا پھل ان کو دکھایا۔ (گنتی باب ۱۳ ورس ۲۶)

(ہ) اور اس نے کہا، خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں (فارسی ترجمہ: با ہزار ہزاراں) قدسیوں میں سے آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔

(استثنا باب ۳۳ ورس ۲)

(و) خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے، سلاہ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ (حبقوق باب ۳ ورس ۲)

(ز) اور وہ مدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لے کر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے۔ (سلاطین باب ۱۱ ورس ۱۸)

فاران کے بارے میں بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک کنواں بیر شیع کھودا تھا اور فاران ایک ہی جگہ ہے، سر سید مرحوم نے اس قول کی تردید میں (گنتی باب ۱۳ ورس ۲۶) کے علاوہ تورات کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے:

"اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے، پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی قادس پہنچے اور عمالیقوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے، مارا۔"

(پیدائش باب ۱۴ ورس ۷، ۸)

وہ لکھتے ہیں کہ (مذکورہ بالا اقتباس میں) جب تک قادیش اور فاران دو جداگانہ اور مختلف بیابان نہ قرار دیے جائیں ورس مذکورہ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ (ایضاً ص ۱۱۶)

فاران کے بارے میں تیسری بات مسٹر روپر وغیرہ کی بیان کردہ یہ ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاو پر واقع ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آکر ٹھہرے تھے اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسماعیلؑ متوطن ہوئے تھے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسماعیلؑ وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر تکوین (پیدائش) میں آیا ہے، سرسید مرحوم نے مذکورہ بالا رائے کی بھی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ''کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت اسماعیلؑ نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی، ریورنڈ مسٹر فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت اسماعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں، مصنف موصوف نے سفر تکوین (پیدائش) باب ۲۵ ورس ۱۸ پر جس کی یہ عبارت ہے ''اور اس کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی'' سے استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ ''خدائے تعالیٰ کے وعدے اسی میں ایفا ہو گئے تھے، جب کہ اسماعیلیوں کی آبادی سور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں سرحد مصر سے لے کر دہانہائے فرات تک پھیل گئی تھی'' اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو جو دہانہائے فرات پر قرار دیا ہے، اصل حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب ۱۰ ورس ۲۹ میں مذکور ہے، نواح یمن میں عرض بلد شمالی ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ اور طول بلد شرقی ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ پر واقع ہے اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنے سے ہو سکتی ہے جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے،

وا کر صاحب کے نقشۂ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیرِ نظر رکھنا چاہیے جن کا نقشہ رورنڈ کارٹرٹ پی کیرے، ایم، اے، نے مرتب کیا ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید میں "شور" کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے جہاں صحرائے ایثام واقع ہے اور یہ قطعی غلطی ہے، کیونکہ صحرائے "شور" سے توریت مقدس میں مراد تمام وہ وسیع میدان ہے جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے۔" اس کے بعد وہ اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:

> "اصل عربی توریت میں صرف دو نام ہیں، شور اور اشورہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں، ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسیریا ہے، اس سے واضح ہے کہ بنی اسماعیل اس وسیع قطعے میں آباد ہوئے تھے جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے، یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے، ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے، اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی جانب عزیمت کرے اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے "جو کہ سامنے مصر کے ہے، اگر تو اسیریا کی طرف روانہ ہو" یعنی مصر کے سامنے ہے اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسیریا تک کھینچو۔"
>
> (خطبات احمدیہ، ص ۱۱۹)

انہوں نے کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع فاران کے بارے میں تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی کتب خمسہ میں ان کا کچھ بھی ذکر نہیں (۲۲) سینا سے بنی اسرائیل کا سفر مشرق کی جانب تھا، جس میں انہوں نے پہلی منزل تبعیرہ (گنتی باب ۱۱ ورس ۳) میں کی،

پھر قبروت ہتاواہ آئے اور وہاں سے مصروت پہنچے (گنتی باب ۱۱ ورس ۳۴، ۳۵) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے، (باب ۱۲ اور س ۱۶) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے، اس لیے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰ کا سفر شمالی اور مشرقی سمت میں تھا، یعنی قادیش کی طرف (باب ۱۳ اور س ۲۶) اس لیے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰ نے کیا ہے، سینا کے مغربی جانب نہیں ہوسکتا، بنی اسرائیل کی صحرانوردی کے عیسائی علما نے پانچ مختلف راستے بتائے ہیں جن کے اختلاف کی صورت میں:

"اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا ہے، جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ مشرقی مورخ بھی اسی کے مؤید ہیں، تب حضرت موسیٰ کے کوچ کے تمام بیان کی تطبیق ہو جاتی ہے اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۱۲۵)

توریت (پیدائش باب ۲۱ ورس ۱۴-۱۵) سے یہ بات سمجھنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ہاجرہؑ بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو دیا تھا ان کے پاس تھا اور وہی ختم ہو گیا تھا، سر سید مرحوم کے نزدیک دو وجہ سے اس ورس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں، اول اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیمؑ نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصہ دراز تک رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کا کنووں کا ہونا، حضرت ہاجرہؑ سے پوشیدہ نہ تھا، دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا، کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے بنائے ہوئے کنویں نہیں تھے بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کیے ہوئے بھی موجود تھے، (پیدائش باب ۲۶ ورس ۱۸ تا ۲۲) سر سید مرحوم کے نزدیک اس عبارت کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ:

"مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہؑ بیابان شبع میں پھرتی رہیں مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا، کیونکہ بیر شبع کے اردگرد...... قومیں .....لڑاکا اور جھگڑالو تھیں ،......اس لیے حضرت ہاجرہؑ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں .....لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہوگی ، کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت نایاب تھا...... جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے تو ان کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا ......خانہ بدوش عرب پانی کے چشمے کو...... چھپا دیتے تھے......جس وقت ہاجرہؑ مضطربانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا، توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے "پھر خدا نے اس کی آنکھیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا" (پیدائش باب ۲۱ ورس ۱۹) ......بہرحال حضرت ہاجرہؑ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا، رہنا شروع کیا، جب اور لوگوں کو اس چشمے کی خبر ہوئی تو بنو جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قرب و جوار میں آ کر آباد ہوئے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۱۲۹)

سرسید مرحوم بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی اولاد در اولاد کی مختلف نسلوں اور ان کی متعدد شاخوں سے بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ تمام تلاش و تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی، اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار یمن (حویلاہ) سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں اور اس طرح پر حضرت موسیٰؑ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۸ میں مندرج ہے کہ "وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے جو سامنے مصر کے ہے جب تو اسیریا کو روانہ ہو۔" (ایضاً ص ۱۴۱)

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ: تورات کتاب پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۰ میں ہے ''تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے، کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا'' کئی مستشرقین نے حضرت اسماعیلؑ کے نسب نامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ ظاہر ہے اور یہودی بھی حضرت اسماعیلؑ کی والدہ کو لونڈی کہتے تھے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسماعیلؑ کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں اور ضد وعداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسماعیل، بنی اسرائیل کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جائیں، منسوب کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہؓ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے جو سرتاپا غلط اور تحریف کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس بحث کا نسب نامۂ نبوی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لیے سر سید مرحوم نے مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کی تحقیقات پر مشتمل ایک نفیس بحث بھی درج کتاب کی ہے، چند اہم نکات یہ ہیں:

> ۱۔ انہوں نے سِفر اشعیا سے جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے، یہ نقل کیا ہے کہ بابل کا ایک باشندہ رقیون تنگ دست اور مفلس تھا، جس نے مصر کی راہ لی، بادشاہ مصر نے اس کی قدر دانی کی، اعیان سلطنت میں اس کا اثر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ہوگیا، یہ پہلا شخص ہے جس نے فرعون کا لقب اختیار کیا، پھر قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ اپنے گھر والوں کے ساتھ مصر گئے تو اس نے حضرت سارہؓ سے نکاح کرنا چاہا، مگر پھر باز رہا اور اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہؓ کو حضرت ابراہیم کے نکاح میں دے دیا، رقیون عبرانی زبان کا لفظ ہے، اسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا اصل عبرانی نام ہاغا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ بادشاہ مصری النسب نہ تھا بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے قبیلہ سے نسبت رکھتا تھا، چنانچہ اس

کے پاس حضرت ابراہیمؑ بڑے اعزاز اور سامان و ہدایا کے ساتھ روانہ ہوئے۔" (پیدائش باب ۱۳ ورس ۱-۶)

۲۔ مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہؑ کو بادشاہ مصر کی بیٹی لکھتے ہیں، چنانچہ دوبلی شلوو اسحٰق نے کتاب پیدائش باب ۱۶ آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ (سر سید مرحوم نے اصل عبرانی تحریر اور اس کے عربی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل اردو ترجمہ بھی تحریر کیا ہے):

"وہ فرعون کی بیٹی تھی، جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہو کر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ۔"

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لونڈی میراث نہیں پاتی تھی، تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہؑ کو یہی اندیشہ تھا کہ حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ کے ساتھ میراث پائیں گے، چنانچہ انہوں نے ہاجرہؑ کو الگ کر دینے کی درخواست کی اور انہوں نے ہاجرہؑ کو جو لونڈی کہا تو یہ غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے تھا، جس سے دیگر تصریحات کی موجودگی میں استدلال کرنا درست نہیں، تورات میں اور دوسرے مقامات پر حضرت ہاجرہؑ کے لیے شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خادمہ اور قبیلہ کی عورت کے ہیں، تورات (سمول باب ۲۵ آیت ۴۱) میں حضرت داؤدؑ کی بیوی کے بارے میں جو زوجہ شرعی تھیں، شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا ترجمہ اگرچہ لونڈی کیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ آزاد تھیں اور یہ لفظ ان کے لیے خادمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، (خطبات، ص ۱۶۳-۱۷۵) سر سید مرحوم کے نزدیک:

"توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہؑ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے، نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر جو ہم نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح پر ہوتے تھے، شرا (خریداری) سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام

ہوتے تھے جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے اور شبوث حرب کہلاتے تھے، یعنی
غنیمت جنگ حیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے جو خریدے جاتے تھے
اور ان کو مقتث کشف کہتے تھے، یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھے،
یلید بایث ولید البیت یعنی خانہ زاد، مگر حضرت ہاجرہؑ ان باتوں سے پاک
تھیں، پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں، ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔"
(ایضاً ص ۱۶۷)

عربوں کا علم الانساب اور اس کی اہمیت: حضرت ابراہیمؑ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی رشتہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے مستشرقین نے عربوں کے علم الانساب پر بھی اعتراضات کیے ہیں، جن کو سرسید مرحوم نے "ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے" سے تعبیر کیا ہے، کہا یہ گیا ہے کہ:

"اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضروری نہیں ہے کہ ان کے انساب کا
علم یا روایت خود ان قوموں میں بجنسہٖ چلی آتی ہے...... یہ بات بالکل بعید
از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جس کے پاس کوئی تحریری
یادداشت نہیں ہے، ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور
برقرار رہی ہو۔" (خطبات احمدیہ ص ۳۸)

سرسید مرحوم نے اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے بارے میں ہیں وہ نہایت معتبر ہیں، کیونکہ "عرب اپنے آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بدرجۂ غایت پابند تھے اور اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا جدا نام رکھتا تھا اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلے کو بخوبی جانتا تھا اور اپنے حسب ونسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا، لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کا ان کے حسب نسب کا

جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا" انہوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی تحریر بھی پیش کی ہے، وہ اپنے جغرافیہ عرب میں لکھتے ہیں کہ "عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص و عام ہے، تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے، (خطبات احمدیہ ص ۳۶) پھر سرسید مرحوم یہ بیان کرتے ہیں کہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے، ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل ذریعوں سے ہوسکتا ہے، میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب ونسب بہ آواز بلند بیان کرے، تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا، کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا، جب کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا جو اب شرع میں بلفظ الدیة علی العاقلہ مستعمل ہے، اس قسم کے رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر اعتماد قائم ہوا اور برقرار رہا، وہ اپنی طویل بحث کے اختتام (ایضاً، ص ۱۳۷) پر ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قول فیصل نقل کرتے ہیں کہ:

"محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مؤیدہ شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو، مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریحاً غیر ممکن ہے، خود عربوں کے ہاں زمانہ نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداءً حجاز میں آباد ہوئے تھے، اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے

محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے دعووں کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسماعیلؑ کی اولاد قیدار کے سلسلہ سے تھی، ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ تاریخی روایت کے پائے کو پہنچ جاتا ہے، جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے جن سے قیدار کے اسی حصۂ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری جانب اریانوس، بطلیموس، پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیدڑی، درانی، کدرون تائی، یا کدیتی کی موجودگی کے غیر مشتبہ اور نا قابل اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔" (جغرافیۂ تاریخی جلد ا، صفحہ ۲۴۸)

اسلام کے ذریعہ دین کی تکمیل: اپنی کتاب کے تیسرے خطبہ میں سرسید مرحوم نے ان مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے اور یہ بتایا ہے کہ اسلام مختلف معاملات میں کن کن مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا اور اس کو حیرت انگیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعۃً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر دیا" اس کے بعد انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام نے عرب کے مختلف عیسائی مذاہب میں کیا اصلاحات کیں، ان کی کن باتوں کو برقرار رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی، اس کے بعد عیسائیوں کا یہ اعتراض "کہ اسلام درحقیقت اصول وعقائد متفرقہ ومنتشرۂ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے" پیش کرنے کے بعد اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ:

"یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کے سب سے بڑی دلیل ہے، تمام

چیزیں جن کا مبدأ ایک ہی غیر منتہیٰ اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں، مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے، جنھوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا، جنھوں نے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے باایمان متبعین کے لیے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیے۔"

(خطبات احمدیہ، ص ۲۲۴)

صدائے جنگ: سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اسلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں جس پر سر سید مرحوم نے یہ لکھ کر بجا طور پر ان کی تحسین کی ہے کہ "سر ولیم میور ایک نہایت دین دار عیسائی ہیں اور جب تک علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے" اس کے بعد شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ سر ولیم میور کے خیالات نقل کیے ہیں لیکن اس درمیان "اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی" کے جملہ پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سر ولیم میور کی اس تحریر پر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا، بلکہ اس سچے وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے، جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پرتاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا اور نہ

صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔"

(خطبات احمدیہ ص ۲۲۶)

ایڈورڈ گبن: سرسید احمد مرحوم نے ایڈورڈ گبن کی تحریریں بھی اپنی تائید میں بڑی فراخ دلی سے نقل کی ہیں لیکن وہ ان پر گرفت بھی کرتے جاتے ہیں، ایک جگہ وہ گبن کے اس جملہ پر چونک پڑے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں" اس پر ان لفظوں میں تبصرہ کرتے ہیں:

"انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے، ان دیکھی، ان چھوئی، ان چکھی، ان سمجھی چیز کیوں کر سمجھ میں آسکتی ہے، جس چیز کے لیے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہو، وہ کیوں کر بیان ہو سکتی ہے، کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتلائی جا سکتی ہے، یہ تمام امور محالات سے ہیں، پس وحی یا الہام ان کو کیونکر بیان کر سکتا ہے، سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے: "لا اعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر" پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی موذی چیز ہے اور کچھ نہیں بتا سکتا، سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہو سکتا ہے، نہ عقبیٰ کی واقعی اور محبوب و موذی چیز پر، اس لیے تمام انبیا نے دنیا ہی کی محبوب چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان ہے، موسیٰ یہی فرمایا کیے کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا، غلہ پیدا ہوگا، وبا نہ ہوگی، گناہ کرو گے تو

قحط پڑے گا، وبا پھیلے گی۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۲۹)

چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات: سر ولیم میور نے اسلام کے چند معاشرتی مسائل پر یہ اعتراضات کیے ہیں کہ مذہب اسلام سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، اول یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا، طلاق دینا اور غلام بنالینا وہ باتیں ہیں جو علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں، دوم یہ کہ مذہبی آزادی روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کر دی گئی ہے، تحمل کا نام و نشان بھی نہیں دکھائی دیتا، سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور اس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے۔

(خطبات احمدیہ ص ۲۳۷)

سر سید مرحوم کے خیال میں عیسائی مصنفین مسلمانوں کی مخالفت میں سنجیدگی اور نیک نیتی کو برقرار نہیں رکھ سکے، اپنے عیب چینی کے مصمم ارادہ کی وجہ سے وہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے سکے کہ آب و ہوا، مرد و عورت کی تعداد اور مختلف طبعی اسباب کا گہرا اثر معاشرتی حالات پر پڑتا ہے۔

تعدد ازدواج: سر سید احمد خاں کی نظر میں اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا مسلمانوں پر لازمی یا کچھ زیادہ کار ثواب کی بات ہے، حالانکہ یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن کو مختلف اسباب طبعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو، اس کے بعد وہ قانون قدرت، باہمی معاشرت اور مذہب کی رو سے مسئلہ ازدواج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "پہلے ہم اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دریافت کریں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا، پس ہم قانون قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ

جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی
مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک نر اور
ایک مادہ پیدا ہوتا ہے، برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مادائیں
ہونی مقصود ہیں، ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور اس بات کا
کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادہ کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی
معلوم ہوتا ہے کہ جو جاندار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں وہ اکثر
بلکہ تقریباً سب اسی قسم کے ہیں، پس اس قانون قدرت کے بموجب
انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے، مگر (چونکہ) وہ تمام مخلوقات سے
اشرف ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق قدرت نے
اس کو عطا کیے ہیں ان کو احتیاط سے اور موقع بہ موقع بہ لحاظ امور طبعی اور
حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ملکی
تاثیرات آب و ہوا کے کام میں لائے، پس جیسے کہ کثرت ازدواج اکثر
حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی
التزام خلاف فطرت ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۲۳۹)

تعدد ازدواج کے معاشرتی پہلو کو سرسید نے تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا خلاصہ
یہ ہے: انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، اسی بات کو تورات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ
"جب خدائے تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اس
نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا اور وہ عورت ہے جو اس کے واسطے پیدا کی گئی ہے
کہ انسان کی زندگی فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو اور مرد کے ساتھ شریک ہو کر
اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ "بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے، مگر جب وہ کسی سبب
سے ان قدرتی فرائض کی ادائیگی میں قاصر ہو تو اس نقصان کے رفع کرنے کی تدبیر اس کے

سوا اور کوئی نہیں کہ ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں بیویاں رکھنے کی اجازت ہو یا پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری سے نکاح کر لے، یہ حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو یہ حق ہے، مگر سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے مگر عورت کو پہلے قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے، اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا، تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس ضرورت کا کم ہونا تو ممکن ہے لیکن اس کا مٹنا محالات سے ہے، اس لیے جہاں ضرورت ہو وہاں اس پر عمل پیرا نہ ہونے سے نقصانات ہوں گے جو حسن معاشرت کے لیے سم قاتل ہیں، (خطبات احمدیہ ص ۲۴۱) سر سید مرحوم نے تعدد ازدواج کی تائید میں دو مستشرقین کی یہ آرا بھی نقل کی ہیں کہ:

> ''گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں ضرورت ہے کہ تعدد ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جائے'' (مسٹر مانٹیگو) ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے، جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے، اگر یہ بات سچ ہے تو بانی اسلامؐ کے لیے اس بات کی کہ انہوں نے کئی بیویوں کی اجازت دی، ایک بڑی وجہ تھی۔''
>
> (سر ڈبلیو اوسلی)

لیکن ان مذکورہ بالا تائیدی آرا سے سر سید کو کامل اتفاق نہیں جس پر وہ ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازدواج پر صرف

امور طبعی کے لحاظ سے نظر کی ہے مگر اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امور طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی تلخیوں اور مقاصد تزوج کے فوت ہوجانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدمؑ و حواؑ کے پیدا کرنے والے کی اس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔"

(خطبات احمدیہ ص ۲۴۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب اور اس کے گرد ونواح میں نکاح و شادی سے متعلق بہت سی اخلاقی خرابیاں پائی جاتی تھیں، سرسید مرحوم کے بقول ایران میں قوانین طلاق بالائے طاق رکھ دیے گئے تھے اور رشتہ داری کا پاس ولحاظ نہیں تھا، یہاں تک کہ بیٹے کو اس کی ماں ایسے ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن، یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشۂ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعدد ازدواج کی رسم کسی قید اور حد کے بغیر بے روک ٹوک جاری تھی، عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں جاری تھیں، تعدد ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں، عیسائیوں کا حال ان سب کے برعکس تھا، ان کے یہاں ایک بیوی کرنی بھی کچھ نیکی شمار نہ ہوتی، بلکہ رہبانیت اور تجرد محض کی عام ہدایت تھی اور مرد وعورت دونوں کے لیے یہی نیکی کا کام تصور کیا جاتا، ایسے زمانہ میں جب کہ عقل ودل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اخلاق ومعاشرت اس قدر بگڑ چکی تھی، اسلام نے ایسا عمدہ قانون جاری کیا جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے نہایت کامل، عقل کامل کے بالکل مطابق، انسان کی تندرستی، بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن ومرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔ (خطبات احمدیہ، ص ۲۴۴)

سر سید مرحوم نے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تعدد ازدواج کا جائزہ لیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازدواج کو روکا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے، یہودیوں کے ہاں بکثرت اور بلا تعیین حد ازدواج موجود ہے، عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی، چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے، حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی نظیر پر جو خدا کی مرضی پر چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی ان بیس انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام کو قلم بند کرنے کے لیے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی" جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے" (ایضاً، ص ۲۴۵) اس کے بعد سر سید مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

> "اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے، ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو، اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی

جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا، اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنگالنا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں، پس ایسے افعال پر اسلام کی خوبی وحقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔" (خطبات احمدیہ ملخصاً ص ۲۴۹)

طلاق: سر ولیم میور نے اسلام میں اجازت طلاق کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا ہے، جس کے جواب میں سر سید مرحوم اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا لیکن اس کے باوجود:

"اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد وعورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے بطور ایک علاج کے، اسی حالت میں اس کی طرف رجوع کرنا جائز ہوسکتا ہے جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ قابل برداشت ہوں اور ایسے ترددات وتفکرات جو طلاق سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور رنجشیں پیدا کرنے والے ہوں دور ہوسکتے ہوں، اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے ایسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔" (ایضاً ص ۲۵۱)

انہوں نے طلاق کے بارے میں یہودی اور عیسائی مذاہب کے طرز عمل کا بھی جائزہ لے کر یہ واضح کیا ہے کہ یہودیوں کے یہاں طلاق دینا، کسی شرط وقید کے بغیر مرد کے

اختیار میں تھا، وہ جب چاہتا طلاق لکھ کر بیوی کو دے دیتا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا، حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں، سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا، یہ ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی، اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں تو حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج دہ امور زن وشوہر میں واقع ہو کر تمام ازدواجی مقاصد کی بربادی کا سبب بنتے ہیں اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے، اس صورت میں تو زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے، چنانچہ جان ملٹن نے بائبل کی مختلف آیتوں سے طلاق کے جواز پر استدلال کیا ہے، نہ کہ اس کی ممانعت پر جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں، سرسید جان ملٹن کی یہ پوری بحث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے ورسوں (آیتوں) پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے، کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق بطور معجون مفرح استعمال کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک لاعلاج مرض کا علاج ہے، مگر زن وشوہر کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اگر اس میں بیماری پیدا ہو جائے تو سوائے انہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے، اس لیے اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے، نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار پیدا ہوئی تھی۔'' (خطبات، ص ۲۶۰)

سر سید احمد خاں نے ان تعلیمات نبوی کو بھی نقل کیا ہے، جن میں مرد و عورت کی اخلاقی تربیت اور زن و شوہر میں یکجہتی اور محبت وانس کی ہدایات اور تدبیریں بتائی گئی ہیں اور جن میں طلاق سے امکانی حد تک بچنے اور مجبوری کی صورت میں سوچ سمجھ کر مناسب وقفوں میں تدریج کے ساتھ تفریق کی اس کارروائی کو روبہ کار لانے کی ہدایت کی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے، مہربانی اور خاطر داری سے پیش آنے، ان کی سختی اور بدمزاجی کو برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کو روکنے کے لیے ہیں، اپنی اس بحث کے اختتام پر وہ بڑی جرأت کے ساتھ لیکن ہمدردانہ لب ولہجہ میں یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:

> ''اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں، یا کم ہو جائیں اور بغیر اس کے حالت معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو، وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی، ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے، پس ان کے افعال کی نفریں انہی پر ہونی چاہیے نہ کہ مذہب اسلام پر، جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لیے اس کا جوڑ پیدا کیا تا کہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۲۶۳)

غلامی: سر ولیم میور کا ایک اعتراض اسلام میں غلامی کے مسئلہ پر بھی ہے جس کے جواب میں سر سید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

> ''اگر اس معاملہ میں مذہبی طور پر نظر کی جائے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اس کی نسبت کچھ اعتراض کریں، کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جس میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰ کا یا اس زمانے کے رسم و رواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۲۶۴)

عیسائیوں کے یہاں غلامی کا رواج اس قدر تھا کہ بقول گاڈ فری ہیگنز ''انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے، مثلاً اس میں جہاں کہیں لفظ ''سروس'' یا ''دولوس'' پایا جاتا ہے، اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے وہاں اس کا ترجمہ ''غلام'' ہونا چاہیے، لفظ ''سروس'' کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو اور ''فریڈ یثین'' ہمارے اجورہ دار اور خدمت گار کے ہم معنی ہے لیکن اگر بد قسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دے دی جائے تو اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے (ایضاً ص ۲۶۵)

گاڈ فری ہیگنز یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مگر حضرت محمدؐ (جنہوں نے غلامی کے مٹانے کے لیے نہایت عمدہ ترکیبیں کیں) وہ تھے جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے تھے، حضرت محمدؐ تو فرماتے ہیں کہ ایسے غلاموں کو جو ہم سے اس مضمون کی ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کر دیں تا کہ اپنے آپ کو آزاد کر لیں

تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھ دو، اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے ان کو دو" گاڈ فری ہیگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا، (ایضاً ص ۲۶۷) لیکن سر سید مرحوم کا خیال ہے کہ:

> "جو لوگ تقلید کی تاریکی میں اندھے پھر رہے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور خوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے (ایضاً ص ۲۶۷) اسلام لانے سے غلامی ساقط ہو جانے پر جو استدلال گاڈ فری ہیگنز نے کیا ہے، ہم کو دل سے اس پر اتفاق ہے، خدائے تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں صاف صاف فرمایا ہے کہ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ) سب ایمان لانے والے آپس میں بھائی بھائی ہیں...... اور اس لیے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا، یہی اخوت اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مر جاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لیے چلا جاتا ہے، کتابت کا جو ذکر گاڈ فری ہیگنز صاحب نے کیا ہے وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو بلکہ اس کا کرنا واجب تھا اور انکار کرنا قابل سزا تھا، چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے حضرت انسؓ سے جب کتابت کی درخواست کی تو انہوں نے انکار کیا، ابن سیرین نے وہ مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے...... خط آزادی بمعاوضہ حضرت انسؓ سے لکھوا دیا......
>
> (ایضاً، ص ۲۶۹)

سر سید غلاموں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے بخاری کی یہ

روایت بھی درج کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمہاری خدمت کرتے ہیں، تمہارے کاموں کو سنوارتے ہیں، اللہ نے ان کو تمہارا تابع کر دیا ہے، پس جو شخص کہ اس کا بھائی اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اس کو کھلاوے اور جو آپ پہنتا ہے اس میں سے اس کو پہناوے اور ان سے ایسی تکلیف کے کام نہ لے جو ان کو تھکا دیں اور اگر ایسی تکلیف کا کام ان کو دیا جائے جو ان کو تھکا دے تو خود ان کی مدد کرے۔ (بخاری باب قول النبیؐ العبید اخوانکم، ص ۳۶۴) اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ:

''اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانے میں اپنے غلاموں کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے اور ایک خوان میں اپنے ساتھ وہی کھانا ان کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سوار ہوتے تھے اور باری باری نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے، خلیفہ عمرؓ اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلستی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو گھسیٹتے ہوئے کمال خوشی سمجھتے تھے، فاطمہؓ پیغمبرؐ کی بیٹی اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں، کبھی ان کا دست مبارک ہتھے کو نیچے سے تھامتا تھا اور کبھی لونڈی کا، تا کہ دونوں کو برابر محنت پڑے، پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کو ابتر بنانے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے، ایسی

غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زائد از حد ترقی متصور ہے، پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں مروج تھی، قیاس کرنا غلطی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا بلکہ ان کی نسبت لونڈی وغلام کے لفظ کے استعمال کو بھی جس سے ان کی حقارت نکلتی تھی منع فرمایا اور نہایت شائستہ، مہذب وشفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی، علاوہ اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۷۱-۲۶۹)

جو لوگ قدیم رسم جاہلیت کے مطابق غلام ہو چکے تھے، زر معاوضہ لیے بغیر ان کو بطور احسان کے آزاد کرنے کا حکم اسلام نے نہیں دیا، وہ بدستور ان لوگوں کی ملک میں رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے، اس کی کیا وجہ تھی؟ سر سید مرحوم اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اگر کوئی ناسمجھ یہ الزام مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعۃً کیوں نہ آزاد کر دیا تو اس کی اس ناسمجھی کا ہمارے پاس کچھ علاج نہیں ہے مگر اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں، اس قدر تو ضرور تسلی ہوگی کہ ان بدنصیبوں کی بھی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے اور ایسا رحم و شفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے مثل و بے نظیر ہے اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں اور طرح

طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں، ہاں بلا شبہ جو سمجھ دار اور دانشور لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے، ان کی آزادی کا دفعۃً حکم دے دینا محالات عملی سے تھا اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آئندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جاوے اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے، پس یہی کام اسلام نے کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے۔'' (خطبات احمدیہ، ص۲۷۲)

قرآن مجید کی آیت (فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا............فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ......محمد ۴۷:۴) کی تفسیر میں علما نے دو مختلف راہیں اختیار کی ہیں، اہل کفر سے مقابلہ میں اگر کچھ قیدی ہاتھ آ جائیں تو بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کو صرف اسی وقت چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہو کر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں اور بعضوں کی رائے یہ ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے اور کوئی شرط ان پر نہ لگائی جائے اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں رہیں یا اگر چاہیں تو اپنے ملک میں چلے جائیں، سر سید مرحوم کے خیال میں یہی رائے بظاہر معقول اور زیادہ مستند معتبر اور صحیح ہے کہ قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینے میں کوئی قید اور شرط نہیں لگائی گئی ہے، (ایضاً، ص۲۷۴) وہ سر ولیم میور کو یہ جواب دیتے ہیں کہ:

''بقول مسٹر ہیگنز کے گو حضرت مسیحؑ نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد رحمۃ اللعالمین نے غلامی کو بالکل موقوف کر دیا، تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا اور جو قدیم

زمانے کے بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی اور جن رسموں کو اس بڑے مقدس مقنن موسیٰؑ نے بھی بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا اور جن کو حضرت مسیحؑ نے بھی نہیں توڑا تھا اور جن کو حضرت مسیحؑ کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا دفعۃً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسموں اور مطول قانونوں کو ایک دو لفظ کے فرمانے سے کہ ''اَمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً'' مٹا دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست   کتب خانہ چند ملت بشست

(قرآن مجید میں کافروں کے مغلوب ہو جانے پر ان کے قید کرنے کے حکم کا مقصد ان کی جان بچانا ہے اور قید کرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے، ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے ان سے فدیہ لے کر چھوڑنے میں، جب دو حکم دیے جاتے ہیں تو دونوں میں سے ایک کا بجالانا واجب ہوتا ہے، یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں، پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عمل درآمد کرنا واجب ہے، ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے دیئے، رِقِیَّت یعنی قیدیوں کا لونڈی اور غلام بنانا بالکل نیست و نابود ہو گیا ہے، ہاں یہ بات ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو اس وقت تک اس کو قید رکھے مگر وہ قیدی بدستور ایک قیدی ہوگا اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا تو درحقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی اور اسی لیے پہلے حکم کی تعمیل واجب ہوگی۔''

(خطبات احمدیہ، ص ۴۷۳-۲۷۴)

عیسائی قوموں میں غلامی کا رواج پہلے بھی تھا اور اس وقت بھی بعض ملکوں

میں ان کے ہاں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے، سرسید مرحوم کے زمانہ میں کچھ پس ماندہ مسلم ریاستوں میں بھی اس ''رواج'' کی خبریں ملا کرتی تھیں، چنانچہ وہ اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''جس نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (اور بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر ہم اس خطبے کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا، خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینے میں'' (ایضاً ص ۲۷۵)

اسلام میں آزادیٔ رائے: سر ولیم میور کے نزدیک ''اسلام میں مذہب کے بارے میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے بلکہ بالکل معدوم کر دی گئی ہے'' مگر سر سید مرحوم فرماتے ہیں کہ سر ولیم میور کی اس رائے کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادی رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے اور دوسرے مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے جو اس آزادی کی اجازت دیتی ہے۔

یہودی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر لفظ اپنے تاریخی مضامین سمیت باوجود اس کے کہ ان کے مصنف بھی معلوم نہیں، وحی آسمانی ہیں اور اس لیے سہو و خطا و غلطی سے بالاتر ہیں اور ہر ایک انسان کو کسی تامل یا کسی حجت یا اپنے قوائے عقلیہ کا استعمال کیے بغیر ان کے حق ہونے پر یقین کرنا چاہیے۔

کتب مقدسہ کے بارے میں عیسائیوں کے دو فرقے ہیں، ایک وہ جو کتاب مقدس کے تمام و کمال وحی ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور دوسرا وہ جو صرف اس کے ایک حصہ کو جو مسائل

واحکام سے متعلق ہے، وحی سمجھتا ہے اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا، مگر اس اختلاف سے قطع نظر ان سب کے لیے دو بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے جن کی وجہ سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور پر نیست و نابود ہو جاتی ہے، اس لیے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں، وہ دو مسئلے یہ ہیں:

ایک مسئلہ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا ہے، یہ ایک عجیب مسئلہ ہے جس کی نسبت عقل کا کام میں لانا منع ہے، خدا کے تین مقدس جسموں کے اظہار کے لیے تثلیث کا لفظ دوسری صدی عیسوی تک (جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اس کو ایجاد کیا) جاری نہیں ہوا تھا اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل نائس یا نائسا میں بھی (جو حضرت عیسیٰؑ کے ۳۲۵ برس بعد ہوئی تھی اور جس میں ایریس کے مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا) طے نہیں ہوا تھا اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ بارسن اور دوسرے مشہور و معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس سے خاص اس مسئلہ میں استدلال کیا جاتا ہے الحاقی ہے، پس اگر نہایت عجیب و مشکل اور خلاف عقل مسائل پر یقین کر لینے ہی کو اعتقاد کی خوبی قرار دیا جائے تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا اور کسی کے لیے عیسائی کہلانے اور خدا کی بارگاہ میں عیسائیوں کی طرح حقوق حاصل کرنے سے پہلے اس عجیب و غریب مسئلہ پر پختہ یقین کرنا لازمی ہوگا، بقول سرسید احمد خاں:

> ''تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل کے بالکل برخلاف ہے، تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار و معطل چھوڑ کر، نہایت اصرار و تعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے، دلیل و عقل کو اس میں دخل دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔'' (خطبات احمدیہ ص ۲۷۷)

دوسرا مسئلہ فدیہ کا، یعنی حضرت عیسیٰؑ کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آئندہ گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے اور یہ بات قدرت اور

عقل دونوں کے برخلاف ہے جس سے معاملات مذہبی میں آزادی رائے بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا، اس کے لیے بدی اور بداخلاقی کے دروازے کھل جاتے ہیں، کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہو گا (ایضاً ص ۲۷۷) بہر حال یہودی اور عیسائی مذاہب میں آزادی رائے کے معدوم ہونے بلکہ خلاف عقل عقیدہ رکھنے کی کسی قدر تفصیل کے بعد سرسید مرحوم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ:

"مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے بالکل برخلاف ہے، بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بے نظیر ہے اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں...... ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب خصوصاً مذہب عیسائی کے فیاض اور دانش مند، بے تعصب معتقدوں کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں، مشہور و معروف فرانسیسی عالم ایم ڈی سینٹ ہلیر نے لکھا ہے کہ "اسلام میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور اعجوبہ کے نہیں ہے، مذہب اسلام خود اس بات کا مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشید کیا جائے اور اگر اب تک اس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے، کیونکہ وہ ابتدا ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۲۷۹)

انہوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ دین محمدیؐ کے رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت راویوں اور روایت کے مضمون کی نسبت آزادانہ تحقیقات اور بے تعصّبانہ رائے

اور تحقیق کے بعد نا معتبر ٹھہرا۔ نے کا ہر شخص کو کلیۃً اختیار ہے، جو روایتیں کہ غور وفکر اور نہایت تحمل اور بردباری سے تحقیق کے بعد عقل اور قدرت کے خلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں، یا جو روایتیں اور حدیثیں بے سند ہوں ان سب کو رد کر دینے کا کلیۃً مجاز ہے، قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں، مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، ہم نے قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی اس کی سچائی ثابت ہونے پر ہی مانا ہے، مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اس میں پاوے اس پر عمل کرے، اسلام میں ایسی قوت کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے، مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت نہیں ہے کہ اس کا جو سب سے بڑا اصول ہے، یعنی خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت، وہ بھی عقل کی مداخلت کے بغیر، اندھا دھند اعتقاد اور بے سمجھے غلامانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ خود قرآن مجید میں اس بڑے مسئلہ کو جبر و سختی و نا سمجھی سے نہیں بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے، قرآن مجید میں سب سے پہلے خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے اور اس کے بعد اس لازوال ہستی اور ہمہ راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے، پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقے پر بیان کی ہیں، پس امور مذہبی میں جیسی آزادیٔ رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔

(ایضاً ص ۸۸-۲۸۰ ملخصاً)

تلوار کی کاٹ: اسلام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کو قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے مگر جیسا کہ سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

"(یہ اعتراض) منجملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام

ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر کیے ہیں، یا وہ مذہب

اسلام سے ناواقف ہیں، یا وہ حق پوشی کی نظر سے دیدہ ودانستہ یا ندھے ہیں، اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے اور دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا، یہ خیال کہ اسلام زبردستی اور تلوار سے پھیلایا جاتا ہے، قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے بالکل برخلاف ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ ''دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے کیونکہ سیدھی راہ گمراہی سے علانیہ کھل گئی ہے۔'' (بقرہ:۲۵۷)

جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے، اس وقت بلا شبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے مگر اسی وقت تک جہاں تک یہ مقصد حاصل ہو جائے، تاکہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ و تلقین خدائے واحد کا جلال لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیں...... ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے، نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے، وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ تنہا اسی مقصد کے حاصل ہوتے ہی تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو، جس اصول پر حضرت موسیٰؑ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثنا کے قتل و غارت و نیست و نابود کر دیں، اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا، اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں

> کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا۔" (ایضاً ص ۹۰-۲۸۸)

دوسرے مذہبوں کے لیے آزادی: ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کو آزادی نہیں دی گئی ہے، چنانچہ سرسید یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کا استعمال محدود مقاصد کے لیے تھا اور وہ یہ کہ مسلمان امن سے رہیں، خدائے واحد کی پرستش کیا کریں، خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں اور اپنے چال چلن اور عادت و عبادت و محبت و ہمدردی سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلا دیں اور اس کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

ایک ہی مذہب ہو جائے اور لوگ مسلمان ہو جائیں جیسا کہ مدینہ میں ہوا، دوسری صورت یہ ہے کہ صلح رہے، کفار فرائض مذہبی کی ادائیگی پر معترض نہ ہوں جیسا کہ ابتداءً مکہ میں تھا، یا جس طرح کہ مسلمان حبشہ میں ہجرت کے بعد امن سے رہے، یا کسی جنگ کی صورت میں کفار صلح کے طور پر یہ تسلیم کر لیں کہ مسلمانوں کو ملک میں رہنے، آمد و رفت رکھنے، ان کی جان و مال کی حفاظت اور فرائض مذہبی کی ادائیگی میں ان پر معترض نہ ہوں گے، تیسری صورت یہ ہے کہ ملک فتح ہو جائے اور فرائض مذہبی کی ادائیگی اور اعلائے کلمۃ اللہ پر مسلمانوں سے تعرض کرنے کی کسی میں کوئی طاقت ہی باقی نہ رہے، اس کے بعد جیسا کہ سرسید مرحوم نے تصریح کی ہے:

> "ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، ہر شخص کو آزادی حاصل رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہنچائے اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے۔" (ایضاً ص ۲۹۱)

سر سید اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ ''مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا'' مگر وہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے، بلکہ ہم کو یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ انہوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں، اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہوگی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے، مگر وہ مسلمان فتح مند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے، چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرف دار ہو، اسپین کے علم تواریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے جس میں یہ ہے کہ:

> ''اسپین کے بنی امیہ خلفا کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات بیان کے قابل ہے، کیونکہ اس سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانے تک ان کے بادشاہوں میں بڑی خوبی پائی جاتی ہے، یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی دینا۔'' (ایضاً ص ۲۹۲)

مذکورۂ بالا اعتراض کے جواب میں سر سید نے ایک مسیحی عالم گاڈفری ہیگنز کی یہ رائے بھی درج کی ہے کہ ''کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت، یہ عجیب زعم اور محض ریاکاری ہے، وہ کون تھا (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے اس لیے جلاوطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب نہیں قبول کرتے تھے اور وہ کون تھا (عیسائی) جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دے دیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے، مسلمانوں نے اس کے برخلاف یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے

ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور ان کے مذہب ان کے پادریوں اور ان کے بشپ، ان کے بزرگوں، ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے، جو لڑائی بالفعل (یعنی مسٹر ہیگنز کی اس تحریر کے زمانہ میں) یونانیوں اور ترکیوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ویمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے، یونانی اور حبشی اپنے فتح مندوں کی اطاعت سے آزاد ہونا چاہتے ہیں اور ان کا ایسا کرنا واجب ہے، جب کبھی خلیفہ فتح یاب ہوتے تھے اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے تو فوراً ان کا رتبہ بالکل فتح مندوں کے برابر ہو جاتا تھا، ایک نہایت دانشمند عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ''وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش وخرم تھے'' گاڈفری ہیگنز نے اسپین سے مور مسلمانوں کے جلاوطن کیے جانے کے بارے میں ایک دلچسپ مگر حقیقت پسندانہ بات یہ بھی لکھی ہے کہ:

> ''اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلاوطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ اس کا سبب کچھ اور ہی تھا، یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی سمجھتے تھے کہ ان دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا، جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی، ایرانی، اسپین، خواہ ہندو قتل نہیں کیے جاتے تھے جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب بہ امن و امان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیے جاتے تھے اور اس پچھلے

حق کی بابت ایک محصول دیتے جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا، خلفا کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ عیسائیوں میں مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال بھی ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے سبب چلا گیا ہو، نہ مجھ کو یقین ہے کہ زمانہ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا۔" (ایضاً ص ۲۹۵)

جزیہ کے بارے میں

ہیگنز کے خیال کی تردید: ابھی مذکورۂ بالا اقتباس میں گاڈفری ہیگنز کا ایک فقرہ یہ تھا کہ (مفتوح قوم کے غیر مسلم) پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے، اس جملہ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم رعایا کو اپنے مذہب پر باقی رہنے کی وجہ سے اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا، حالانکہ جزیہ کی یہ توجیہ درست نہیں، چنانچہ سرسید احمد خاں مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مسٹر ہیگنز نے یہاں غلطی کی ہے، کافروں میں جو مفتوح ہو جاتے ہیں اس معاوضہ میں کہ ان کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے، جزیہ نہیں لیا جاتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بے تنخواہ یا قلیل تنخواہ پر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کیے جاتے اور حکومت اسلامی کے قائم رکھنے اور امن و امان کے بحال رہنے کے گورنمنٹ کے مقصد اور غرض میں کوئی خدمت بجا نہیں لاتے، بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ و امن کی ذمہ دار ہوتی ہے، ان سب باتوں کے معاوضہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے بلکہ خلیفہ کو ملکی مصلحت کے پیش نظر بالکل اختیار ہے چاہے لے، چاہے نہ لے، پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے،

نہ کہ مذہب سے، مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول ہے، یعنی
ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔'' (ایضاً ص ۲۹۴ حاشیہ)

اسلام کی دی ہوئی مذہبی آزادی اور عیسائیوں کا طرز عمل: اسلام میں دوسرے مذہبوں کو آزادی دی گئی ہے لیکن اس کے برخلاف عیسائیوں کا طرز عمل بڑا افسوس ناک رہا ہے، چنانچہ جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب ''اپالوجی'' میں لکھا ہے کہ ''نائسا کی کونسل میں کانسٹنٹائن نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس سے نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے، یعنی خوں ریزی اور بربادی، ان احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے قریباً دو سو برس تک ترکوں پر کیے تھے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، ان لوگوں کا قتل جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ انسان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیروؤں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا، وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی نے دیا، فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا اور چالیس برس تک اور دوسری بہت سی خوں ریزیوں کا ہونا، فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک، عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جو اب تک قابل نفریں ہے، کیونکہ وہ عدالت کے حکم سے ہوا تھا، اس کے علاوہ دوسری بے انتہا بدعتوں اور ان بیس برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے، زہر دے کر یا دوسرے طریقوں سے قتل کی وارداتیں، تیرہ چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعوے جو ہر قسم کے گناہ، عیب اور بدکاری میں ایک تیرو یا ایک کیلیکیولا سے بڑھ کر تھے اور آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہونا، ایک ایسا مکروہ اور تقریباً ایک غیر منقطع مذہبی لڑائیوں کا سلسلہ جس کے بارے میں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ چودہ سو برس تک

سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا اور جن قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے، ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بنیاد پر نہیں بہایا۔ (ایضاً ص ۲۹۷)

لیکن عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں کا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا، اس کے بارے میں سرسیدؒ نے مشہور مورخ گبن کا یہ اعتراف درج کیا ہے کہ:

''آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں، ان سے خلفا نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی...... ملک عرب میں جو حضرت محمدؐ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا، بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والے اور بت پرست جو ان کو نہ مانتے تھے، شرعاً نیست و نابود کیے جا سکتے تھے مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی، ہندوستان کے مسلمان فتح مندوں نے اس مرتاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا۔''

(خطبات احمدیہ ص ۲۹۸)

وہ ایک دوسرے مصنف کے آرٹیکل سے جو ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں شائع ہوا تھا، یہ اقتباس بھی پیش کرتے ہیں کہ:

''اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت، مخالف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کر دینے کا قصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کو جاری کرنا چاہا مگر ان کو بہ زور جاری نہیں کیا، اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتح مندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے اور مفتوحہ سلطنتیں ان شرائط سے بھی آزاد

ہو جاتی تھیں جو ہر ایک فتح مند نے ابتدا سے حضرت محمدؐ کے زمانہ تک ہمیشہ قرار دی تھیں، یہی مصنف مزید یہ بھی لکھتا ہے "فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں" اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔" (ایضاً ص ۲۹۹)

مندرجہ بالا اقتباسات پیش کرنے کے بعد سر سید فرماتے ہیں کہ:

"اب دیکھو کہ بہت سے طرفدار، فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی یہ رائیں سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے سے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے، کتنی مختلف ہیں۔"

(خطبات احمدیہ، ص ۳۰۰)

سر سید نے مذکورہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ان وسیع تر فائدوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اسلام کی وجہ سے دوسرے مذاہب کو پہنچے، اس نے دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جو ناقص اور نامکمل پہلو رہ گئے تھے ان کی تکمیل کی، اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی پیغمبروں اور پاکیزہ لوگوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ کو منسوب کرتے تھے جن کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا، اسلام نے ان خدا پرست لوگوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا اور ان کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا اعلان کیا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کیا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹیوں، حضرت اسحاقؑ، حضرت یہودؑ، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹیوں اور حضرت ہارونؑ و داؤدؑ و سلیمانؑ وغیرہ کی ان کے ہاں باوجود نبی ماننے، مذہبی رہنما تسلیم کرنے اور مقدس جاننے کے ایسی تصویر پیش کی جاتی تھی جیسے کہ وہ مجرم جن کو دائم الحبس کرکے

کالے پانی بھیجتے ہیں، یا ان کے گناہوں کی سزا کے لیے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں، یہ صرف اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے، یہود، عیسائیوں کے مقدس بزرگوں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کے منکر، مخالف اور دشمن تھے، جن کی طرف سے اسلام نے صفائی پیش کی جو عیسائیوں پر ایک بڑا احسان ہے، اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات سے نجات دی اور عیسائیوں میں زندگی کی روح پھونک دی، ورنہ آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیں، درحقیقت لوتھر نے اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی جس پر اس کے مخالف اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا، تاہم اس نے اپنی کوششوں کو نہیں چھوڑا اور آخر کار وہ عظیم الشان اصلاح کرنے پر قادر ہوا جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبعیت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے آزاد کر دیا، ہم کو یقین ہے کہ اگر "لوتھر مقدس" اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جس کو درحقیقت حضرت عیسیٰؑ نے تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اس نبی آخر الزماںؐ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا، پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے۔ (ایضاً ص ۳۰۱)

کچھ مذہبی کتابوں کے بارے میں: ابتدائے عہد اسلام تدوین علوم کا دور تھا جس میں ہر طرح کے علوم وفنون کی تدوین ہوئی، کچھ لوگوں نے ثقہ راویوں کے بیانات قلم بند کیے، کچھ نے ثقہ اور غیر ثقہ، صادق وکاذب ہر طرح کے راویوں سے حاصل کردہ معلومات یکجا کر دیں اور ان کے راویوں کا ذکر بھی درج کتاب کر دیا، کچھ مصنّفین کی غرض نہ تو کسی قصے کی تصدیق تھی اور نہ کسی روایت کی اصلیت کی تحقیق، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقعہ کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے اس کو لکھ لیں اور ایک جگہ جمع کر دیں اور ان قصوں کی

صحت یا عدم صحت کی چھان بین پڑھنے والے کی جاں فشانی اور تحقیق ورائے پر چھوڑ دیں، بعد کے علما نے متن اور راویوں پر نظر کر کے صحیح، ضعیف اور موضوع روایتوں کے الگ الگ مجموعے تیار کیے اور راویوں کے حالات میں مفصل کتابیں تحریر کیں جس کی وجہ سے اب صحیح اور غلط کی تمیز کا کام آسان ہو گیا اور یہ واضح ہو گیا کہ کون سی کتابیں اور کون کون سے راوی معتبر ہیں اور کون غیر معتبر، روایت کے قبول کرنے کے بارے میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

> ''جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں ان میں سے کم سے کم مندرجۂ ذیل امور کا ضرور لحاظ ہونا چاہیے، راوی نے صاف اور صریح طور پر بیان کر دیا ہو کہ فلاں بات پیغمبرِ خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی، سلسلہ راویوں کا پیغمبر خدا تک غیر منقطع (یعنی مسلسل) ہو، پیغمبر خدا سے لے کر اخیر راوی تک جملہ راوی تقویٰ اور تدین اور نیک اعمال کے لیے مشہور ہوں، ہر راوی کو اپنے ماسبق راوی سے زیادہ حدیثیں پہنچی ہوں، ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہو، تاکہ یہ امر متیقن ہو جائے کہ اس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہوگا اور دوسروں کو بھی ٹھیک طور سے سمجھا دیا ہوگا، وہ قرآن مجید میں درج احکام یا قرآن مجید سے معلوم ہونے والے مذہبی عقائد یا مستند حدیث کے مضمون سے متناقض (مخالف) نہ ہو، اس میں عجائب وغرائب دور از عقل بیان نہ ہوں بلکہ مفہوم حدیث ایسا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو، کوئی حدیث جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جائے کسی عقیدۂ مذہبی کی بنیاد بن سکتی ہے لیکن اگر وہ حدیث ایک ہی شخص کی روایت ہے تو مفید یقین (یعنی عقیدہ کی بنیاد) نہیں ہو سکتی بلکہ افادۂ ظن کرتی ہے۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۳۵۴)

اسی بنا پر علمائے اسلام نے احادیث کی قسمیں، ان کے درجات، قبول کی شرطیں،

کتب احادیث کی تفصیل، ان کے درجہ و معیار کی وضاحت، راویوں کی قسمیں، ان کے تفصیلی حالات، سب ہی پر کام کیا ہے اور حق اور ناحق، صحیح اور غلط کی تمیز، قرآنی احکام، قرآنی عقائد، مستند احادیث اور غیر معتبر روایات پر اتنا زبردست کام ہوا ہے کہ اب مسلم اور غیر مسلم محقق کے لیے اصلیت کا پتہ لگانا کچھ بھی دشوار نہیں مگر مستشرقین رطب و یابس میں تمیز نہیں کرتے اور نہ ہی راویوں کے حالات اور روایت کے معیار سے کچھ غرض رکھتے ہیں، بلکہ وہ بقول سر سید مرحوم:

"ہمارے جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر سے ان حالات کو منتخب کرنے میں یورپین مصنفوں نے اس قدر تحملانہ تحقیقات کو اختیار نہیں کیا ہے جو اس مضمون کی عظمت کے شایان ہے، بلکہ برخلاف اس کے بغض اور تعصب کی وجہ سے انہوں نے دیدہ و دانستہ اس روشنی سے آنکھ چرائی ہے جس کی شعاعیں ان کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں اور اس طرح پر انہوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ "کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے کہ وہ لوگ جو ارادۃً نہیں دیکھتے۔" (ایضاً ص ۳۲۲)

مقدس جھوٹ: غلط روایات کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں علمائے اسلام اور علمائے مسیحیت یا مستشرقین کے درمیان ایک بنیادی فرق سر سید مرحوم کے نزدیک یہ بھی ہے کہ:

"علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو کبھی اپنے عقائد میں قرار نہیں دیا، بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے اور اس لیے انہوں نے جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو گو کیسے ہی پاک اور نیک ارادے سے انہوں نے ایسا کیا ہو جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی، مگر برخلاف اس کے علمائے مذہب عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صریح اپنے باطنی عقائد

کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔'' (ایضاً ص ۳۴۰)

سر سید مرحوم نے اس بارے میں خود سر ولیم میور کی اردو کتاب ''تاریخ دین مسیحی'' سے یہ تصریح نقل کی ہے کہ ''دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جائے تو انہی کے بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کہ نہیں، آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے مطابق طریقۂ مذکور تسلیم ہوا، اس سے البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی اور نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا، پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں، اس طرح سے کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقے کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلہ سے لوگ اس پر متوجہ ہو کر اس کی باتیں زیادہ مانیں گے، اگرچہ اس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں، سو اسی طرح مسیحی جو فلسفیوں کی طرح بحث کرتے تھے، کتاب لکھ کے کسی حواری یا خادم حواری، یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے، ایسا دستور تیسری صدی میں شروع ہوا اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا، یہ بات بہت ہی خلاف حق اور الزام شدید کے قابل تھی'' (تاریخ دین مسیحی، حصہ دوم، باب ۱۴، مؤلفہ سر ولیم میور) اسی سلسلہ میں سر سیدؒ نے موشیم کی کتاب ''تاریخ مذہبی'' سے یہ عبارت بھی درج کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ ''میں نہیں کہتا کہ پکے عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کیا تھا...... مگر اس بات سے کہ پکے عیسائی اس قصور سے مبرا نہ تھے، صریح انکار نہیں ہو سکتا'' (ایکلیز یاسٹکل ہسٹری باب ۳، ص ۷۰ مطبوعہ ۱۸۶۰ء) وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''حضرت مسیحؑ کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت سی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھری ہوئی تھیں، ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی

تھیں جن کے ارادے شاید برے نہ تھے، بلکہ وہ وہمی، سادہ مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات حواریانِ مقدس کے نام سے سارے جہان میں مشہور کی گئیں۔" (کتاب مذکور حصہ دوم باب ۲، ص ۳۶)

مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے معیار اور رتبہ سے عیسائی عالموں کی ناواقفیت:

دوسرے مذہب والوں یا حکیموں اور فلسفیوں کے مقابلہ میں "مقدس جھوٹ" کا اثر مستشرقین پر بھی پڑا جوان کے لیے کوئی مستحسن بات نہ تھی، اس سے مسلمانوں میں ان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی، سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

"عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجہ صحت اور تحقیق کے ان قواعد سے جو علمائے اسلام نے مقرر کیے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں اور روایت کے تو نام سے بھی وہ واقف نہیں ہیں، وہ جب کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں بجز بدترین احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہو گئے اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور جب کہ ان کی یہ مایۂ افتخار تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گزرتی ہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مصنفین کی بے علمی اور تعصب پر جوان کی تصنیفات سے مترشح ہوتا ہے، ہنستے ہیں اور ان کی بے فائدہ صرف اوقات پر افسوس کرتے ہیں۔"

(خطبات ص ۳۵۶)

ڈاکٹر اسپرنگر: ڈاکٹر اسپرنگر کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ ہے کہ "اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بہت تھوڑا بیان کیا ہے اور اس تھوڑے ہی بیان سے ان کے اس مضمون سے بہت کم واقفیت ظاہر ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کی مثال ٹھیک

ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو نہایت تاریکی میں پڑا ہو اور نور کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے دھوکا کھا کر راہ گم کر گیا ہو اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہو۔" (خطبات ص ۳۵۷)

روایتوں پر سر ولیم میور کے اعتراضات: تاریخ اور سیرت کے بارے میں دور اول کے مسلمانوں کی روایتوں پر سر ولیم میور نے بڑی تفصیل سے اعتراضات کیے ہیں اور سر سید مرحوم نے ان کے جوابات بھی بڑی وضاحت سے دیے ہیں، اس بارے میں انہوں نے پہلے تو سر ولیم میور کے طرز فکر پر ان الفاظ میں شکوہ کیا ہے کہ:

> "ہم افسوس کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی طرز تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر متعصبانہ اور آزادانہ تحقیق اور جائزہ اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ہی ان کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ یہ سب روایتیں جھوٹی، لوگوں کی محض بناوٹ اور ایجاد ہیں، انہوں نے شروع ہی سے اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں، وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے، جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشا ہوتا ہے، یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیے۔" (خطبات ص ۳۵۸)

سر ولیم میور نے ایک بات یہ کہی ہے کہ "ان روایات ہی نے امتداد زمانہ کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عجیب وغریب اوصاف سے متصف کر دیا، ان کے پیروؤں کے دل میں نادانستہ یہ خیال گزرا کہ محمدؐ کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں جس سے اس قدر کثیر روایتیں وجود میں آئیں، جب کبھی ان بیانات کے امتحان کے لیے واقعات کا کوئی اندازہ سر دست موجود نہ ہوتا تو حافظہ کی قوت کو واہمہ کی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی۔"

مذکورۂ بالا اعتراض میں اصل نکتہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی روایتوں کی تعظیم اور احترام وتوقیر جوزمانۂ مابعد کے لوگوں میں تھی، وہ سر ولیم میور کے الفاظ میں ''امتدادایام کا اثر تھا'' جولوگوں کے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود ہوگا، سر سید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

> ''اب کہ سر ولیم میوراس طرح پر استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں زیادہ نیک اور پرہیزگار شخص کا کیا حال ہوگا، اگر اس کی ہر بات اور عمل کو دغابازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خراب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں اور جس قدر خراب معنیٰ ہمارا تعصب اور حسد ایجاد کرسکے ان کے اوپر عائد کریں۔''
>
> (خطبات)

وہ سر ولیم میور سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ''حضرت موسیٰؑ کے تمام معجزات، ان کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہو جانا، ان کا ''ید بیضا''، ''دریا کا خون کی مانند ہو جانا''، ''مینڈکوں کی وبا'' اور دوسرے معجزات جوان سے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے، بحر احمر میں بنی اسرائیل کے لیے رستہ کا کھل جانا، من وسلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا، پتھر کی منقش لوحوں کا ملنا جن پر خدائے تعالیٰ نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا، خدائے تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا اور ان کو ''میری منتخب قوم'' کے خطاب سے سرفراز کرنا اور اس قدر برکتیں ان کو عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو ''میرا پہلوٹا بیٹا'' کہہ کر ممتاز کرنا، کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے قصے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے اختیار کیا ہے، نہیں کہہ سکتے جن کو اس نبیؑ کے سرگرم پیرووں یعنی بنی اسرائیل نے ایجاد اور وضع کیا ہو، جنھوں نے ''مشکانہ تعظیم'' اور ''شائقانہ تکریم'' کے سبب امتداد زمانہ میں اپنے نبیؑ کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کر دیا ہے؟ کیا یہ بات بھی حضرت موسیٰؑ پر اسی طرح صادق نہیں آسکتی (جو دراصل سر ولیم میور ہی کے طریق استدلال اور زبان اور اسلوب بیان کے

مطابق یہ ہو گی) کہ "ان کی وضع کی شان کو دھیان اور مراقبے سے عروج حاصل ہوا اور زمانہ ان کے پیرووں سے ان کو جس قدر دور کرتا گیا، اس عجیب وغریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے فرشتوں سے (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلف پیغام وسلام رکھتا تھا، زیادہ دھندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا، دل میں نادانستہ یہ خیال گزرا کہ ان کو انسانی طاقت سے زیادہ قدرتیں حاصل ہیں اور وہ ایسے سامانوں سے گھرے ہوئے اور آراستہ ہیں جو انسان کے امکان سے باہر ہیں، حضرت عیسیٰ اور ان کے عقیدت منداور سرگرم متبعین کا اس وقت کیا حال ہوتا اگر ہر شخص ان روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا جن میں حضرت عیسیٰ کی کراماتی پیدائش اور ان کا (عیسائیوں کے خیال میں) ازسرِ نو زندہ ہونا اور اپنے مجروح ہاتھ اپنے متبعین کو دکھلانا اور ان کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھنا، یعنی حسب قانون "وحدت فی التثلیث" اپنے ہی دست راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے۔

سیرت وتاریخ کے ابتدائی راوی یعنی صحابۂ کرام اپنے کردار اور بلندی اخلاق میں ممتاز ترین افراد تھے، اس لیے سرسید مرحوم بجا طور پر فرماتے ہیں کہ "عقل وفہم کی تعظیم ہم کو ان لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور ان کی بدترین تاویل کرنے سے مانع ہے جنہوں نے تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو، البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر مصنف کو یہ لازم ہے کہ جب دوسروں کی تحریروں اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کرلے۔" (ایضاً ص ۳۶۰-۳۵۹)

سرسیدؒ صاف اور واضح الفاظ میں یہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور خلفا ایسے لوگ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف ملتفت اور مصروف کردیا

تھا، وہ امر حق کو مانتے تھے اور اس جہان فانی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے
تھے، وہ ایمان دار، صادق القول اور نیک طینت تھے اور ہمارے احادیث
کے جمع کرنے والوں نے اس غرض سے کہ احادیثِ نبویؐ کا ایک مجموعہ
تیار ہو جائے دور دراز کا سفر اختیار کیے تھے، انہوں نے حکامِ وقت کے
ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت کی تھیں، ان کو بے شمار دقتیں پیش آئیں
اور ایسی ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں جو بہ مشکل خیال میں آسکتی ہیں
مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے کام سے پہلو تہی نہیں کی اور ان کو
انجام تک پہنچایا جس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو دینی سبب
اور مخلصانہ طریقوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی اور ہم کسی طرح مجاز
نہیں ہو سکتے کہ ان کے افعال کو ریاکاری اور فریب کی طرف منسوب
کریں اور اس طرح کے بے بنیاد بیان پر کہ ''وہ محض بناوٹی ایجاد ہیں''
ان تصنیفات کی بے جا تحقیر کریں۔'' (خطبات ص ۳۶۱)

کیا حدیثیں سیاسی ضرورت کی وجہ سے سامنے آئیں؟: سر ولیم میور کا یہ بھی خیال ہے کہ ''ترقی پذیر سلطنت کی ضرورتیں، قرآن کے مجموعۂ سیاست میں ایجاد اور اضافہ کا سبب بنیں، جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادگی اور محدود نظام تمدن کے لیے کافی تھیں، ان کی اولاد کی روز افزوں ضرورتوں کے لیے اب ناکافی ہوگئیں'' وہ کہتے ہیں کہ ''یہ اور اس قسم کے اسباب قرآن کے معدود اور معرا (یعنی گنے چنے اور صرف اصولی احکام و) مسائل کی توسیع اور اس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے متقاضی ہوئے'' لیکن بقول سر سید احمد خاں:

''اس بیان میں سر ولیم میور نے دو طرح کی غلطیاں کی ہیں، ایک تو
یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت یا مجموعۂ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا،

یہ لوگ محض دین کی طرف متوجہ تھے، انہوں نے احادیث نبویؐ کو صرف
دینی اغراض سے جمع کیا تھا، ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو
بہت بڑی نسبت ہے، یعنی ان کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق
نہیں ہے، دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب کہ مسلمانوں نے
امور سیاست کو الہامی سمجھا ہو، خود جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ
میں ایسے امور میں صحابہؓ سے صلاح لیتے تھے اور اس کے مطابق کار بند
ہوتے تھے، قرآن مجید اور نیز پیغمبرؐ خدا نے سیاست اور انتظام مدن کے
سبھی معاملات کو چند اصول عام کے بعد بالکل فرماں رواؤں کی رائے پر
چھوڑ دیا ہے اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے وہ
کام کریں جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں، پس
مسلمانوں کو اور ان کی اولاد کو اپنی روز افزوں ضرورتوں میں قرآن کی
تکمیل کے لیے حدیثوں کو تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، ہاں بلاشبہ
مسلمانوں میں یہ خواہش تھی کہ ہر امر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا
سے، اسی طرح کی کارروائی کریں جس طرح کہ پیغمبرؐ خدا نے کی تھی اور یہ
اس محبت و عشق کا تقاضا تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ رکھتے ہیں
اور اسی لیے ہر قسم کی احادیث کو جمع کرتے تھے، پس یہ عشق اور محبت نہایت
قابل ستائش تھی مگر افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ
صفت کو بھی بدترین معنی میں بیان کیا ہے۔" (خطبات احمدیہ ص ۳۶۲)

انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ "کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے ان لوگوں
کے کام میں جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا، ہم علانیہ کہتے ہیں کہ لوگ ہم
کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تمام کتب احادیث میں سے ایسی نکال دیں جو کسی خلیفہ یا

حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو۔اس کے برعکس ہم یہ بات اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بلا استثنا ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفا کے دربار میں جانے سے بھی از حد پرہیز کرتے تھے، اس زمانہ کے خلفا جناب پیغمبرؐ خدا کے خلیفہ نہ تھے بلکہ سلاطین اور بادشاہ تھے، کیونکہ سلسلۂ خلافت (یعنی پیغمبرؐ خدا کے جانشین خلفا کا زمانہ) جناب رسالت مآبؐ کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہو گیا۔ (خطبات احمدیہ ص ۳۶۴)

سر ولیم میور کا واقدی سے استناد: سر سیدؒ فرماتے ہیں کہ ''سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں واقدی سے نقل کرتے ہیں'' پھر چند سطروں کے بعد وہ واقدی سے استناد پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم کو اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اگر چہ سر ولیم میور کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایات اسلام محض بناوٹی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے سب بیانات کو واقدی کی روایت پر مبنی کیا ہے جس میں ضعیف ترین روایات منقول ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں، حالانکہ تحقیق اور غیر متعصبانہ تصنیف کے مسلمہ قوانین کی رو سے، نیز اپنے عقیدے کے مطابق ان کو لازم تھا کہ اول احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی نسبت معترض ہوتے، تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں جنہوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے اسی ضروری امر میں کوتاہی پائی جاتی ہے، مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوشگواری سے ہضم کر جاتے ہیں اور دوسروں کی نسبت عجیب و غریب پیرائے میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۳۶۵)

مسلمانوں میں جو لغو، غیر معتبر اور موضوع روایتیں پیدا ہوئیں، ان کی حقیقت کو

ی واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ اکثر کتابیں صحیح اور غلط روایتوں میں تمیز کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور ان کی صحت اور وجہ اعتبار کے جانچنے کے لیے اصول وقواعد اور سخت معیار مقرر کیے گئے ہیں اور جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے گنہگار ٹھہرائے گئے ہیں لیکن اس موقع پر سر سیدؒ اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ جھوٹی روایتوں کے باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا حال بدترین ہے، مذہب عیسوی میں دینی کتب کے نام سے جو روزانہ ہر کلیسا میں پڑھی جائیں، بے شمار رسالوں اور موضوع کتابوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی جن کی وجہ سے ان کے دین دار حلقوں میں بے انتہا مناقشے اور قضیے پیدا ہو گئے، قسطنطین اعظم نے دین عیسوی کو قبول کیا تو اس نے ۳۲۰ء میں مجلس نیس (نسیا) منعقد کی جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ صحیح اور موضوع انجیلوں میں تمیز کی جائے، بقول والٹیر عیسائیان سابق پر اس لیے نفریں کی گئی کہ انہوں نے عیسیٰؑ کے نام پر چند اشعار لکھ کر ایک پرانی کاہنہ کی طرف منسوب کیے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے بادشاہ اوڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جب کہ اس زمانہ میں کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا، حضرت مریمؑ کے خطوط، سنیفا کی جانب سے پلوس کے نام خطوط، پلاط کے خطوط اور افعال، مصنوعی اناجیل، جھوٹے معجزات اور دوسری ہزاروں جعل سازیوں اور فریبوں کے الزامات بھی لگائے تھے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔

مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی، الوہیت مسیحؑ کا وہ مسئلہ طے ہوا جس نے کلیسائے نصاریٰ میں ہلچل ڈال دی تھی، اس مجلس میں اٹھارہ بشپ اور دو ہزار پادریوں نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت سے انکار کیا اور اس پر دلیلیں دیں لیکن سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیحؑ خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں، خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں، اریس جو اٹھارہ بشپہائے معترضین میں سے ایک تھا،

فرقہ یونیٹرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے منکر تھے، وہ بے دینی کے اسی الزام کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا لیکن پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کو قسطنطنیہ بلا لیا گیا جہاں اس کے عقیدے کو بالاتری حاصل ہوئی اور تمام صوبہ جات روم میں اس نے رواج پایا، جب کہ آثاناسیوس نے جو فرقۂ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا، اس کے خلاف سخت جدوجہد کی، اسی مجلس نیس کی کارروائی کے تتمہ میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ آبائے کلیسا، توریت اور انجیل کے صحیح اور غیر صحیح صحیفوں کے انتخاب و تصحیح میں نہایت حیران اور ششدر ہوئے، چنانچہ ان سب کو بلا لحاظ و تمیز ایک قربان گاہ پر رکھ دیا اور کہا جاتا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے زمین پر گر پڑے۔

دوسری مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی جن میں روح القدس کے بارے میں ان امور کی تشریح کی گئی جن کو مجلس نیس میں غیر منفصل رہنے دیا گیا تھا، اب اس موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اس نے احترام حاصل کیا ہے، ۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو مقام افسیس ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریمؑ ام اللہ (مادر الٰہ) تھیں، خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰؑ میں دو صفتیں تھیں اور ایک وجود، نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ عظیم تفرقہ اور اختلاف واقع ہوا جس کے بعد شہر روم میں پوپ کے عہدہ کے لیے تقریباً انتیس خوں ریز جنگیں ہوئیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۶۸-۳۶۵)

سرولیم میور، تورات و انجیل کی مذکورۂ بالا ناگفتہ بہ صورت حال سے نظریں بچا کر اسلامی روایات کو اسی سطح پر لانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، چنانچہ انہوں نے بعض یورپین اہل تحقیق کی یہ رائے درج کی ہے کہ وہ بخاری کی درج کردہ روایات میں سے نصف کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سرولیم میور نے ان روایات سے استدلال نہیں کیا ہے جن کو خود انہوں نے بھی معتبر مانا ہے، بلکہ بقول سرسید:

"یورپین محققوں نے جن میں سرولیم میور سب سے اول ہیں،
بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کر کے اپنی تصنیفات کو واقدی،
مولود نامہ، معراج نامہ اور دوسری ان کتابوں پر مبنی کرنے کی جانب مائل
ہوئے ہیں جن میں بیہودہ باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور جن کو خود
مسلمانوں ہی نے خارج کر دیا ہے۔" (ایضاً ص ۳۶۹)

سرولیم میور کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ "جامعین حدیث نے اگرچہ وہ غیر معتبر روایات کے اخراج میں بے دھڑک تھے، معتبر روایتوں کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کو نہیں برتا" کیونکہ جمع روایات کا کام شروع ہوا تو اول یہ کوشش ہوئی کہ معتبر راویوں کی تحقیق کر کے ان کی روایتوں کو قلم بند کر لیا جائے، قرآن وحدیث کے مقصد اور اصول وکلیات کی روشنی میں بھی غلط اور نامعتبر روایتوں کی تمیز کا کام کیا گیا، چنانچہ بہت سے علمائے محققین ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے اور اس کے لیے قواعد بھی منضبط کیے ہیں اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں اور مضامین حدیث کے لحاظ سے حدیث کے اعتبار وعدم اعتبار کو پرکھنے کے لیے ایک مستقل فن کی بنیاد رکھی جسے فن درایت کہا جاتا ہے، ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ ان اصول درایت سے جس کتاب کی حدیث پر چاہے معتبر اور نامعتبر ہونے کے بارے میں روشنی حاصل کرے۔ (خطبات احمدیہ ص ۳۷۱)

اوائل عمر سے متعلق

روایتوں پر اعتراض: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی عمر سے متعلق روایتوں پر بھی سرولیم میور نے بے سروپا اعتراضات کیے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ صاحب کے اس زمانے کے حالات جن لوگوں نے بیان کیے ہیں وہ لوگ آپؐ سے عمر میں چھوٹے تھے یا برابر، اس لیے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیشتر کے واقعات، یا ان کی طفولیت کے حالات کے باب میں ان کی شہادت معتبر نہیں ہے اور آپؐ کی نوجوانی کے سوانح بھی ان

میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہدہ کیے ہوں گے مگر:

''بظاہر یہ بیان لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوتا ہوگا لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے پہلے یہ فرض کر لیا ہے جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ ''روایت کی سب سے پہلے ترویج کا زمانہ پیغمبرؐ صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا'' مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں اور ثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبرؐ خدا کی حیات میں شروع ہوئی تھی، دوم یہ کہ موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کر لیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنہوں نے پیغمبرؐ خدا کی حیات میں وفات پائی تھی، یا تو جناب پیغمبرؐ خدا سے چھوٹے تھے یا ان کے ہم عمر تھے، یہ امر تاریخی واقعہ کے خلاف ہے اور صحابہؓ بھی بہ لحاظ عمر کے اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبرؐ خدا کی ولادت سے ذرا پیشتر کے واقعات اور ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کو بچشم خود دیکھا اور ان کو صحیح صحیح یاد رکھ کر اوروں سے بے کم و کاست نقل کیا ہو اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۲۷۲)

سر سید یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہان معائنہ کی موجودگی پر موقوف رکھنا، شہادت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائستہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کر لیا ہے سر مو انحراف ہے، گواہان معائنہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کا عمل ایسا ہی مستحکم ہوتا ہے اور جن سے کسی واقعہ کے صدق یا کذب کا فیصلہ ہو سکتا ہے، صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ جس کے بارے میں کوئی معتبر گواہ معائنہ تصدیق کرے فوراً تسلیم کر لیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں راویوں کی کثرت اور تواتر سے اس کی صحت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جناب پیغمبرؐ خدا کے زمانہ کے واقعات کی تصدیق کے لیے یہی صورت

لازم اور ممکن ہے کہ انسان نے اپنی عقلی صلاحیتوں کے ذریعہ کسی مذہب کا لحاظ کیے بغیر جو سچے اور مسلمہ قوانین شہادت مرتب کیے ہیں، ان ہی کی روشنی میں گواہوں کے بیانِ صدق کا امتحان کریں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوائل عمر میں جو واقعات پیش آئے سر ولیم میور کے نزدیک ''ان کے بارے میں کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی'' اس اصول کو سر ولیم میور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے ابتدائی عرصہ تک وسعت دیتے ہیں، جب کہ آپؐ نے علانیہ دعوائے نبوت کیا، شرک سے ممانعت فرمائی اور باشندگان مکہ سے لڑائی کے حالات پیدا ہوئے، وہ اپنے بیان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جناب پیغمبرؐ خدا کے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب کہ انہوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے لیکن بقول سر سید:

> ''سر ولیم میور کا یہ فرضی اصول جو انہوں نے اپنی ذہانت سے ایجاد کیا ہے، اگر مان لیا جائے تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی اس سوانح عمری کی نسبت جو ان کی شہرت حاصل کرنے سے پہلے وجود میں آئی تھی کیا کیا جائے گا، کیا ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی اور کیا ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا؟...... ہم کو آنحضرتؐ کے تمام حالات زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آنحضرتؐ کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو، مگر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے باب میں ایسا نہیں ہے، ان دونوں کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت ان کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے، ہم کو کس طرح یہ یقین ہوسکتا ہے کہ وہ نامعلوم بچہ جس کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں

ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا، عمران کا حقیقی بیٹا تھا جس کو تمام دنیا
حضرت موسیٰ کہتی ہے اور ہم کو کس طرح اس بات کا مکمل یقین ہو سکتا ہے
کہ وہ بچہ جس کو ہم کلمۃ اللہ اور روح اللہ اور عیسائی اس کو ابن اللہ
کے ناموں سے مخاطب کرتے ہیں اور جس کی نسبت یقین ہے کہ بن باپ
کے پیدا ہوا تھا، داؤد کی نسل سے تھا اور وہ وہی تھا جس کو اب عیسیٰ مسیحؑ کے
نام سے تعبیر کرتے ہیں، یہ دونوں امر جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد
ہیں ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا ایسا محال اور غیر ممکن
ہے جیسا کہ دنیا میں کسی بھی محال اور غیر ممکن چیز کا ثابت کرنا۔"

(خطبات احمدیہ ص ۳۷۵)

مسلمان تو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ پر کامل ایمان رکھتے ہیں لیکن سر ولیم میور کا اصول خود ان کے حق میں سخت مضر ہے جس سے ان کی اپنی مذہبی بنیادیں ہل جاتی ہیں، پھر یہ اصول شہادت کے مسلمہ قوانین کے بھی برخلاف ہے، جہاں تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی واقعات کا تعلق ہے تو "بہت سے برسوں کے گزرنے کے بعد" ان کی روایت کا افسانہ بھی ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے، اس لیے کہ:

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر مشہور زمانہ حیات کو اس قدر
عرصہ نہیں گزرا تھا، زمانہ روایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے
جنھوں نے پیغمبر خدا کی پیدائش، ان کا بچپن، ان کا لڑکپن اور ان کی
نوجوانی دیکھی اور گو بقول سر ولیم میور" ان کا حافظہ اور خیال پیغمبر صاحبؐ
کی زندگی کے حالات کو بالتخصیص ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا"
تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دید باتوں کو بھول گئے ہوں،
برخلاف اس کے جب کہ ایک بے کس یتیم بچہ، ایک ایسا شخص جس کی

نسبت تمام باشندگان مکہ میں سب سے کم یہ گمان ہو سکتا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوں اور ایسا غیر مشہور شخص وہ چال چلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہو اور جو اس کے خاندان، اس کے ہمسایوں اور اس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس کا تقاضا ہے کہ ہر شخص جو اس سے قرابت رکھتا ہوگا اس کی زندگی کے غیر مشہور زمانے کے حالات اور خفیہ طرز معاشرت کی سخت چھان بین کرے گا اور اس کی خفیہ معاشرت کے ہر واقعہ کا اسی طرح کے ان واقعات سے مقابلہ کرے گا جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں اور جن کی نسبت وہ سب معائنہ کے گواہ ہوں۔" (خطبات احمدیہ ص ۳۷۶)

لیکن سر ولیم میور اس دور سے متعلق کسی بھی طرح کی "صراحت کو بناوٹ کی ایک بڑی علامت" تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ اصول واضح طور پر مسلمہ قانون شہادت کے خلاف ہے اور وہ نتیجہ جو انہوں نے عیسائیوں کے فن تحقیق کے قانون کو روایات اسلام پر جاری کر کے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جائے گا جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں لیکن بقول سر سید سر ولیم میور کا یہ اصول پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ غیر مشہور پر ٹھیک ٹھیک صادق نہیں آتا اور جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں اور جو امتداد زمانہ کی وجہ سے غیر ممکن معلوم ہوتی ہیں تو اس بنا پر جو شبہ ہوتا ہے راوی کی نسبت ہوتا ہے، کیونکہ اس کو یہ تفصیل یاد رہی، نہ کہ مضمون روایت کے بارے میں، کیونکہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن نہیں اور اسی لیے اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جامعین روایت کے نزدیک قواعد کی روشنی میں راوی کا چال چلن ہر طرح درست ثابت ہو، اس کے حافظہ پر اعتماد ہو اور ان

واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو، تب مضمون روایت کے صحیح تسلیم کر لینے میں کچھ شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ (ایضاً ص ۳۷۸)

دور نبوت کے اہل کفر کے بارے میں: مکہ کے دور نبوت بلکہ فتح مکہ سے پہلے تک کے زمانۂ نبوت کو بھی سر ولیم نے اپنے قیاس وتخمین کا نشانہ بنایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کے کفار یا تو ایمان لا چکے تھے یا وہاں سے نکال دیے گئے تھے اور اب کوئی شخص وہاں نہ رہا تھا جو ان کے بارے میں یک طرفہ بیانات، بے بنیاد اتہامات اور مبالغہ آمیز الزامات کی تردید کرتا اور چونکہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرأت ہوتی اور اسی وجہ سے اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے اور مؤرخین ہمیشہ اس شہادت پر جو ان کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے رہتے تھے لیکن سر ولیم کا یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بادھوائی ہے بلکہ اس سے خود ان کے مسلمہ عقائد اور اصولوں کی بھی مخالفت لازم آتی ہے، بقول سر سید:

> ”صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیا علیہم السلام اور ان کے متبعین پر بھی صادق آتا ہے، خصوصاً اس زمانے پر جب کہ حضرت موسیٰؑ نے نہایت پرزور لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست ونابود کر دیا تھا اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا مگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی، ایمان داری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاق کا مادہ ہیں، لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یکلخت محو ہو گئے ہوں اور وہ سب یک دل، یک زبان ہو کر بدترین افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں، یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی

طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں اور جن کو ان سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو، یہی امر یعنی ان واقعات کے گواہان معائنہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات میں غلط بیانی کے عدم امکان کا ثبوت ہے۔" (خطبات احمدیہ ص ۴۷۹)

ہوس مادی کا الزام: سرولیم اپنے تعصب اور جوش میں عجیب وغریب باتیں تراشتے چلے گئے ہیں، وہ یہ لکھتے ہیں کہ "محمدؐ صاحب کی صحبت میں راوی کی ہوس نے بار پایا" کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ شرافت وحرمت وابستہ تھی اور ان کی دوستی حصول مدارج اور عزت کا سبب تھی اور "اس ہوس نے محمدؐ صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے تعلق پیدا کرنے اور وحی میں مذکور ہونے کی سب سے بڑی ممکن الحصول عزت کا امکان پیدا کر دیا تھا جو خلاف فطرت واقعات کے ایجاد یا مبالغے کا باعث ہوئی اور روایات میں غلط بیانی کا سبب بنی" اس موقع پر سرسید کا جواب پڑھنے کے لائق ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل طرفدار بن جائے تو اس میں کچھ چارہ نہیں، یہ کس طرح خیال میں آ سکتا ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں اور جن کے دلوں کے مخفی سے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبرؐ خدا کی سنت کی پیروی ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ راستہ ہے اور ان کے احکام سے سرتابی کرنا ابدی گمراہی کا موجب ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب کے سب اپنے نبی کے فرمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی، فریب دہی اور ریاکاری میں

یکلخت مبتلا ہو گئے ہوں، خلاصہ یہ کہ ہر طرح کی بداعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں، بطور مثال کسی مذہب کو لو، ہندو مذہب کو، بدھ مذہب کو، دیگر مشترک مذاہب کو، یہودی مذہب کو، عیسوی مذہب کو اور اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک، پروٹسٹنٹ، یونی ٹیرن، ٹرنٹیرین، ویزولینز، بپٹسٹ، جمپرز، مورمنز وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی، صداقت، ایمانداری، راست بازی، سرگرمی، راسخ الاعتقادی اور جاں نثاری کی بو پاؤ گے اور اپنے نبی کے احکام اور اپنے مذہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پاؤ گے، ہم کو اپنے اس بیان کی تائید اور تصدیق کے لیے ہزاروں مثالوں میں سے صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ جب زیدؓ بن ثابت سے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کے منتشر اجزا کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے فرمایا تو کچھ عرصہ تک زیدؓ بن ثابت خوف کے مارے عالم سکوت میں رہے اور پھر جب ہوش وحواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے جوش میں سوال کیا کہ ایسے کام کی جو خود پیغمبرؐ خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا، آپ کیوں کر جسارت کرتے ہیں، اس طرح کی ہزاروں مثالوں کی موجودگی میں یہ بات کس طرح ذہن میں آسکتی ہے کہ لوگوں نے جو پیغمبرؐ خدا سے اس قدر خوف اور ان کی اس قدر تعظیم کرتے تھے اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو نہیں جانتے تھے، فوراً ہی (سرولیم کی بیان کردہ) برائیوں کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل وخوار کر دیا ہو اور ایسے ایسے گناہ عظیم ان سے سرزد ہوئے ہوں۔'' (خطبات ص ۳۸۱)

موضوع روایات کو خارج کیے جانے کی وجہ: راویوں کے عدم اعتبار یا بہت سی روایتوں کے بالکل ہی بے اصل ہونے کی وجہ سے محدثین نے اپنی کتابوں میں بہت سی روایتوں کو درج نہیں کیا، یا ان کو موضوع اور جعلی قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے، سر ولیم میور نے ان کے بارے میں بھی اپنے قیاسی گھوڑے دوڑائے ہیں اور تعصب کی وجہ سے ان روایتوں کے خارج کیے جانے کی عجیب توجیہ کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں اس لیے کہ اوائل اسلام میں مشہور عموماً بے اعتبار یا بالکل خارج ہو گئیں، کیونکہ ان سے محمدؐ صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی'' پھر وہ کہتے ہیں کہ اس معاملہ کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گزشتہ کو ثابت کیا گیا غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئیں، کچھ پتہ نہیں معلوم ہوتا۔

سر سید نے میور کے ''ایک طول طویل بیان کا خلاصہ'' درج کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے، ان کے خیال میں سر ولیم میور کے مذکورۂ بالا بیان سے ''صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی محققانہ تحریر نہیں ہے بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے جو اپنے بیانات، اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے اور جو اپنے مذہب کے سوا اور مذہب کی باتوں پر اور بالخصوص اس مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی طرح پر مضرت پہنچی ہو، نہایت حقارت اور بے اصل شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے، اگر ہم سے ایسے بے موقع اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جائے تو ہم ان سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دیں گے جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مذہب کے بارے میں استعمال کیا کرتے تھے، سر ولیم میور کہتے ہیں کہ ''روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی تھیں، کیونکہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں، عموماً بے اعتبار یا کل خارج ہو گئیں، کیونکہ ان سے محمدؐ صاحب کی تحقیر یا کسی

فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی'' مگر اس کے جواب میں سر سید فرماتے ہیں:

''یہ کیسا غلط بیان اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اعتماد اور گھمنڈ کے ساتھ صاف اور بے لاگ زبان میں بیان کرتے ہیں، گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلم تاریخی واقعہ ہے اور شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا، اس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ صرف اس قدر کہہ کر ہی اس کو طے کرنا چاہتے ہیں کہ ''اس کو کامل طور سے ثابت کرنا ......غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کو جو اوائل میں ترک کردی گئی تھیں، کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا'' کیا اس طرح پر دلیل لانا تعصب کا اثر نہیں ہے، جب کہ سر ولیم میور کا یہ بیان صحیح بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ تمام اتہامات اور تحقیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعال کیا کرتے تھے، مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ خود قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں اور نہ کوئی بات خارج کی گئی ہے اور نہ مخفی کی گئی، رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلافات واقع ہوئے تھے، ہم تسلیم کرتے ہیں مگر ہم ان سے وہ بے جا اسباب منسوب کرنے سے جو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیے ہیں اعتماد کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔''

(خطبات ص ۳۸۴)

ڈاکٹر اسپرنگر سے سر ولیم کی ہم نوائی:

ان مستشرقین نے ایک اور بے اصل قصہ کو خوب ہوا دی ہے جو کسی معتبر سند کے بغیر ایک کتاب مواہب لدنیہ میں درج ہوگیا ہے مگر مستشرقین کو روایت کے معیار یا اس کی صحت کے امکان سے کچھ بحث نہیں ہوتی، وہ اپنے تعصب کی وجہ سے ایسی روایت کو کسی تحقیق اور چھان بین کے بغیر ہی اچک لیتے ہیں اور سادہ لوح عوام کو فریب

دینے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر اسپرنگر سورہ والنجم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ "محمدؐ صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی اور ان کو تسلیم کر لیا اور جب وہ سجدہ میں گئے تو قریش نے بھی سجدہ کرنے میں اتباع کیا" اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنفِ مواہب لدنیہ سے منسوب کرتے ہیں، سر ولیم میور نے اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "بظاہر ایک خوب معتبر قصہ موجود ہے جس سے محمدؐ صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے" وہ اس کے لیے واقدی اور طبری کا حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ کے مؤلف نے اس "مضمون" سے متعلق تمام مختلف روایتوں اور علما کے خیالات کو یکجا جمع کر دیا ہے جس کو سرسید نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے، اس روایت کا خاص اور اہم جزیہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتوں کی تعریف میں "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترجی" کا فقرہ منسوب کیا گیا ہے اور یہ روایت خود صاحب مواہب لدنیہ کے الفاظ میں تین سندوں سے مروی ہے جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچا، پھر مواہب لدنیہ کے مؤلف یہ بھی لکھتے ہیں کہ "جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی" (خطبات احمدیہ، ص ۳۹۵-۹۶) مواہب لدنیہ کے مؤلف کو بھی اس روایت کے کئی سلسلوں کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے، چنانچہ ان کا خیال یہ ہے کہ "جو لوگ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا ہو، صحیح تصور نہیں کرتے، وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب اس کو تسلیم کر لیں گے" مگر سرسید نے مواہب لدنیہ کی مذکورۂ بالا تصریحات کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ بیان اس کا محض غلط ہے جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں اور

جو خود اس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف روایتوں کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے متعدد سلسلے ہیں اور مرسل روایتیں یعنی جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا ہو، گو اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو، سند اور اعتبار کے قابل نہیں جب تک کہ اس کی تائید کے لیے کوئی روایت یا سند موجود نہ ہو، مزید یہ کہ وہ روایت قرآن مجید کی مخالف نہ ہو لیکن جب کوئی روایت مذکورۂ بالا روایت کی طرح قرآن مجید کے احکام کے خلاف ہو اور جب کہ وہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام حالات کے خلاف ہو جو شرک کے مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی اصولوں سے اتفاق نہ رکھتی ہو، پھر ایسی مشتبہ اور مختلف ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے اور کہنے والا بھی واضح نہ ہوا ہو، تو ایسی روایت از روئے عقل و انصاف کس طرح ان قواعد میں داخل ہوسکتی ہے جن میں اس روایت کو داخل کرنے کی مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے، وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے۔"

(خطبات، ص ۳۹۵)

اصل واقعہ جیسا کہ سر سید نے وضاحت کی ہے، یہ ہے کہ "جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گزرا ہے جب آپ مکہ میں تشریف رکھتے تھے، کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے اور اپنے وحشیانہ بغض سے ہر نئے ڈھنگ سے آنحضرت ﷺ کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے، وہ جناب

پیغمبرؐ خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے اور جب آپ خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان فرماتے تھے تو مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے، پس مذکورۂ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نجم پڑھ رہے تھے تو کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی اور یہ کہا: "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترجی" اور جب پیغمبرؐ خدا نے سجدہ کیا، مشرکین نے بھی اپنے بتوں کو سجدہ کیا، مشرکین میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا، کچھ عجب نہیں کہ مشرکین یہ سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبرؐ خدا ہی نے فرمایا تھا، مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبرؐ خدا نے وہ جملہ نہیں کہا (جیسا کہ خود صاحب مواہب لدنیہ نے نقل کیا ہے) اور اس لیے مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور زیادہ دشمنی پر آمادہ ہو گئے، اس وقت کے مسلمان ہرگز یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جملہ فرمایا ہو اور کہنے والا بھی متعین اور واضح نہیں ہوا، اس لیے انہوں نے کہا یہ بات شیطان نے کہی تھی، اس کے بعد جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت آئی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا، جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلتا ہوا معلوم ہو، انہوں نے کہا کہ پیغمبرؐ ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیے تھے مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبرؐ خدا نے وہ لفظ کہے تھے، بایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب رسولؐ خدا کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی طرح پر بھی پیغمبرؐ خدا کی زبان مبارک سے نکلنا خیال نہیں کیا، کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے، کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو، بلکہ کسی نے صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں

سے اس کو بیان کیا ہے، یہی بے سر وپا روایتیں ہیں جن کا ذکر طبری، واقدی اور ابن اسحٰق نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۹۸-۳۹۶)

سر ولیم میور کے خیال میں روایت کے معتبر ہونے کے لیے ایک عجیب قاعدہ:

روایات کے معتبر قرار دینے کے لیے سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "جب کسی روایت میں محمد صاحبؐ کی تحقیر کے کلمات ہوں، مثلاً بعد ہجرت اگر ان کے متبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو، یا کارِ خیر میں ناکام ہونا، یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشائے اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے تو اس کے تسلیم کرنے کی دلیلیں قوی ہیں، کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایتیں ایجاد کر لی جائیں، یا ایجاد ہو کر محمد صاحبؐ کے متبعین میں رواج پا سکیں۔"

مگر سر سید کے خیال میں "درحقیقت کسی روایت کی صحت کو ثابت کرنے کا یہ ایک عجیب طرز ہے"، وہ فرماتے ہیں کہ "کیا ہم کو ان تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیے، جن کو مخالفین اسلام نے وضع کیا، یا اسلام کے نام پر گھڑ لیا تھا اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کی تردید کریں اور ان کو موضوع اور بے اصل ثابت کریں، یا وہ کسی کی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں اور جن کی نسبت علما نے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی ہیں، دراصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بے ہودہ روایتیں اور قصے آنحضرتؐ کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سے کہ نئے مذہب اور اس کے بانی پر عیب لگائیں اختراع کر لی تھیں، اس لیے ان مذکورۂ بالا وجوہ سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا ان کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتی، تعجب ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ "قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایات بنالی جائیں یا گڑھ لیے جانے کے بعد متبعین محمدؐ

صاحب میں رواج پا سکیں"، ان کی یہی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی ایجاد کردہ ہیں۔ (خطبات ص ۳۹۹)

سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں اختراع اور جعل سازی ثابت کرنے کے لیے مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سے ایک کا نام انہوں نے تلون آمیز اختراع رکھا ہے اور پھر اس کی مثالیں بھی ذکر کرتے ہیں، مثلاً ان ہی کے بقول بیس گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحبؐ خضاب کیا کرتے تھے اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتاتے ہیں، بعض صرف اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے بہ چشم خود اس امر کو پیغمبرؐ صاحب کی زندگی میں دیکھا تھا، بلکہ انہوں نے آپ کی وفات کے بعد وہ بال جن پر رنگ محسوس ہوتا تھا دکھلا دیا تھا اور بیس گواہ جن کو واقفیت کے یہی ذرائع حاصل تھے، بیان کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ صاحب نے کبھی خضاب نہیں کیا اور ان کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آسکتے تھے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۴۰۰)

لیکن خضاب کے بارے میں راویوں کے اس اختلاف سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ بیان واقعہ میں کسی جعل سے کام لیا گیا ہے، جب کہ غیر معمولی غور وفکر سے اختلاف کی اصل وجہ اور واقعہ کی اصلیت سمجھ میں آسکتی ہے، چنانچہ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

"اس میں شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید بال نہایت تھوڑے تھے، (بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی اور سر مبارک میں صرف سترہ (۱۷) بال سفید تھے) آنحضرتؐ نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں لگایا جو لوگ ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے، ان کا یہی بیان ہے اور چونکہ بال سفید ہونے سے پہلے اکثر بھورے ہو جاتے ہیں، اس لیے جن لوگوں نے ان بھورے بالوں کو دیکھا تو یہ خیال کیا کہ خضاب کیے ہوئے ہیں اور ان ہی بھورے بالوں سے

استدلال کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب کرنا بیان کیا، خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے، بلکہ اس چیز کا ذکر ہے جس کو پیغمبرؐ صاحب غسل کے وقت اپنے سر پر مل لیتے تھے، پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف مذکورہ بالا سبب سے قدرتی طور پر خود بخود ہو گیا، اس کو دیدہ و دانستہ عیارانہ بناوٹ نہیں کہا جا سکتا، ان کو یا اس قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے، متناقض یا بناوٹی روایتیں نہیں کہا جا سکتا۔" (ایضاً ص ۱۰۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری مبارک کے بارے میں بھی سر ولیم میور نے یہی طریق استدلال اختیار کیا ہے، ان کے خیال میں خاتم نبویؐ کے باب میں عقیدہ یا خاندان کا کوئی مفاد ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے جانب داری کے رجحانات پیدا ہوتے لیکن پھر بھی اس سے متعلق روایتوں میں جو تناقض ہے، سر ولیم میور کے نزدیک وہ صرف جعل اور اختراع کا نتیجہ ہے "ایک فریق یہ کہتا ہے کہ پیغمبر صاحبؐ نے اپنے مراسلات پر مہر لگانے کی ضرورت کی وجہ سے خالص چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی تھی، دوسرے فریق کا یہ کہنا ہے کہ خالدؓ بن سعید نے اپنے لیے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی اور محمدؐ صاحب نے اس انگوٹھی کو پسند کر کے اپنے پاس رہنے دیا، ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس انگشتری کو عمرو بن سعد حبش سے لائے تھے، چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذؓ بن جبل نے اس مہر کو اپنے لیے یمن میں بنوایا تھا اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ محمدؐ صاحب اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے اور کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ الٹے ہاتھ میں، کچھ روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رہتا تھا اور بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف رکھتے تھے، بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مہر پر "صدق اللہ" نقش تھا اور دوسری روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "محمد رسول اللہ" نقش تھا، سر ولیم میور کے

بقول "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ یہ متواتر بیان کیا گیا ہے کہ محمدؐ صاحب کی وفات کے بعد اسی انگشتری کو ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے بھی زیب انگشت کیا تھا اور عثمانؓ کے ہاتھ سے چاہِ غریس میں گر پڑی تھی" ایک روایت یہ بھی ہے کہ پیغمبر صاحبؐ یا ان کے خلفائے راشدین نے کوئی بھی انگشتری نہیں پہنی تھی، (ایضاً ص ۴۰۲)
سر ولیم میور نے روایات میں تضاد ثابت کر کے جس پر فریب طریقے سے اصل حقیقت ہی کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے، اس سے ان کی زنگ خوردہ طبیعت کا راز فاش ہو جاتا ہے جس پر سر سید احمد خاں یہ تبصرہ کرتے ہیں:

> "(سر ولیم میور نے) جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے، وہ نہایت افسوس کے قابل ہے، یہ بیان سر ولیم میور کا کہ "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں" محض غلط ہے اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے، وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کیا ہو، یا چاندی کی انگوٹھی علاحدہ اور خول والی انگوٹھی علاحدہ ہو، کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذؓ بن جبل والی انگوٹھی پر "صدق اللّٰہ" اور جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر "محمد رسول اللّٰہ" کندہ ہو؟ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو اور کبھی الٹے ہاتھ میں اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف، اس انگوٹھی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے، جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی، سر ولیم میور نے چونکہ غلطی سے یا دانستہ ان سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری

سے متعلق خیال کیا ہے، اس لیے اپنی دلیل میں کسی تفصیل کے بغیر یہ بیان کرتے ہیں کہ وہی انگشتری صحابہ تک پہنچی تھی، حالانکہ وہ صرف وہی انگشتری تھی جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ تھا، پس ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے فرضی خیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ جس سے وہ حجت و برہان کی صراط مستقیم سے منحرف ہو گئے اور اسلام سے متعلق ہر چیز کو جو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو وہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہو گئے اور ان کو وہ جعل سازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ کہہ کر بدنام کرتے ہیں، سر ولیم میور کو ان کی تجربہ کاری کی وجہ سے اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے تھا کہ وہ بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل وثبوت نہ ہو ہمیشہ اسی خرابی کا باعث ہوتے ہیں، جس کی حمایت کی (ان کے پادریوں کی جانب سے) ان سے توقع کی گئی ہو۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۴۰۳)

اسلامی روایات میں عیسائیوں کے ''مقدس جھوٹ'' کی تلاش: عیسائیوں کے یہاں مذہبی روایات کا زیادہ تر دارومدار اس ''مقدس جھوٹ'' پر ہے جس کا اعتراف خود انہوں نے کیا ہے اور اس کے کچھ شواہد کا تذکرہ آئندہ صفحات میں بھی کیا جائے گا، تعجب کی بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں بھی ''مقدس جھوٹ'' کی جستجو کی ہے اور اس بارے میں انہوں نے اسلامی روایات کو ان کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اپنی مذہبی روایات کے معیار سے قریب تر لانے کی ''سعادت'' حاصل کی ہے، مگر قواعد تصنیف میں اس قدر انحراف کو دیکھ کر ہر صحیح الدماغ اور ذی ہوش شخص کو یقینی طور پر ملال ہوگا کہ وہ دین اسلام پر الزام تراشی کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ ''مقدس جھوٹ'' کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے، دینیات

اسلام کی رو سے بعض حالتوں میں فریب روا ہے، خود پیغمبرؐ صاحب نے اپنے احکام کے ذریعہ اس عقیدہ کی ترغیب دی ہے کہ "بعض مواقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے" پھر وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے یہاں عام عقیدہ یہ ہے کہ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے، کسی شخص کی جان بچانے کے لیے، صلح و اتفاق کرانے کے لیے، عورت کی ترغیب کے واسطے اور سفر یا کسی خاص مہم کے موقع پر" سر ولیم ان چار موقعوں کے لیے اپنے خاص انداز میں مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں "اول کی نسبت تو پیغمبرؐ صاحب کی صریح منظوری موجود ہے" وہ لکھتے ہیں کہ "عمارؓ بن یاسر کو کفار مکہ نے بہت اذیت پہنچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر انہوں نے رہائی پائی، پیغمبرؐ صاحب نے اس فعل کو پسند کیا اور فرمایا کہ "اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر اسی طرح انکار کر دینا" (واقدی ۱/۲/۲۲۷) ایک اور روایت خاندان یاسر میں چلی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا اور جب تک کہ ان سے محمدؐ صاحب کی مذمت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی، ان کو نہ چھوڑا، جب وہ پیغمبرؐ صاحب کے پاس آئے اور انہوں نے حال پوچھا تو کہا کہ یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی جب تک کہ میں نے آپ کی مذمت اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا، پیغمبرؐ صاحب نے پوچھا کہ تمہارے دل کا کیا حال ہے تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے، تب محمدؐ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر یہی کہہ دینا، محمدؐ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ "عمار کا جھوٹ ابوجہل کے سچ سے بہتر ہے۔"

سر ولیم میور کی اس نکتہ چینی کے جواب میں سر سید کو شکسپیر کا یہ قول یاد آ گیا کہ "دیکھو کہ ایک سادہ قصہ کس طرح تم کو دھوکہ دیتا ہے" اس کے بعد وہ "اس نکتہ چینی" کا تجزیہ کرتے ہیں:

"اول تو ان روایتوں کی جن کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معتبر سند درکار ہے، دوسرے جن الفاظ میں موصوف نے اس مضمون کو بیان کیا ہے

وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں، سر ولیم اول موقع جھوٹ بولنے کے جواز کا کسی کی جان بچانا کہتے ہیں، اول تو یہی غلط ہے جو روایتیں انہوں نے بیان کی ہیں ان کے مطابق ان پر لازم تھا کہ ''اپنی جان بچانا لکھتے'' اور اس بے دھڑک اور جرأت آمیز بیان کے بجائے سر ولیم کو لازم تھا کہ تمام شرطیں، قیدیں اور مواقع جو ''سچ'' سے اس طرح انحراف کو جائز ٹھہراتے ہیں واضح کر دیتے، جس فریب دہ اور عیب دار پوشاک میں سر ولیم میور نے اس مضمون کو آراستہ کیا ہے، اگر وہ اتار لی جائے تو جائز، منصفانہ دلیل اور صحیح اصول و مقدمات کے ذریعہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ ''اگر اہل کفر، بے رحم اور جفا کار لوگ جبر و اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی آدمی سے اس چیز کا انکار کرالیں جس کو وہ اپنے دل سے، اپنے ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس پر ایسی مصیبت میں بھی وہ یقین رکھتا ہو تو ایسے وقت میں ''اپنے انکار'' سے وہ سزائے ارتداد کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔'' (خطبات احمدیہ ص ۴۰۵)

وہ عہد و پیمان جن کی تکمیل و توثیق ظلم اور جبر کے زور سے کی گئی ہو، ان سے انحراف کا جواز سر سید کے الفاظ میں ''فرانسس اول بادشاہ فرانس کی مشہور و معروف نظیر سے بھی ثابت ہوتا ہے، اس بادشاہ کو چارلس خامس چنگ پا دیا (۱۵۲۵ء) میں قید کر کے ماڈرڈ کے ذلت آمیز صلح نامہ پر بزور منظوری حاصل کر کے دستخط کرا لیے تھے، بادشاہ فرانس نے اس قید سے چھوٹتے ہی زور و زبردستی کا عذر ظاہر کر کے اپنے قول و قرار پر قائم رہنے سے انکار کیا اور پوپ کلیمنٹ سابع نے اس کو اس جبریہ حلف سے بری کر دیا۔''

سر سید ظلم اور جبر سے لیے ہوئے ''عہد و پیمان'' کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ '' آدمی کے افعال میں جرم اور بے جرمی کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے اور اس بنا پر تمام لوگ افعال کو نیک و بد قرار دیتے ہیں، کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص

سے اس کو اذیت دے کر اور قتل کی دھمکیوں کے بعد زبانی طور پر یا تحریری صورت میں حاصل کر لیے گئے ہوں، اسی قدر سزا کے مستحق ہوں گے جیسے کہ اس آدمی کے کلمات اور حرکات جو کسی جبر اور زبردستی کے بغیر اس سے سرزد ہوئے ہوں، سرسید نے اس موقع پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ:

''یہ اصول جس سے اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے اور جو محض ایک بے خطا اصول اور قدرتی فطرت کا سچا نمونہ ہے اور جس کو سر ولیم میور نے قابل اعتراض انداز اور خراب صورت میں پیش کیا ہے، قرآن مجید میں صاف اور سادہ طریقہ سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا ایمان لے آنے کے بعد، سوائے اس آدمی کے جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور جس نے کفر سے اپنے دل کو مطمئن کر لیا تو ان پر خدا کا غصہ ہے اور ان پر بڑا عذاب ہے'' (نحل ۱۰۸) اس آیت پر فقہا نے غور کیا ہے اور دو صورتیں بیان کی ہیں، اول عزیمت کی، یعنی آدمی اہل کفر کی طرف سے اذیتوں، تکلیفوں اور قتل کے خوف کے باوجود ظاہر میں بھی اسی سچ پر قائم رہے جس پر وہ ایمان رکھتا ہے، دوم رخصت کی صورت یعنی ایسی صورت میں اس کو یہ اجازت ہے کہ اس ایمان کا انکار کر دے جس کی تصدیق اس کے دل میں موجود ہے اور اس طرح وہ دشمنوں کی ایذا سے اپنے آپ کو بچا لے، یہ عجیب بات ہے کہ اس صاف اور سیدھی بات سے سر ولیم میور نے وہ ''مقدس جھوٹ'' ثابت کرنا چاہا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا، پھر انہوں نے اپنے مقصد اور مفہوم کے لیے یہ چند الفاظ ''کسی کی جان بچانے کے لیے'' کافی سمجھے جو گمراہ کن ہیں، جب کہ قرآن میں بھی جو اپنی

فصاحت اور اختصار میں بے مثل ہے، اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے
ایک پوری آیت درکار ہوتی ہے۔'' (خطبات، ۴۰۷)

دوسرا موقع جواز کذب کا بقول سر ولیم میور وہ ہے جب کہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور جس روایت سے انہوں نے یہ استدلال کیا ہے اس کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اور اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ ''وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کرائے اور ان کے رفع نزاع کے لیے کلمات خیر کہے جھوٹا نہیں ہے، گو وہ کلمات جھوٹے ہوں'' مگر سر سید کے نزدیک:

''یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے، محض غلط ہے، اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے جس کو مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے، ہم بجنسہ اس کو درج کرتے ہیں، اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ام کلثومؓ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لیس الكذاب الذی یصلح بین الناس فیقول خیراً ویمنی خیراً (متفق علیہ)	وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو آدمیوں کے درمیان صلح کرا دے، پس بھلی بات کہہ دے اور بھلائی پہنچا دے۔''

قاضی بیضاوی نے اس حدیث کی شرح اس طرح کی ہے کہ ''وہ اس کے پاس ایسی باتیں پہنچا دے جن کو سن کر وہ مان جائے اور اپنی شر کی باتوں کو چھوڑ دے۔

سر ولیم میور کی عربی دانی کا خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ خود اصل حدیث پر غور کرتے اور خود اس کا صحیح ترجمہ کرتے، انہوں نے کپتان ای-این میتھیو کے غلط ترجمہ مشکوٰۃ کو اختیار کیا اور کپتان میتھیو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ ''گو وہ کلمات دروغ ہوں'' اپنے ترجمے میں بڑھا دیے، جب کہ وہ الفاظ

حدیث میں نہیں ہیں۔

ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے نہ بیان کرے اور قصداً کسی بدنیتی سے اس ماجرے کی کوئی بات کہے اس پر بھی کذاب کا لفظ بولتے ہیں، اس لیے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے تو وہ کذابوں میں نہیں، یعنی جو سزا ایسے شخص کے لیے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے، اس سزا کا مستحق یہ آدمی نہ ہوگا جس نے صلح کی غرض سے صرف اچھی باتوں کا تذکرہ کیا ہو۔"

(خطبات احمدیہ، ص ۴۰۸)

تیسرا اور چوتھا جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں، وہ ہے کسی عورت کو ترغیب دینے میں یا سفر یا مہم میں، کسی عورت کو ترغیب دینے کے الفاظ بھی سخت گمراہ کن ہیں، جب کہ سر ولیم میور کی مراد "اپنی بیوی کو ترغیب دینے" اور اس کی دلداری کرنے سے ہے، وہ لکھتے ہیں کہ تیسرے موقع کے لیے "ہمارے پاس ایک افسوس ناک نظیر موجود ہے کہ محمدؐ صاحب نے ماریہؓ قبطیہ کے معاملہ میں اپنی (دوسری) ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے کو معیوب نہ سمجھا" اور چوتھے موقع کی مثال یہ دی ہے کہ پیغمبرؐ صاحب کا معمول تھا کہ "ترتیب مہمات کے وقت (تبوک کی مہم کو مستثنیٰ کر کے) اپنے اصل مدعا کو پوشیدہ رکھتے تھے اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کر دیتے تھے" سر سید نے ان دونوں موقعوں کی جو وضاحت کی ہے وہ درج ذیل ہے:

"سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے وہ محض غلط ہے، کوئی صحیح روایت اس معاملہ میں قابل اعتبار موجود نہیں ہے اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا اور

چونکہ بنیاد کے استحکام اور ضعف ہی سے اوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے، پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو، کافی ثبوت نہ ہو۔

ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو عام کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں ہے لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہیں جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے اعلان جنگ نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے طرف ثانی کو دھوکہ ہو، بلاشبہ اخلاق اور صداقت کے خلاف ہے لیکن جب جنگ کا اعلان اور اشتہار دے دیا جائے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو اور اس سے اپنے عزائم اور جنگی منصوبوں کو مخفی رکھنا صداقت کے خلاف نہیں ہے۔''

(خطبات احمدیہ، ص ۴۰۹)

اسلامی روایات میں ''مقدس جھوٹ'' کی جستجو کے لیے سر ولیم میور نے جو جانفشانی کی ہے، سر سید احمد خاں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور اس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آتا ہے مذہب اسلام پر عائد کرنا چاہتے ہیں، مقدس جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہوگا، کیونکہ صدق حقیقی قرآن کا لب لباب اور جوہر ہے اور سچائی اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے، جب کہ ''مقدس جھوٹ'' کا تصور قرآنی سچائی کے برخلاف ایک دوسری چیز ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جیسا کہ تاریخ میں ہے صاف صاف ثابت ہوتا ہے، ارکان مذہبی میں ایک رکن ''مقدس جھوٹ'' بھی تھا اور ہم کو تعجب ہے کہ مقدس پال حواری اس کو گناہ تو کیا سمجھتا، برا بھی نہیں جانتا تھا، اس بات کو عیسائی عالموں نے خود مقدس پال

کے اس کلام سے ثابت کیا ہے کہ ''اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اور اس کی بزرگی زیادہ ہوئی تو کس لیے میں گنہگار گنا جاتا ہوں'' (پال کا خط رومیوں کو، باب ۳ ورس ۷) سرسید تاریخی کتابوں سے اس مقدس جھوٹ کا جو عیسائیوں میں رائج تھا، ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ ''کرسچین میتھالوجی ان فیلڈ'' نامی کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ''کلیسا کا شریف اور راست باز فرزند موشیم جس کی سند اور تسلیم شدہ سچائی پر پادریوں نے کبھی نہیں شبہ کیا، وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ پیروان افلاطون وفیثا غورث کا یہ اصول تھا کہ صدق و پرہیزگاری کی صفات کو ترقی دینے کی غرض سے دھوکہ دینا یا بوقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے ہی مصر کے یہودی پیروان افلاطون وفیثا غورث سے یہ اصول سیکھ چکے تھے، جیسا کہ بے شمار تحریروں سے کسی حجت اور اعتراض کے بغیر یہ بات ثابت ہو چکی ہے، عیسائیوں میں یہ غلطی دونوں راستوں سے دراندازہوئی، چنانچہ ان کے یہاں نامی گرامی اشخاص کی طرف بے شمار کتابوں کو غلط طور پر منسوب کیے جانے سے یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی، موشیم کے بیان کے مطابق صرف دوسری صدی ہی میں بے شمار انجیلیں اور خطوط گڑھے گئے اور دوسروں کی طرف غلط طریقہ سے منسوب کر دیے گئے، چوتھی صدی میں دینی مقاصد کی ترقی کے لیے دھوکہ اور مقدس جھوٹ پچھلے زمانوں سے بھی بڑھ گیا تھا، کسوبن نے یہ لکھا ہے کہ ''دین عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں مجھے یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کلام ربانی میں اپنی طرف سے باتیں ملا دینے کو ناموری سمجھتے تھے، صرف اس لیے کہ ان کے نئے عقیدوں کو عقلاء کفار (غیر مسیحی فضلا) گوش دل سے سنیں گے (کرسچین میتھالوجی ان فیلڈ، ص۸۲-۸۰) اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ معلوم ہوتا کہ انجیل کی کوئی بات دین داروں یا ملکی حاکموں کے اغراض کے موافق نہیں ہے تو اس میں ضروری تبدیلیاں اور تحریفات کر لی جاتیں، اس کے علاوہ طرح طرح کے اور مقدس جھوٹ اور جعل سازیاں جو

رائج تھیں، ان کو بہت سے پادریوں نے جائز قرار دیا تھا، (ایضاً ص ۵۲) اسی کتاب میں یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ ''اول کی تین صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں اور جو کچھ علم ہے وہ نہایت خراب اور بگڑے ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ان روایتوں اور حکایتوں کے بیان کرنے والے جو اس زمانہ میں گزرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں، یہ محض مقدس جھوٹ اور جعل سازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں، مگر ان موروثی کرتبوں اور ہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ ان سے بھی سبقت لے گیا، وہ خود فخریہ بیان کرتا ہے کہ ''جس بات سے ہمارے دین کی عظمت اور نام آوری بڑھے میں نے بیان کر دیا ہے اور جو اس کی تحقیر و تذلیل کی طرف مائل ہو، میں نے سب چھوڑ دیا ہے (ایضاً ص ٦٦) مندرجہ بالا مثالوں کو نقل کرنے کے بعد سر سید نے مقدس جھوٹ کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ:

> '' (دور اول کے عیسائی مؤرخین) کی تحریروں میں ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے، جسمانی خواہش اور خوف ایمانی کے درمیان غلبہ حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں.......... اور انجیل کی بے شرمانہ تحریفات اور تصرفات کی مدد سے کلیسائے روم نے عجیب و غریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر پھیلا دیا تھا جس نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا، انہوں نے اس مقولہ کی تلقین کی جو موشیم کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا جب کہ ان سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں، کار ثواب ہے'' کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس بے قید اصول نے دروغ گوئیوں اور جعل سازیوں کے چشمے کا دہانہ کھول دیا جس کا پانی ابتداءً دین عیسوی کی سرزمین پر طوفان کی طرح چھا گیا اور جس نے ان فریبوں اور باطنی صفات کو رواج دیا جو اس زمانہ میں عیسائیان رومن کیتھولک کی بدنامی کا

سبب ہیں (دور اول کے یہ عیسائی مورخین) اور اول سے آخر تک ان کے سوانح نگار کفر آمیز سفلگی، عقیدہ میں خوش فہمی، تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے لیکن اس کے باوجود پطرس حواری کے جانشینوں نے ایسے لوگوں کو پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں جگہ دی ہے۔

سر ولیم میور کے لیے یہ مناسب تھا کہ مذکورۂ بالا حالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اسلام پر مقدس جھوٹ کا الزام لگانے کی بے جا طور پر کوشش نہ فرماتے، اسلام سرتاپا صدق ہے، وہ نہایت درجہ کی سچائی اور راست بازی کا دین ہے اور اسی حیثیت سے اس کو یہ حق ہے کہ دوسرے دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے، اپنی فوقیت اور برتری کے لیے دعویدار ہو۔" (خطبات احمدیہ، ص ۴۱۳)

اختلاف قرأت قرآن اور بائبل میں: بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قرآن سات حرفوں میں اترا ہے جس طرح آسان ہو پڑھو" اختلاف قرأت فنِ تجوید قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے سمجھنے میں عیسائی مصنفوں کو سخت دھوکہ ہوا اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بائبل (عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں) میں اختلاف قرأت ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی اختلاف قرأت ہے، حالانکہ یہ دونوں بالکل مختلف ہیں اور جو اسباب عہد عتیق اور عہد جدید میں مختلف قرأتوں کے پیش آتے ہیں، ان میں اور قرآن مجید کی قرأت سبعہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اگر ہم قرآن مجید کی قرأت سبعہ یا اختلاف قرأت کو ان ہی معنوں میں لیں جن معنوں میں عیسائیوں نے لیا ہے تو یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے قرآن مجید میں اس قسم کا اختلاف قرأت سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، مسلمانوں میں اختلاف قرأت کی تمام صورتیں صحیح اور درست ہیں لیکن بائبل کے اختلاف قرأت کی نوعیت بقول ریورنڈ مسٹر ہارن یہ ہے

کہ ''دو یا زائد مختلف قرأتوں میں سے صرف ایک ہی قرأت صحیح ہو سکتی ہے اور باقی کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی'' وہ عہد عتیق اور عہد جدید میں اختلاف قرأت کے درج ذیل اسباب بیان کرتے ہیں:

(۱) ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) جن نسخوں سے نقل کیا گیا ہے ان میں پہلے سے سقم اور غلطیوں کا پایا جانا (۳) کسی معتبر سند کے بغیر کاتبوں کی طرف سے متن کی عبارت میں اصلاح کی خواہش (۴) وہ تحریفات جو کسی فریق کے حصول مدعا کے لیے قصداً کی گئی ہوں۔

بائبل کی اختلاف قرأت کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی قرآن کے اختلاف قرأت کی اصطلاح سے تعلق نہیں رکھتی، قرآن مجید میں اختلاف قرأت کی ایک صورت جو دور اول میں پائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں نے جتنا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، مختلف سورتیں یا آیتیں، وہ اپنی بیاضوں میں چمڑے کے ٹکڑوں پر یا اور دوسری چیزوں پر بغیر کسی ترتیب کے لکھ لیا کرتے تھے لیکن چونکہ قرآن کی تلاوت کا رواج تھا تراویح میں پورا قرآن پڑھا جاتا تھا، قرآن کے حافظ موجود تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ترتیب طے شدہ تھی، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں تمام صحابہ کی رائے سے حافظوں اور دوسری تحریروں کی مدد سے حضرت زیدؓ بن ثابت کی نگرانی میں قرآن کو ایک مجلس میں مرتب کرلیا گیا، اس لیے نامکمل بیاضوں کی وجہ سے جن میں ادھر ادھر بے ترتیب آیتیں لکھی ہوئی تھیں، قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ناواقفیت کی بنا پر اب بے ترتیبی کا امکان ختم ہو گیا ور جب حضرت عثمانؓ کے عہد میں زیدؓ بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید کی نقلیں مسلمانوں میں تقسیم کردی گئیں تو اختلافِ قرأت کی مذکورہ بالا کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہ گیا۔

دنیا کی ہر ایک زبان کی طرح عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی بعض لفظوں کا تلفظ

کئی طرح کیا جاتا تھا، قرآن کریم کی سات قرأتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایسے الفاظ کو مختلف قبیلے اپنے اپنے تلفظ کے مطابق پڑھ سکتے ہیں لیکن جہاں تک قرآن مجید کی کتابت کا تعلق ہے تحریر کی حد تک الفاظ قرآن کے تلفظ کا یہ اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہو گیا ہے، چنانچہ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

> ''قریش کے تلفظ کو سند قرار دینے میں کامیابی ہوئی ہے، قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اور اسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھا کرتے تھے لیکن چونکہ اس زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ دوسرے قبیلوں سے ادا نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا، مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے، مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید پڑھنے میں محسوس ہوگا نہ کہ اس کی املا میں اور اسی لیے وہ اختلاف ضبطِ تحریر میں نہیں آسکتا، اس کا اندازہ کرنے والے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۴۳۵)

حاضر و غائب کے صیغوں یا اعراب و ابواب کا اختلاف جو پایا جاتا ہے، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور پھر چند ہی جگہوں میں ہے جس سے قرآن مجید کے اصلی مطلب یا احکام میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا اور قرآن مجید کے حاشیوں میں ان کو بھی ذکر کیا گیا ہے اور تفسیروں میں ان پر پوری بحث موجود ہے، اس لیے:

> ''جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور جو الزام عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے، اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قرآن کی آیات میں

تصرف کرنے اور کمی بیشی کرنے کا یا آیتوں کو چھپا ڈالنے کا عائد نہیں ہوسکتا،
علم وادب کی یہ شاخ جو قرآن مجید کی عبارت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے
اور جس کا نام علم تجوید ہے، اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور علما نے
شرح وبسط سے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔'' (ایضاً ص ۴۳۶)

ناسخ ومنسوخ کے بارے میں: حالات اور موقع ومحل کی مناسبت سے احکام شریعت میں تبدیلی انبیائے کرام کے ذریعہ بحکم خداوندی ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے، اس تبدیلی کو نسخ کہتے ہیں، حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ کہا جاتا ہے، فقہائے اسلام کے یہاں ناسخ ومنسوخ کے مفہوم میں مزید وسعت پیدا کر دی گئی، مثلاً انہوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہے اور پھر کوئی خاص آیت ان کو ایسی ملی جس سے اس عام حکم میں کسی حالت میں استثنا پایا جاتا تھا تو انہوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی، اس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا، حالانکہ یہ صرف ایک فرضی اصطلاح ہے اور بقول سرسید احمد خاں فقہا نے یہ رائے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقوں کو آسان بنانے کے لیے اختیار کی ہے، مگر اس سے یہ بات کہ درحقیقت قرآن میں ناسخ ومنسوخ ہے، لازم نہیں آتی۔

قرآن مجید کی آیت نسخ اور فقہا کی اصطلاح ناسخ ومنسوخ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائی عالموں نے دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے اور ان کو صریح مغالطہ ہوا ہے جس کا اندازہ درج ذیل جملوں سے ہوتا ہے:

''مرضی الٰہی کے دائمی اور کامل اندازے کے بجائے قرآنی آیات
محمدؐ کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں، ہر وحی ان کی حکمت عملی یا خواہش
کے مناسب ہے اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول کے ذریعہ رفع ہوگیا کہ
کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیلی یا ترمیم ہوگئی ہے'' (گبن)

''اگر چہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے مگر مسلمان اس اجتماع ضدین میں تطبیق کی تابہ امکان کوشش کرتے ہیں، تاہم مجبوراً ان کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ کم سے کم دوسو پچیس آیتیں منسوخ ہیں۔''

(سر ولیم میور)

سر سید احمد خاں ناسخ و منسوخ کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ عیسائی عالموں نے ان لفظوں کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا، بیکار کر دیا ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے، مسلمانوں میں تو اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فریضہ ہے کہ خدا تعالیٰ علّام الغیوب ہے، یعنی اس کو ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں علم ہے، اس لیے اگر یہ سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ کے پہلے حکم میں کوئی نقص تھا جو بعد کو ظاہر ہوا اور پھر دوسرا حکم دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے کمال علمی میں نقص تھا اور ایسا عقیدہ اسلام کی رو سے کفر ہے، اس لیے مسلمانوں میں ناسخ و منسوخ کا مطلب وہ نہیں ہے جو عیسائی علما سمجھتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ زمانہ اور حالات میں تبدیلی کی وجہ سے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تبدیلی کی گئی، جس کی مثال بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کی شریعت سے پہلے ایک مرد اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کر سکتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا لیکن اس کے مرنے کے بعد کر سکتا ہے، حضرت موسیٰؑ نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور گھر سے باہر نکال دے، اس حکم کو بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا کہ مرد اپنی بیوی کو کسی صورت سے طلاق نہیں دے سکتا جب تک کہ اس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا لیکن یہ

قید لگائی کہ اگر کسی شدید ضرورت اور معقول وجہ کے بغیر طلاق دے گا تو وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوگا، ناسخ ومنسوخ کی اس تشریح کی روشنی میں قرآن مجید کی آیتوں پر لفظ منسوخ کا اطلاق نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی اور نہ نازل ہوگی، البتہ پچھلی شریعتیں منسوخ ہوئیں مگر اس مفہوم میں نہیں جو عیسائیوں کے یہاں جانا جاتا ہے، یعنی خدا کے علم میں تغیر یا نقص واقع نہیں ہوا، بلکہ نئے حالات اور نئی ضرورتوں کی وجہ سے اس نے نیا حکم دیا اور پچھلی شریعت خدا کے علم میں پچھلے زمانہ ہی کے لیے تھی، قرآن مجید کی آیت (مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ...... مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا...... قَدِيْرٌ، بقرہ: آیت ۹۹--۱۰۰) سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے، بلکہ اس میں صاف طور پر اہل کتاب کا ذکر ہے جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی بیشی ہوگئی ہے، ان کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ ہم جس آیت یعنی اہل کتاب کی شریعت کے کسی حکم کو منسوخ کرتے یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مانند حکم بھیج دیتے ہیں۔

ناسخ ومنسوخ کے دوسرے معنی ایک فقہی اصطلاح کے طور پر ہیں اور فقہا کی اس اصطلاح کا اطلاق قرآن وحدیث پر بھی ہوتا ہے لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عیسائی سمجھتے ہیں، قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں ایسے احکام ہیں جن کا تعلق ایک ہی معاملہ سے ہے مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں، جب وہ حالات باقی نہیں رہتے تو ان احکام کی تعمیل واجب نہیں رہتی اور دوسرا حکم جو تبدیل شدہ حالت کے مطابق ہو، نافذ ہوجاتا ہے اگرچہ پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے کو ناسخ کہیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر پہلی حالت پھر واپس آجائے تو اس کا حکم بھی دوبارہ نافذ کرنا ہوگا نہ کہ دوسرا حکم، مثلاً جب شراب کی ممانعت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کو بھی جن کا خاص طور پر عربوں میں رواج تھا ممنوع قرار دیا، مگر جب یہ حکم سب لوگوں کو معلوم

ہو گیا اور شراب پینے کا رواج بھی ختم ہو گیا تو آپ نے ان پیالوں کے استعمال کی اجازت دے دی، اسی طرح جب مکہ میں کفار قریش کی حکومت تھی اور مسلمان محکوم تھے تو مسلمانوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم دیا گیا اور جب یہ مسلمان دوسرے ملکوں میں چلے گئے تو اس وقت جہاد کے احکام دیے گئے، ان دونوں مثالوں میں پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہیں گے، یہ فقہا کی اصطلاح ہے لیکن اگر پہلے والے حالات دوبارہ پیش آئیں تو وہ حکم بھی دوبارہ نافذ ہو جائے گا جسے فقہا نے منسوخ کہا ہے اور ناسخ پر عمل درآمد نہ ہوگا۔

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحات ہیں جو علما نے مقرر کی ہیں، محققین علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ ناسخ و منسوخ کے الفاظ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت استعمال نہیں کیے گئے، عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں سے سنا کہ قرآن مجید میں جھگڑا کرتے ہیں تو فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اس لیے کہ انہوں نے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا (رد کیا) خدا کی کتاب تو اس لیے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو، پس بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو، اس میں سے جو جانو وہ کہو اور جو نہ جانو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔ (مسند احمد و ابن ماجہ) (خطبات احمدیہ، ص ۴۲-۴۳۲)

سر ولیم میور نے یہ جو لکھا ہے کہ "قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں"، یہ محض بے سند خیال ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ نزول قرآن کے دور اول میں کچھ لوگوں نے اپنی غلطی سے قرآن و حدیث میں تمیز نہ کی ہو، بہت سی حدیثوں کو غلطی سے قرآن کا جز سمجھ لیا ہو اور قرآن مجید میں وہ حصے نہ پا کر یہ گمان کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہو گئی ہیں اور قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں، مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جس کو ہوا، خود اس کی غلطی ہے۔ (ایضاً ص ۴۴۷)

سر ولیم میور نے آیتوں کے منسوخ ہونے کے بارے میں جو طویل بحث کی ہے، وہ قواعد اسلام کی رو سے درست نہیں ہے اور اس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے، مثلاً ان کا بیان ہے کہ ''اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مقصد کے لیے تھا جو عارضی حالات کی وجہ سے سامنے آیا اور جن کی عظمت بہت جلد جاتی رہی، یہ بات مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ صاحب کے نزدیک اس قسم کی آیتوں سے ان کی عام عظمت یا ان کو رائج کرنا مقصود تھا یا نہیں، قرینہ سے تو یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ ان حصوں کی حفاظت کی انہوں نے کوشش کی ہو۔''

سر ولیم کسی دلیل یا شہادت کے بغیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ حصے ایسے بھی شامل ہو گئے ہیں، جن کی حیثیت عارضی تھی، یعنی وہ منسوخ ہو چکے ہیں لیکن بقول سر سید احمد خاں ''یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی، اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معنی نہ سمجھنے کے سبب یا غلط معنی سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنی عیسائی مصنف سمجھتے ہیں ان معنوں میں قرآن مجید کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہے اور اگر اس لفظ کے وہ معنی لیے جائیں جس میں مسلمان فقہا نے اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے، تب بھی کوئی آیت (عارضی مدت یا) محدود مقصد کے لیے قرآن مجید میں موجود نہ تھی اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۴۶۹)

قرآن مجید اور حضرت عثمانؓ: مسٹر گاڈفری ہیگنز عموماً قرآن، اسلام اور سیرت رسولؐ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں مگر وہ اپنے اچھے خیالات کے باوجود ایک جگہ قرآن کے بلند اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ ''یہ امر اس کے (یعنی قرآن مجید کے) مصنف کی لازوال نیک نامی کا سبب ہے، خواہ وہ محمدؐ عرب کے نامی پیغمبر ہوں، یا ان کے تیسرے خلیفہ عثمانؓ'' (خطبات احمدیہ، ص ۴۶۳) یہ ایک ایسی رائے ہے جو قرآن کے بارے میں دانستہ طور پر غلط.......... کہی جا سکتی ہے اور غلط فہمی پھیلانے کے لیے لکھی گئی ہے، قرآن کے صفحات گواہ ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے اور تاریخ سے بھی یہی

ثابت ہے، حضرت عثمانؓ کے پاس تلاوت کے لیے جو قرآن تھا، وہ وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے اتارا گیا اور جسے تمام صحابہ رسولؐ کے اتفاق سے اور ان کی نگرانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق اسی ترتیب کے مطابق جو مسلمانوں میں پہلے سے معروف تھی اور جس کو قرآن کے حافظ اپنے سینوں میں اسی کے مطابق پاتے تھے ایک جلد میں اکٹھا کیا گیا تھا اور حضرت عثمانؓ نے اسی کی نقلیں دنیائے اسلام میں بھجوادی تھیں، اس لیے گاڈفری ہیگنز کا یہ الزام غلط بیانی کی ایک بری اور افسوس ناک مثال ہے، پیغمبرؐ صاحب قرآن کے مصنف نہ تھے، مسیحی علما قرآن کی الہامی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے مگر جو ان میں اہل انصاف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی ہے جو تورات وانجیل کا ہے اور قرآن کی زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی زبانوں میں جو فرق ہے، قرآن کا جو دعویٰ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چالیس برس تک اس کے علوم ومعارف سے ناواقف رہنا، آپ کا امی ہونا، قرآن کی فصاحت، اس کا اسلوب بیان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا انداز تخاطب، یہ تمام باتیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ قرآن اپنے لفظ ومعنی دونوں میں خدا کی طرف سے ایک ہدایت نامہ ہے مگر تعصب اور جہالت کا کوئی علاج نہیں۔ (خطبات، ص ۲۱-۴۲ وغیرہ)

قرآن کی فصاحت اور صحیفہ ایوبؑ، گبن کا اعتراف:

گبن نے اپنی تاریخ میں ایک بات یہ لکھی ہے کہ ”قرآن کے بلند ترین خیالات صحیفہ ایوبؑ کی شاندار سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں“ لیکن سرسید احمد خاں کے بقول گبن میں اس قدر علمی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قرآن مجید اور صحیفہ ایوبؑ کا باہمی فرق بتا سکیں:

”ہم کسی اعتراض کا اندیشہ کیے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم

عربی دانوں نے قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت میں بے مثل قرار دیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اس سے فائق نہیں، نہ پہلے اور نہ اس کے بعد، لبید جیسا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی چند آیتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا اور اس کی بلاغت کو انسانی قوت سے برتر ہونے کا اقرار کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر لیا، مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ ''سب سے اول اور سب سے آخر جو بھی خوبیاں ہیں وہ قرآن میں موجود ہیں، وہ ہر قسم کے اچھے اوصاف کا بانی ہے بلکہ دراصل ہر قسم کے وصف اور خوبی کی بنا صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔'' (ایضاً ص ۴۶۲)

سر سید نے مسٹر سیل کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ ''یہ بات مسلم ہے کہ قرآن، قریش کی زبان میں جو اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب قوم ہے، نہایت لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے، وہ بے شبہ عربی زبان کا ایک نمونہ ہے، اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا، وہ لازوال معجزہ ہے جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنے بارے میں رب کی طرف سے ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے، اس کتاب کی خوبیٔ تحریر کی ان لائق لوگوں نے تعریف کی جن کا اس کام میں مبصر ہونا تسلیم کیا جاتا ہے، جس کی بے شمار مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ لبید بن ربیعہ کا ایک قصیدہ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آوروں میں تھا، خانۂ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا (جو عربوں میں کسی اعلی التصنیفی کارنامہ کے لیے ایک بڑی عزت کی بات تھی) کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں اپنی کسی تصنیف کو پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن کچھ دنوں کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ کی چند آیتیں کسی نے اس کے مقابلہ میں لگا دیں تو خود لبید (جو اس زمانہ میں مشرکوں میں تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور فوراً مذہب اسلام کو قبول کر لیا اور اس نے یہ بیان کیا کہ ایسے الفاظ

صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔
(خطبات، ص ۵-۴۶۴)

قرآن مجید کے ساتھ ناشائستہ طرزِ عمل : یورپ کی زبانوں میں عیسائیوں نے قرآن مجید کے جو ترجمے کیے، گاڈفری ہیگنز کا تبصرہ ان کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوگا، وہ لکھتا ہے کہ "اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح شائع ہوتا کہ ہر لفظ کو متین اور شائستہ معنی کے بجائے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت کا مضمون، جوڑ توڑ، ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف کے سر معیوب معنی ڈالنے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی۔" (ایضاً ص ۴۶۶)

مگر اسی کے ساتھ سر سید احمد خاں چند عیسائی مصنفوں خصوصاً مسٹر سیل کے ممنون ہیں جنہوں نے بڑی کوشش سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اگرچہ وہ کہیں کہیں صحیح اور غلط تفسیر میں تمیز قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے، تاہم ان کی کوشش قابل قدر ہے۔

بے سروپا حکایات : ان عیسائی عالموں اور مستشرقوں نے عجیب عجیب خیالات جن کی کچھ بنیاد نہیں قرآن مجید کی نسبت ظاہر کیے ہیں، چنانچہ ہمفری پرویڈ وڈین آف ناروچ نے لکھا ہے کہ:

> "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو سکھاتے تھے کہ اس کتاب کا اصلی نسخہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے اور جبریل میرے پاس ایک ایک سورہ کی نقل جس کی لوگوں میں حسب موقع شائع کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، لایا کرتے ہیں۔"

لیکن بقول سرسید ''یہ بیان ایک ایسا بیہودہ بیان ہے جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے، جب کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گزرتا ہے تو وہ حیرت اور تعجب میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کہاں سے اور کیوں کر لکھا گیا'' مشہور مؤرخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے جو لکھتے ہیں کہ ''وجود قرآن بقول آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ان کے متبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الٰہی میں موجود ہے اور نور کے قلم سے لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے، اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیلؑ فلک اول پر لے آئے تھے'' لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں ''لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق، ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہنچا'' ڈین پریڈو کی دلچسپ اور انوکھی باتیں جو بقول سرسید کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہیں، ان کا بیان ہے کہ ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی اور انہوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا جس کا نام صندوق رسالت تھا اور ابوبکرؓ نے جو ان کے جانشین ہوئے، سب سے اول اس کو جمع کیا، کیونکہ جب مسیلمہ نے ان ہی کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو ایسی ہی کامیابی کی امید میں اسی طرح اس نے ایک قرآن مرتب کیا اور اس کی ایک کتاب بنا کر اپنے پیرووں میں شائع کی، اس وقت ابوبکرؓ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرآن کو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا'' مگر جیسا کہ سرسید نے تحریر کیا ہے کہ:

> ''(مذکورۂ بالا) یہ چند مثالیں ان سیکڑوں بیہودہ باتوں میں سے ہیں جو عیسائی مصنفوں کی تمام تحریروں میں اسلام کے بارے میں پائی جاتی ہیں، سر ولیم میور نے اپنے استدلال میں مسلمانوں کی مذہبی باتوں

سے کسی قدر واقفیت ظاہر کی ہے لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انہوں نے بحث کے لیے صرف ان روایتوں کا انتخاب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف، سب سے زیادہ کمزور اور سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ نا قابل اعتبار خیال کرتے ہیں، یا ان کے مطلب اور مقصد کے بارے میں مختلف الرائے ہیں.........سر ولیم اپنی کتاب کے حاشیہ میں مارکسی درویلس سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ''عبداللہ بن مسعود نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ایک آیت کو لکھ لیا اور صبح کو اسے کاغذ پر سے اڑا ہوا پایا جس کے بارے میں پیغمبرؐ صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اڑ گئی، اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزاتی مضمون اور بڑھا دیا گیا کہ اس آیت کا اڑ جانا بہت سے مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا'' ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کے نام بھی معلوم نہیں گردشیمی کے کبوتر کی طرح بے بنیاد اور صریح ایجاد ہے اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سر ولیم میور نے بھی کہا ہے کہ ''اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور وہ بے شبہ ایک بناوٹ ہے۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۴۶۸-۷۰)

سر ولیم میور کی ''وحی کامل'': سر ولیم میور نے ایک نئی اصطلاح ''وحی کامل'' کی مسلمانوں کے مذہب میں استعمال کی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے مطابق ہے اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ ''وحی کامل سے میری مراد اس وحی سے ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخیر زمانہ میں موجود اور رواج پائی ہوئی تھی جو شاید ضائع یا غارت یا غیر مستعمل ہوگئی ہو لیکن سر سید فرماتے ہیں کہ:

''اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، شاید آیات محکم کا

ترجمہ سر ولیم میور نے وحی کامل کیا ہو لیکن آیات محکم کے وہ معنی نہیں ہیں جو سر ولیم میور نے کیے ہیں لیکن اگر ہم ان کی اس اصطلاح کو تسلیم کر لیں تو وحی کامل کا لفظ وحی کی اس کامل مقدار پر بولا جائے گا جو جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضائع یا غارت یا غیر مستعمل نہیں ہوئی۔" (خطبات احمدیہ، ص ۴۷۰)

قرآنی آیتوں میں ربط اور ترتیب: قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ "قرآن جس طرح ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو ہمیشہ اسی تسلسل کے ساتھ پڑھنے کے لیے فرمایا ہو، مضامین کی ابتر ملاوٹ، زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جا بجا بے ربطی، کسی جز کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو، بعض اوقات اس آیت میں پہلے سے درج ہونا جو اس سے کافی عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہو چکی ہو، کسی حکم کا ایسے حکم کے بعد ہونا جس کی اس سے پہلے حکم سے تنسیخ یا ترمیم ہوتی ہو، یا کسی دلیل کا کسی ایسے درمیانی فقرہ کی وجہ سے منقطع ہو جانا جو اپنے مقصد اور مدعا میں اس سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو، یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی ہیں کہ ترتیب موجودہ یا درحقیقت کوئی اور کامل ترتیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں مستعمل اور رائج تھی" سر سید مرحوم نے سر ولیم کے کلام میں بے ربطی کے باوجود آیات قرآنی کی ترتیب اور ان کے درمیان باہمی ربط پر درج ذیل لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے:

"ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن کی ترتیب اسی طرح جیسا کہ قرآن مجید ہے، ایسی باقاعدہ ہے اور معنوی اعتبار سے اپنی طرز خاص میں اس قدر مربوط اور مسلسل ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں

ہے، بہت سی کتابیں آیتوں کے درمیان اس معنوی رشتہ وتعلق کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے درمیان موجود ہے، قرآن مجید کی عبارت میں ایسا ایجاز اور اختصار ہے کہ دو آیتوں کے باہمی تعلق کی جن کے معنی بظاہر ایک دوسرے سے جداگانہ معلوم ہوتے ہیں، کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہیں "گونجنے والی اور سامعہ خراش، ابتر، خام، بے سری، مکرر بیانی، طول کلامی، الجھانے والی، خام اور مہمل" جیسا کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، معلوم ہوتی ہیں۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے، وہ خدا کا کلام ہے اور بجنسہ وہی الفاظ لکھ لیے گئے ہیں، کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سے ان کو محذوف رکھتا ہے مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا، عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ آیتوں کی شان نزول ان کے ذہن میں ہوتی ہے، اس لیے ان کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے، گو مسلمانوں کو ایسی دشواری نہیں ہوتی۔" (خطبات احمدیہ، ص ۴۷۱)

اس موقع پر سر سید افسوس کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "سر ولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں، اگر وہ چند مخصوص آیتوں کا نشان دیتے جن میں ان کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جابجا بے ربطی ہو تو اس وقت ہم یقیناً موصوف کی دقتوں کو حل کر دیتے اور آیتوں کے درمیان باہمی علاقہ کا نشان دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ (ایضاً ص ۴۷۲)

تدوین قرآن: ترتیب قرآن تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق پہلے سے معلوم اور مشہور تھی، صحابۂ کرام میں جو لوگ حافظ قرآن تھے ان کے سینوں میں قرآن مجید اسی ترتیب سے محفوظ تھا جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، پھر صحابۂ کرامؓ کے اجماع و اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک نسخہ تیار کر لیا گیا جس کی مختلف نقلیں حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں تمام عالم اسلام میں تقسیم کروا دیں، سر ولیم میور نے قرآن مجید کی ترتیب، اس کی تدوین اور پھر اس کی نقلوں کی تقسیم کے بارے میں بھی شبہات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں، انہوں نے مذکورۂ بالا کارروائیوں کو اپنی چابک دستی سے ایسے لفظوں میں بیان کیا ہے جن سے اس کے اغراض و مقاصد بے نقاب ہو جاتے ہیں، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

> ''اصلی جلد جو پہلی دفعہ مرتب ہوئی، حفصہؓ کے گھر میں دستیاب ہوئی اور غور و فکر کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی اگر زید اور اس کے ساتھیوں میں اختلاف پایا گیا تو ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دی گئی، اس وجہ سے کہ وہ محاورۂ قریش سے واقف تھے اور اس نئے مجموعہ کو اس طرح مکی زبان سے تطبیق دی جس میں کہ پیغمبرؐ صاحب نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا۔''
>
> (سر ولیم میور۔ خطبات احمدیہ، ص ۳۷۴)

سر سید احمد خاں نے مذکورۂ بالا اعتراض کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سر ولیم میور نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ماخذ دریافت کرنے میں ہم نہایت حیرت زدہ ہیں، مسلمانوں کے ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے، سر ولیم میور کے اعتراض میں تین جملے واضح طور پر قابل اعتراض ہیں، ''نظر ثانی''، ''اس طرح سے تطبیق دی'' اور ''نیا مجموعہ''، کسی بھی قسم کی روایت سے ہم کو اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ زیدؓ بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید میں کبھی نظر ثانی ہوئی ہو جس حدیث میں

اس کا تذکرہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں " فنخوھا فی المصاحف " یعنی اس کی چند نقلیں، انہوں نے کرلیں مگر اس روایت میں کسی مخصوص نظر ثانی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، اس روایت میں یہ عبارت بھی ہے کہ "اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیئ من القرآن" یعنی جب تم اور زیدؓ بن ثابت میں قرآن مجید کی کسی چیز میں اختلاف ہوجائے، یہاں لفظ اختلاف سے کئی مفہوم پیدا ہو سکتے تھے لیکن روایت کے آئندہ لفظوں نے اس کی تعیین کردی ہے، چنانچہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ "فاکتبوہ بلسان قریش" یعنی اس کو قریش کی زبان میں لکھو، اس لیے روایت میں لفظ اختلاف سے اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ مراد نہ تھی، بخاری کی روایت میں اس مراد کو اور زیادہ واضح کردیا گیا ہے، اس میں یہ ہے کہ " فی عربیة من عربیة القرآن " یعنی قرآن کے کسی لفظ کی ہیئت میں اختلاف ہو اور جو تلفظ مد، ادغام اور نون تنوین سے متعلق باتیں ہیں جو عرب کے مختلف قبیلوں میں رائج ہیں، سر ولیم میور کا یہ جملہ کہ " اور اس طرح سے مکی زبان سے تطبیق کردی" یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ جامعین قرآن میں کچھ اختلافات پیدا ہوئے تھے جن کی وجہ سے انہوں نے پچھلی تحریر میں کچھ تبدیلیاں کردیں، حالانکہ حدیث سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی، جامعین سے اگرچہ یہی کہا گیا تھا کہ اگر تم میں کچھ اختلاف ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان میں در اصل کوئی اختلاف رونما ہوا تھا، اس لیے سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ "انہوں نے مکی زبان سے تطبیق کردی" صحیح نہیں ہے۔

سر ولیم میور کی طرف سے "نیا مجموعہ" کا لفظ بھی محض غلط ہے، جس پر وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے کہ قرآن مجید اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے عربی کے سات مختلف لہجوں میں نازل ہوا تھا، یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس قسم کے خیال کے بانی اور مؤید ہوئے ہوں تاکہ ایک ہی آیت قرآنی میں لفظوں میں اختلاف کی دقت

رفع ہو جائے، بقول سر سید:

''یہ (مذکورۂ بالا) عبارت ایک ایسے طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے جس پر ہم افسوس کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر جو تقویٰ، نیکی، صداقت، صاف باطنی اور راست بازی کے لیے ممتاز ہوں، دغا، فریب اور ریاکاری کا الزام لگانا صحیح دلیل و برہان کے معینہ قوانین اور اخلاق و تہذیب کے تسلیم شدہ اصول کے خلاف ہے، ہم اس بات کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں اور اس پر زیادہ بحث نہیں کرتے، کیوں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے، پاکباز اور تقویٰ شعار ہیں وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں مگر وہ ویسی ہی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے یہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ، پھر کیا سر ولیم میور اس بات سے بھی ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مد یا بغیر مد کے، ادغام یا بغیر ادغام کے اور تنوین نون کے ساتھ یا بغیر نون کے پڑھنے سے جو عرب کے مختلف قبیلوں میں مختلف طریقے سے رائج تھے، تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے لیکن لفظ یا معنی میں کچھ فرق نہیں ہوتا، یا کوئی لفظ اپنے اصلی مادہ میں تبدیلی کے بغیر مختلف صورتوں سے پڑھا جا سکتا ہے، جیسے کہ سورۂ فاتحہ میں مَالِکٌ کا لفظ ہے جو قدیم طرز تحریر میں مَلَکٌ لکھا جاتا تھا اور اسے مَلَکٌ، مَلّٰکٌ، مَالِکٌ بھی پڑھا جا سکتا ہے، چنانچہ عرب میں مختلف قبیلوں میں اس لفظ کے تلفظ میں فرق تھا اور اس کے باوجود اس لفظ کے مادہ یا معنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لیکن قریش کی زبان میں مالک کا تلفظ جاری تھا، اس کا قرآن مجید میں قائم رکھنا کیوں کر اعتراض کا مستحق ہو گیا۔

سر ولیم میور نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں دراصل ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کرنی تھی جن کے لیے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو ان کے قلم سے نکلی ہے، وہ یہ ہے کہ "دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو اور ہم مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی، اس بات کی تصدیق اس پیشین گوئی سے ہوتی ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے، خدا فرماتا ہے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (ہم نے قرآن مجید کو اتارا ہے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے)

(خطبات، ص ۴۷۶)

سر ولیم میور نے عہد عثمانی میں قرآن مجید کی نقلیں کیے جانے کے واقعہ کی یہ عجیب توجیہ کی ہے کہ "اگر ابو بکرؓ کے قرآن کا متن خالص ہوتا تو اس قدر جلد وہ کیوں کر خراب ہو جاتا کہ اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہو گیا" لیکن سر سید کہتے ہیں کہ:

"ہم نہایت صاف طور پر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ اس میں نظر ثانی کی ضرورت پڑی اور نہ ہی اس میں نظر ثانی کی گئی تھی، بلکہ صرف اس کی نقلیں کی گئی تھیں۔"

(خطبات احمدیہ، ص ۴۷۶)

تبدیلیٔ آیات: سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "اس دعوے کے واسطے کہ خود پیغمبرؐ صاحب ہی نے بعض آیات کو جو ایک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی ہوں، بعد کو تبدیل یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے" وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دو مثالیں بھی پیش کرتے ہیں جو واقدی کی بیان کردہ ہیں، خود سر ولیم میور کے بیان کے مطابق "ایک روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابیؓ بن کعب کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے، ابیؓ کی قرأت

میں شامل بعض آیتوں کو ہم چھوڑ دیا کرتے ہیں، کیونکہ ابیؓ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ صاحب کو یہ فرماتے سنا ہے اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبرؐ صاحب نے قرآن مجید میں درج کیا ہے، نہیں چھوڑتا ہوں مگر اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے وہ حصے ابیؓ کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے تنسیخ یا ترمیم کرتے ہیں" سرسید نے اس روایت پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

"جو کچھ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے اس اصل حدیث کے مضمون سے جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے، سراسر خلاف ہے اور اس عبارت کا کہ "بعض آیات کو جو ابیؓ کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" اس حدیث میں پتہ بھی نہیں ہے، اصل حدیث (بخاری کتاب التفسیر عن ابن عباسؓ) یہ ہے (ترجمہ) حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں ابیؓ بڑے قاری ہیں اور علیؓ بڑے قاضی ہیں اور ہم لوگ ابیؓ کا قول چھوڑ دیتے ہیں، بات یہ ہے کہ ابیؓ کہتے ہیں کہ میں کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: "مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا"

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ بعض آیات قرآنی کو جن کو ابیؓ پڑھا کرتے تھے، چھوڑ دیا کرتے تھے، یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات مستنبط کرنے سے متعلق ہے، ابیؓ قرآن مجید کی ہر آیت سے حکم کا استخراج کرتے تھے اور جملہ احکام کو صحیح خیال کرتے تھے، ان کی رائے میں ظاہر آیات سے جو معنی یا احکام نکلتے ہوں ان کے استخراج میں دوسری آیت پر نظر رکھنا ضروری نہیں، جیسا کہ اہل ظواہر کا مسلک ہے لیکن حضرت علی مرتضیٰؓ کی رائے اس

کے برعکس معلوم ہوتی ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ ابیؓ سب سے اچھا
قرآن پڑھنے والے ہیں اور حضرت علیؓ ہم میں سب سے بڑے قاضی یعنی
سب سے بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے
احکام وقوانین مستنبط کر سکتے ہیں، اس لیے ہم ابیؓ کے قول کو یعنی جو حکم
انہوں نے قرآن سے نکالا ہے چھوڑ دیتے ہیں اور حضرت علیؓ سے اتفاق
کرتے ہیں، ہماری اس تشریح کی تصدیق دوسری باتوں کے علاوہ اس
بات سے بھی ہوتی ہے کہ بخاریؒ نے جو مسلمانوں میں نہایت نامور،
مقدس اور مستند محدثین میں سے ہیں، اس حدیث کو اس مقام پر بیان
کیا ہے جہاں کہ احکام ناسخ ومنسوخ سے بحث کی گئی ہے، نہ کہ اس جگہ
جہاں کہ انہوں نے مختلف قرأتوں کو بیان کیا ہے، بخاریؒ نے اسی حدیث
کو کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں قاریوں کے باہمی اختلاف کی بحث
(باب القراء) میں بھی بیان کیا ہے اور اس میں قرأت کے بجائے ''لحن''
کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے لحن کو
یعنی قرأت کے طریقوں کو ابیؓ کے لحن پر ترجیح دی، بہر حال سر ولیم میور نے
یہ معنی جو نکالے ہیں کہ ''حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم بعض آیتوں کو جو ابیؓ کے
پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں'' یہ محض زبردستی کی ایک بات
ہے (روایت کے الفاظ میں اس معنی کی کوئی گنجائش نہیں)۔

(خطبات، ص ۸۰-۴۷۷)

سر ولیم میور واقدی سے ایک اور روایت یہ نقل کرتے ہیں کہ ''ابن عباسؓ نے کہا
کہ مجھ کو عبداللہؓ بن مسعود کا پڑھنا پسند ہے کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں ایک مرتبہ
قرآن جبرئیلؑ سے پڑھوایا کرتے تھے اور اپنی وفات کے سال اس کو دو مرتبہ پڑھوایا تھا اور

عبداللہؓ بن مسعود دونوں مرتبہ حاضر تھے اور جو چیز کہ منسوخ ہوئی تھی اور جس چیز میں ترمیم ہوئی تھی اس کا مشاہدہ کیا گیا تھا'' مگر جیسا کہ سر سید احمد خاں نے صراحت کی ہے کہ ''اس روایت کے آخری ٹکڑے کی کوئی معتبر سند نہیں ہے اور نہ ہم اس کو کسی مستند اور معتبر حدیث میں پاتے ہیں اور اگر بالفرض وہ واقدی میں موجود بھی ہو جس میں کہ ہم کو ہمیشہ شک رہے گا، تب بھی وہ اعتبار کے لائق نہیں ہے کیونکہ تمام نامعتبر اور بے سند روایتیں جو واقدی میں ہیں کچھ زیادہ اعتبار کی مستحق نہیں ہیں اور اگر ہم اتمام حجت کی غرض سے اس کی اصلیت تسلیم کرلیں تو بھی سر ولیم میور کا یہ قیاس کہ ''قرآن مجید میں شاید'' بعض ایسی آیتیں نہ موجود ہوں جو ایک زمانہ میں نازل ہوئی ہوں مگر بعد میں منسوخ ہوگئی ہوں، یا بدل دی گئی ہوں'' (ایک ایسا قیاس جو ''شاید'' کے سہارے قائم ہے) کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے، باقی رہی یہ آیت کہ ''مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا'' اس پر ہم پہلے بحث کرچکے ہیں اور یہ بتاچکے ہیں کہ اس میں شریعت یہود کے منسوخ کیے جانے کا ذکر ہے، آیاتِ قرآنی کے نسخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ (خطبات احمدیہ، ص ۴۸۱)

سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیوں میں قرآن مجید سے بعض آیتوں کا اخراج یا بعض آیتوں کا اندراج نہ کیے جانے کے بارہ میں دو ایک اور آیتوں سے بھی استدلال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''بیر معونہ'' پر ستر مسلمان شہید ہوئے تو محمدؐ صاحب نے اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ان لوگوں کو پیغام کے پہنچنے کا دعویٰ کیا جس کو راویوں نے (کسی قدر اختلاف کے ساتھ) اس طرح نقل کیا ہے کہ ''بلغوا قومنا عنا لقينا ربنا فرضی عنا ورضينا عنه'' (واقدی) تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کردی گئی'' لیکن سر سید کے نزدیک:

> ''اول تو اس روایت کی صحت ہی میں کلام اور انکار ہے، مزید برآں سر ولیم میور کا یہ فرضی بیان کہ ''تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی

کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی'' محض بے بنیاد ہے اور کسی مستند اور معتبر روایت میں پایا نہیں جاتا اور اگر بالفرض ہم اس کو صحیح تصور کر لیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غلطی سے وحیِ غیر متلو یعنی حدیث کو وحی متلو یعنی قرآن سمجھ لیا تھا اور درحقیقت وہ قرآن کی آیت نہ تھی۔'' (ص ۴۸۲)

دوسری روایت جو سر ولیم میور نے نقل کی ہے، احکام زنا سے متعلق ہے اور اس میں اہل مدینہ سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''......واللہ اگر یہ امر مانع نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہہ دیں گے کہ عمرؓ نے ایک نئی بات قرآن میں درج کر دی تو میں قرآن میں یہ آیت درج کر دیتا کیونکہ میں نے اس آیت کو پڑھا ہے کہ **والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة** (واقدی) مذکورہ بالا روایت پر گفتگو کرتے ہوئے سر سید نے یہ رائے دی ہے کہ: اول تو اس بیان میں جو واقدی نے لکھا ہے غلط بیانی اور غلط رہنمائی ہے، اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ فقرہ ''**والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة**'' اصل حدیث میں نہیں ہے اور نہ اس بات کی کوئی سند ہے کہ کبھی مسلمانوں نے اس کو قرآنی آیت سمجھا ہو، دوسرے اس فقرے کی عبارت ایسی ناقص اور خراب ہے کہ عرب تو کجا، کوئی عجمی اور ادنیٰ درجہ کا عربی داں بھی اس کو نہ لکھے گا، چہ جائے کہ وہ خدا کا کلام ہو...... ہاں البتہ مسلم شریف (باب حد الزنا) میں اس قدر ضرور ہے کہ ''**فکان مما انزل اللہ علیه اٰیة الرجم**'' یعنی ان چیزوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاریں، رجم کا حکم تھا، اس حدیث کے ترجمہ میں آیت اور کتاب کے لفظ کا ترجمہ ''حکم'' کرنا چاہیے، اس بارے میں ہم بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں کہ یہ الفاظ خود قرآن مجید اور احادیث میں ''حکم'' کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔

سورۂ نساء کی آیت ۱۹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ''ان کو اپنے مکانوں سے باہر نہ

جانے دو، یہاں تک کہ موت ان کو ٹھکانے لگائے، یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی سبیل نکال دے'' اس آیت کے اخیر لفظوں سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ وہ سبیل یہی ہے جو مسلم کی حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ شادی شدہ کو بجرم زنا سو درّے لگانا چاہیے اور سنگسار کر دینا چاہیے اور غیر شادی شدہ کو سو درّے لگانا اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دینا چاہیے، کچھ عجب نہیں کہ لوگوں نے اس حکم کو ایک جزو قرآن سمجھ لیا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے حدیث مسلم کے مطابق سنگسار کرنے کی تھی اور اس لیے جب وہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اکثر اشخاص کے سامنے یہی بیان کیا اور شاید اپنی تمام سلطنت میں یہی حکم دیا ہو مگر واقدی کا روایت کردہ ٹکڑا محض بے اصل ہے اور ہم اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ تمام محققین مسلمان (ایسی مہمل روایتوں کو) مہمل تصور کرتے ہیں اور اسلام ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ (خطبات احمدیہ، ص ۹۰-۴۸۲)

اسی بحث کے سلسلہ میں سر ولیم میور تیسری روایت وہ بیان کرتے ہیں جو سونے کی گھاٹی کے بارہ میں تھی اور جو قرآن میں درج ہونے سے رہ گئی، چوتھی مثال کے طور پر سر ولیم میور نے عبداللہؓ بن مسعود کے اس قصہ کو پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک رات کو میں نے اپنے اوراق میں سے ایک آیت کو غائب پایا، پانچویں مثال میں وہ اس آیت کا ذکر کرتے ہیں جو مکہ کے معبودان مجازی کے بارہ میں تھی لیکن ان مثالوں پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ بقول سر سید احمد خانؒ ''ہم (سر ولیم میور کے) نہایت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے خود یہ بات کہہ کر کہ یہ سب روایتیں غلط اور موضوع ہیں، اس جھگڑے کو چکا دیا ہے پس ہم کو مردے مارنے کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔

(خطبات احمدیہ: ص ۹۲-۴۹۱)

خانۂ کعبہ کی تاریخی حیثیت: سر ولیم میور اور بعض دوسرے مستشرقین نے خانۂ کعبہ کی قدیم تاریخی اہمیت کو بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ بات تاریخی حقائق سے

چشم پوشی کے مترادف ہے، قرآن مجید میں اگرچہ تعمیر کعبہ کے زمانہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے لیکن اس میں کعبہ کی دو صفتوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے، "بیت العتیق" (نہایت پرانا اور قدیم گھر) اور "اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ" (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے خدا کی عبادت کرنے کے لیے بنایا گیا ہے) سر سید احمد خاں کے نزدیک قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق تاریخی شواہد سے بھی ہوتی ہے، ان کے بقول:

> "اس کے ثبوت کے لیے ایسی دلیلیں بھی ہیں جو واقعی ایک حقیقت ہیں اور جن کو ان لوگوں نے لکھا ہے جن کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا، ہم ایسے واقعات سے استدلال کرتے ہیں جو سب کو تسلیم ہیں، یا جو جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت ہیں .... یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے، دوسرا بیٹا قیدار جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا، رورنڈ فارسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاہ نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے جس میں مکہ و مدینہ بھی شامل ہیں، اہل عرب کی یہ روایت کہ قیدار اور اس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے، یہ بات بھی بخوبی ثابت ہے کہ یورنیس، بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قومیں حجاز کی باشندہ تھیں، گیڈری، گڈرونا اور کدریتی سے قیداری اور قیدری مراد ہے، چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اول، ص ۲۴۸ میں کیا گیا ہے، پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدار حجاز میں آباد تھے، رورنڈ گاٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶-۲۷ درجہ عرض شمالی ۳۷-۳۸ درج طول شرقی کے درمیان لگایا ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۴۹۷)

گبن نے کعبہ کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''کعبہ کی قدامت صحیح طور پر سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے، ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ نے تھمویت اور سبیین کے بیان میں ایک مشہور معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کو تمام عرب تسلیم کرتے تھے اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کو تمام عرب تسلیم کرتے تھے تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت قدیمی زمانہ (ابراہیمؑ کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیے'' (خطبات ص ۵۰۶) لیکن سر ولیم میور نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے، اس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اس کے تمام مراسم کی اصلیت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے ہے، کیوں کر قیاس ہو سکتا ہے۔''

مگر سر سید احمد خاں اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ:

> ''ہم سمجھتے ہیں کہ سر ولیم میور نے بلاشبہ یہاں غلطی کی ہے جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ملتا ہے، اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پہلے اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ اور وہ تمام مراسم جو کعبہ سے متعلق ہیں، ان کا ابراہیمؑ سے تعلق ہے، اس کی اصلیت اور صحت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنو جرہم نے اور تمام عرب کی مختلف قوموں نے اس کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے منسوب کیا تھا، عرب ایک بت پرست قوم تھی اور ابراہیمؑ بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھا، اس لیے ضرور تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے نفرت کرتیں اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے منسوب نہ کرتیں، باوجود اس

مغائرت اور منافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم کرنا کہ
کعبہ کو اور اس کے مراسم کو ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے تعلق ہے، یہ بات واضح
طور پر اور علانیہ اس کی صحت اور اصلیت کی دلیل ہے نہ کہ اس کے
برخلاف جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے، اس روایت کا اسلام کے
زمانہ سے پیشتر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا ہمارے لیے دلیل
ہے نہ کہ ہمارے مخالف کے لیے۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۵۰۷)

عرب کے مورثِ اعلیٰ: سر ولیم میور کے اعتراضات کی اصل حیثیت سرسید کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں کسی دلیل اور ثبوت کے بغیر ان تمام واقعات سے جن سے کسی مورخ نے انکار نہیں کیا، انکار کیا ہے اور ایک خیالی اور فرضی بات کو جو ان کے دل میں آئی ''حقیقت واقعہ قرار دیا ہے'' مثلاً انہوں نے یہ بات فرض کر لی ہے کہ مکہ کے قریب اسماعیلؑ کا آباد ہونا اور یہ بات کہ یقطان اہل عرب کے مورث اعلیٰ تھے، سب بناوٹ اور قصہ اور ہر قسم کی تاریخی سچائی سے خالی ہے،

مگر بقول سرسید مرحوم:

''اس بات کے کہنے سے پہلے سر ولیم میور پر فرض تھا کہ یہ بیان
کرتے کہ اہل عرب کو اگر وہ نسل، مذہب اور اپنی رسموں میں یقطان اور
اسماعیلؑ سے بالکل مختلف تھے تو اس بناوٹ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی اور
کیوں تمام ملک اور تمام قبیلے جو آپس میں نہایت دشمن اور باہم سخت
عداوت رکھتے تھے اور روز خانہ جنگی اور باہم لڑائیاں کرتے تھے، اس ایک
بات پر متفق ہو گئے تھے، عرب کی تمام تاریخوں سے جن کو عیسائی مورخوں
نے بھی تسلیم کیا ہے، ثابت ہوتا ہے کہ یقطان عرب کا مورث اعلیٰ تھا، ان
تمام باتوں کی کس طرح سر ولیم میور تردید کرتے ہیں، کیونکہ ایسے موقع پر

ثبوت کے مقابلہ میں صرف انکار کر دینا کافی نہیں ہے، یونان کے مورخ اور جغرافیہ کے ماہرین، حجاز میں اسماعیلؑ کی اولاد کی سکونت کا نشان بتاتے ہیں، یونانی مورخوں نے حجاز کی ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو اسماعیلؑ کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں، ان سب واقعی باتوں کو سر ولیم میور کس طرح معدوم کرتے ہیں؟ (خطبات احمدیہ، ص ۵۰۹)

عرب کی مذہبی رسموں کا حضرت ابراہیمؑ سے تعلق: سرسید کے الفاظ میں سر ولیم میور ازراہ خود پسندی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''اس عقیدۂ باطل (یعنی حضرت ابراہیمؑ سے نسبی رشتہ کے خیال) کے کسی اجزا (رسموں) میں کسی بات کا ایسا کوئی نشان نہیں ہے کہ جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہو، حجر اسود کا بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منیٰ میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا، ان سب باتوں کو حضرت ابراہیمؑ سے یا ان کے خیالات اور اصول سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہنچیں، یہ باتیں تو ٹھیک ٹھیک مقامی نوعیت کی تھیں، یا ان کا بت پرستی کے اس سرچشمہ سے جو جزیرۂ عرب کے جنوب میں جاری تھیں، تعلق تھا اور وہاں سے بنی جرہم یا بنی قطورہ یا ازدایت یا کوئی اور قوم جو یمن سے منتقل ہو کر مکہ میں آباد ہوئی تھی اپنے ساتھ لائی تھی۔''

مگر سر ولیم میور کے یہ خیالات دلیل اور ثبوت کے بغیر سچائی سے انحراف کی ایک افسوسناک مثال ہیں جس پر سرسید نے یوں تبصرہ کیا ہے:

''ہم کو افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے بنی ابراہیمؑ یا بنی اسرائیلؑ کی

تمام رسمیات سے جو ان کے ہاں جاری تھیں، یک لخت چشم پوشی کر لی ہے
ورنہ وہ دیکھتے کہ ان رسمیات میں اور بنی اسرائیل کی رسمیات میں بالکل
اتحاد پایا جاتا ہے۔"

سر ولیم میور کی ذکر کردہ رسمیات جن کو وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد میں گم پاتے ہیں، وہ سرسید کی بائبل سے نقل کردہ شہادتوں کی بنا پر اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی اصل حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خانوادہ میں موجود تھی، جن کی عربوں نے ایک قیمتی وراثت سمجھ کر حفاظت کی، چنانچہ جیسا کہ سرسید مرحوم نے تحریر فرمایا ہے "حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ بناتے تھے، (پیدائش باب ۱۲، آیت ۷، ۸ اور باب ۱۳، آیت ۱۸، باب ۲۶، آیت ۲۵، باب ۲۸، آیت ۱، ۱۹، ۲۲، کتاب خروج باب ۲۰، آیت ۲۵، باب ۲۴، آیت ۴) حجر اسود کو بوسہ دینے کا اس جگہ سر ولیم میور نے جو ذکر کیا ہے، اس سے ایک عام مقصد بیان کرنا معلوم ہوتا ہے، یعنی پتھر کی تعظیم مگر انہوں نے ان پتھروں کی اس تعظیم کو فراموش کر دیا جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ کرتے تھے، یہ سب بزرگ ایسے پتھروں کو مقدس جانتے تھے، خدا کے نام سے ان کی تعظیم کرتے تھے، یعقوبؑ نے اس پر تیل ڈالا، (دیکھو بائبل کی کتاب پیدائش باب ۲۸، آیت ۱۹) یہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انتہائی تعظیم تھی، یعقوبؑ نے کہا کہ یہ جگہ خانۂ خدا ہوگی، (پیدائش باب ۲۸، آیت ۲۲) خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تا کہ تمہاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے، (خروج باب ۲۰، آیت ۲۶) اب کون سا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا ہے جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت اولاد ابراہیم میں جاری نہ تھا جس کے سبب سر ولیم میور حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو (اگر وہ بھی) اولاد ابراہیم کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔

ایک گھر خدا کے لیے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا جیسا کہ کعبہ ہے، اگر

ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰؑ) جس نے بمقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا (خروج باب ۲۰، آیت ۲۴، کتاب اول تاریخ الایام، باب ۲۱، آیت ۲۹) اور وہ کون تھا (یعنی داؤد) جنہوں نے خرمن گاہ ارنان بیوسی کو خدا کا گھر بنانے کے لیے مول لیا اور پتھر، لکڑی، لوہا اور پیتل اس کے بنانے کے لیے جمع کیا (کتاب اول، تاریخ الایام، باب ۲۲) اور وہ کون تھا (یعنی سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمن گاہِ ارنان بیوسی میں نہایت عالیشان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا، (کتاب دوم، تاریخ الایام، باب ۴) ان شواہد کی روشنی میں کعبہ کی تعمیر اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔

مکہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے، سر ولیم میور کے لیے اس رسم کے بارے میں ابراہیمی رسم ہونے سے انکار کرنا اس وقت مناسب تھا جب کہ وہ کسی تاریخ یا توریت مقدس سے پہلے یہ ثابت کر لیتے کہ ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ نے جو مذبح یا بیت اللہ بنایا تھا ان میں وہ کیا کیا کرتے تھے، کیونکہ توریت سے موسیٰؑ سے پیشتر صرف خدا کے نام یا عبادت کے لیے ان گھروں کا بننا تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے عبادت کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا اور ہمارے لیے اس بات کے یقین کرنے کا جائز قرینہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا کی عبادت کا یہی طریقہ تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے اور اسماعیلؑ کی اولاد نے اپنے دادا کے اسی طریقہ کو اور اسی ہیئت کو اب تک قائم رکھا ہے، ہم کو امید ہے کہ سر ولیم میور اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ حج خانۂ کعبہ کا نہیں ہوتا (اس کے اردگرد جو کچھ ہوتا ہے اس سے مقصود خدا کی ذات ہوتی ہے، نہ کعبہ کی عمارت) پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مذہب میں خانۂ کعبہ (کی عمارت) کا حج ہوتا ہے۔

عرفات کی رسم کا بھی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد سے تعلق رہا ہے، ہزاروں جگہ تورات

میں آیا ہے کہ خدا ابراہیمؑ کو مرئی ہوا (یعنی ان کو دیدارِ الٰہی ہوا) خدا اسحٰقؑ کو مرئی ہوا، خدا یعقوبؑ کو مرئی ہوا، خدا موسیٰؑ کو مرئی ہوا، پس ٹھیک ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں، جس پہاڑ پر (مکہ کے قریب) خدا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو مرئی ہوا، اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے، معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے عرفات کو کیا سمجھا، جو یہ کہا کہ اس کو ابراہیمی رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ ایک ایسی چیز ہے جو دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی، یہ خاص امر ابراہیمؑ کی نسل میں ملتا ہے، یہاں ہم اس بات پر کہ خدا کیوں کر دکھائی دے سکتا ہے؟ بحث کرنا نہیں چاہتے اور ان الفاظ کے مطلب و مراد سے یہاں کوئی بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عرفات (عرفانِ الٰہی یا دیدارِ خداوندی) کا استعمال بجز خاندانِ ابراہیمی کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا اور اسی لیے عرفات یا جبل عرفات کے نام سے اس کا خاص تعلق ابراہیمؑ سے ثابت ہوتا ہے کہ، یہی جگہ ہے جہاں کی حاضری کو حج کہتے ہیں، پہاڑ تلے کا میدان ہے جس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں، اس کی تسبیح کرتے ہیں، اس قدوس کو قدوس قدوس کہہ کر یاد کرتے ہیں، اس مجمع میں صرف خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ موسیٰؑ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے، پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں میں پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیمؑ کے یہاں۔

منیٰ کا مقام بھی صرف قربانی کے لیے ہے، اس کے علاوہ وہاں کوئی دوسری رسم نہیں ہوتی، تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری ہوئی ہے جہاں بیت اللہ بنایا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کی وجہ سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا، منیٰ اور خانۂ کعبہ نہایت قریب ہیں اور اسی لیے قربانی نذر کرنے کے لیے منیٰ کی جگہ مقرر کی گئی، ابراہیمؑ، یعقوبؑ، اسحٰقؑ اور موسیٰؑ و داؤدؑ و سلیمانؑ کی قربانی اور اسلام میں قربانی کے درمیان یہ فرق

ضرور ہے کہ ان کے یہاں قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے، اس خیال سے کہ خدا کو اس کی خوشبو پسند آتی تھی، مذہب اسلام میں وہ قربانی غریب اور محتاج لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں، سر ولیم میور اگر اسی وجہ سے منیٰ کی رسموں کو بت پرستی کی رسمیں تصور کرتے ہیں تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے، کیوں کہ ہر ذی عقل قربانی کے مذکورۂ بالا طریقوں کے مقابلہ میں اسلام کی قربانی کے طریقہ کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔

اسلام نے کسی ملک کو مقدس نہیں ٹھہرایا، البتہ اس مقدس جگہ کو جو خاص طور پر خدا کی پرستش کے لیے مقدس ہاتھوں سے بنائی گئی تھی، مقدس ٹھہرایا گیا ہے، یہ بھی ابراہیمؑ ہی کا طریقہ تھا اور ان کی اولاد میں رائج چلا آرہا تھا جہاں انہوں نے خانۂ خدا یا مذبح بنایا اس جگہ کو مقدس سمجھتے تھے، ''موسیٰ کو خدا نے کہا کہ سینا پہاڑ کے لیے حد ٹھہرا اور اس کو مقدس کر'' (خروج باب ۱۹، آیت ۲۳) خدا کا یہ بھی حکم ہے ''اور میرے مقدس کی تعظیم کرنا'' (سفر یوحنا باب ۲۶، آیت ۲) اسی طرح بیت المقدس کو بھی مقدس ٹھہرایا گیا، اسی طرح اسلام میں بھی خانۂ کعبہ کے لیے جب سے وہ بنا ایک حد مقرر کی گئی جو حرم کہلاتی ہے اور اس کو اس مقدس نام کے ادب کے لیے جس کے نام پر وہ پاک جگہ بنائی گئی، مقدس ٹھہرا، یہ بھی اس بات کا ایک نہایت واضح ثبوت ہے کہ بیت اللہ کو مقدس ٹھہرانا، خاص طور پر ابراہیمؑ سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ بت پرستوں کی رسم سے۔ (خطبات احمدیہ، ص ۱۴-۵۰۹)

سر سید سر ولیم میور کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کو مقدس قرار دینے کی رسم کا تعلق دور جاہلیت سے تھا، یہ حج کے مہینے تھے اور انہوں نے آپس میں عہد کر لیا تھا کہ ان دنوں میں لڑائی موقوف رہے گی، تاکہ لوگ بے خطر ہو کر مکہ آئیں اور حج کر سکیں، مگر بقول سر سید:

''سر ولیم میور نے جو غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام نے بھی

ان کو مقدس مانا ہے، حالانکہ مذہب اسلام نے ان کی تقدیس کو رد کر دیا ہے
اور کوئی مہینہ اسلام میں (اس طور پر) مقدس نہیں رہا ہے، اسلام نے یہ کہا
ہے کہ چار مہینے جو مقدس ٹھہرائے گئے ہیں ان میں تم لڑائی کی ابتدا مت
کرو لیکن اگر کافر لڑیں تو لڑو، خدائے تعالیٰ سورۂ توبہ میں فرماتا ہے: (اِنَّ
عِدَّةَ الشُّهُوْرِ ...... كَآفَّةً) کہ ان چار مہینوں کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ
سال کے سب ہی بارہ مہینوں میں آپس میں مت لڑو اور تمام کافروں سے
لڑو، جس طرح کہ وہ تم سے لڑیں، پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ
مذہب اسلام میں شہر حرم (چار محترم مہینے) نہیں مانے جاتے بلکہ بارہ کے
بارہ مہینے ایک سے ہیں۔" (خطبات احمدیہ، ص ۵۱۵)

صابی مذہب سے تعلق: سر ولیم میور یہ بھی لکھتے ہیں کہ عرب کے خاص طریقے سیبین ازم (صابی مذہب) اور بت پرستی اور پتھر کی پرستش تھی اور ان سب کو مکہ کے مذہب سے بڑا تعلق تھا لیکن اس اعتراض کے جواب میں سر سید یہ لکھتے ہیں کہ:

"ہم کو اس بات سے انکار نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو طریقے مکہ
میں رائج تھے، ان میں بہت کچھ رسمیں بت پرستی کی شامل ہو گئی تھیں، مثلاً
صابئین کا مذہب، اس میں کفر و شرک اور کواکب کی پرستش داخل ہو گئی
تھی مگر جو خاص باتیں ابراہیمؑ کے مذہب کی ان میں پائی جاتی تھیں ان کو
بھی سر ولیم میور بت پرستی سے منسوب فرماتے ہیں، یہی ان کی غلطی ہے،
خانۂ کعبہ کو اور ابراہیمی اور اسماعیلی نماز کے طریقہ کو جس کو اب طواف کعبہ
کہتے ہیں، سیبین ازم یا بت پرستی سے کچھ تعلق نہ تھا، پتھر یا حجر اسود کی
پرستش جس کو سر ولیم میور عرب کا دستور بیان کرتے ہیں، (حالانکہ وہ پرستش
نہیں بلکہ تعظیم ہے اور گزشتہ صفحات میں بائبل سے اس کی نظیریں بھی پیش

کی جا چکی ہیں) ابراہیمؑ کا طریقہ تھا، یہ طریقہ خاص ابراہیمؑ سے پیدا ہوا
اور یعقوبؑ و اسحٰقؑ اور اسماعیلؑ و موسیٰؑ نے اس کی پیروی کی جو بن گھڑے
اور ننگے پتھروں کو (موجودہ بائبل کی پیش کردہ شہادتوں کے مطابق)
ستون کی مانند کھڑا کرتے تھے اور ان پر تیل چڑھاتے تھے، خواہ یوں کہو
کہ مہادیو کی پنڈے کی طرح ان پتھروں کی پرستش کرتے تھے (جس کی
ذمہ داری موجودہ بائبل پر ہے) اور اس کی روشنی میں جو کچھ چاہو ان کی
نسبت کہو مگر یہ بات کہ وہ طریقہ ابراہیمی نہ تھا بلکہ خاص عرب کے بت
پرستوں کا طریقہ تھا جیسا کہ سر ولیم میور......... بیان کرتے ہیں تسلیم
نہیں ہو سکتا، کیوں کہ ان کی غلطی علانیہ ثابت ہے۔"

سر سید نے اس بحث کو تمام کرتے ہوئے مکہ کی تاریخ اور نسب نامۂ نبویؐ پر بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور اس بارے میں سر ولیم میور کے طول طویل بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

"ان تمام قابل افسوس قیاسات اور فرضی قصوں کے بعد سر ولیم میور
نے مکہ کی ابتدا اور مکہ کے مذہب کی ایک فرضی تاریخ بیان کی ہے اور
ہر ایک بات کو بے دلیل اور بغیر ثبوت کے فرض کر لینے کے بعد..........
اپنے خیال کو جولانی دے کر اپنے قلم کے چند اشاروں سے تمام ناممکن باتوں
پر غالب آتے ہیں مگر وہ باتیں نہ تاریخی واقعات ہیں نہ عرب کی مقامی
روایتیں اور نہ کتاب مقدس (بائبل) کی سچی باتیں، بلکہ صرف سر ولیم میور
کے عجیب و غریب کام کرنے والے خیال کی ایجادیں ہیں، اس وجہ سے
ہم ان کو ذکر کرنا بے فائدہ سمجھتے ہیں۔" (خطبات احمدیہ، ص ۵۱۷)

نسب نامۂ نبویؐ: نسب نامۂ نبویؐ پر سر سید احمد خاں کی تحقیق یہ ہے کہ اسماعیلؑ

(بن ابراہیمؑ) ۱۹۱۰ قبل مسیحؑ پیدا ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۵۸۰ بعد مسیحؑ پیدا ہوئے اور دونوں میں ۲۴۷۶ برس کا فاصلہ ہے اور اسماعیلؑ سے آنحضرتؐ تک اس نسب نامہ کی ستّر پشتیں گزری ہیں جو علوم طبیعی کی تحقیقات کی روشنی میں ازروئے حساب بالکل صحیح ہے، یعنی ایک صدی میں تقریباً تین پشتیں، آنحضرتؐ کے ایک جدّ بعید عدنان اور حضرت اسماعیلؑ کے درمیان بیہقی نے دس، ابن ہشام نے ایک نسخہ کے مطابق نو اور ایک اور نسخہ کے مطابق گیارہ پشتیں اور ابن الاعرابی نے نو پشتوں کا ذکر کیا ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عدنان کے درمیان سر ولیم میور کے مطابق اٹھارہ پشتیں گزری ہیں، (دیکھیے لائف آف محمدؐ، ج ۱، ص ۱۹۴) مگر سر سید نے اس بارہ میں اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے کہ:

> ''سر ولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے سے شبہ پڑا ہے، (مگر) عدنان بھی دو ہیں اور معد بھی دو ہیں ......عک بلاشبہ معد کا بھائی تھا، مگر پہلے معد کا، نہ کہ دوسرے معد کا، جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے...... یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان ہمارے مرتبہ شجرہ میں پچاسویں نمبر پر ہے جو عموماً تسلیم کیا گیا ہے مگر عدنان سے آگے مورخوں میں اختلاف ہے (جس کی بنیاد مذہبی نہیں بلکہ تاریخی ہے)......سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ ''آنحضرتؐ کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۶۸-۵۶۰)

مگر مورخوں نے عدنان سے اوپر شجرۂ نسب کی جستجو میں اگر یہود کی تاریخی روایتوں کی طرف رجوع کرلیا تو اس میں مذہبِ اسلام کے لیے عیب کی کیا بات پیدا ہوگئی، سر سید فرماتے ہیں کہ:

> ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ

گفتگو عیسائیوں نے کی ہے، خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰؑ کی زبانی کیا کہ "میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیلؑ میں سے موسیٰؑ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا (تورات) کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسماعیلؑ کی نسلیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اسماعیلؑ تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد سے یاد ہوں اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ (شجرۂ نسب) ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں، یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کی تحریروں سے، وہ تو اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا، سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پورا ہوا، تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں، یا کسی اور ملک کے، مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے، اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم، قریش، اسماعیلؑ بن ابراہیم کی اولاد میں ہیں، محمد رسول اللہؐ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ "اَبِیْکُمْ اِبْـــرَاهِیْــمُ" (تمہارے جد امجد ابراہیمؑ ہیں) جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۵۷۰)

معراج جسمانی پر اعتراضات کا دفاع: سر سید احمد خاں اگرچہ معراج بصورت رویا کے قائل ہیں، جیسا کہ بعض صحابۂ کرامؓ اور بعد کے علما و اہل تحقیق میں سے ایک طبقہ کی رائے ہے، مگر وہ مستشرقین کی طرف سے معراج جسمانی پر کیے جانے والے اعتراضات کو بھی صحیح نہیں سمجھتے،

چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''اب ہم بغرض اتمام حجت (معراج جسمانی کو) واقعی تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان تمام قصوں پر اعتقاد رکھنا مسلمانوں کے یہاں ایک خاص امر دینی ہے اور پھر ہم ان متعصب عیسائیوں سے جو ان روایات کی بنا پر مذہب اسلام پر طعن کرتے ہیں، پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر شور مچاتے ہیں، جب کہ وہ خود اس سے بھی زیادہ عجیب باتوں پر یقین رکھتے ہیں، کیا ان کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ حضرت الیاسؑ آسمان پر انسانی جسم و شکل کے ساتھ موت کا مزہ چکھے بغیر ایک آتشیں گاڑی میں ایک آندھی کے ذریعہ اٹھائے گئے ہیں اور کیا عیسائی اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے گئے اور خدا تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھے، یعنی خود اپنے ہی دست راست کی طرف، کیونکہ وہ خود خدا تھے، (متی باب ۲۸، آیت ۷، مرقس باب ۱۶، آیت ۱۹) اس لیے ہم تمام عیسائیوں کو درج ذیل احکام کی پیروی کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ ''تو اس ذرہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اس کو نہیں دیکھتا، تو اپنے بھائی سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بھائی تو مجھ سے اپنی آنکھ کا ذرہ نکلوا لے، جب کہ تجھ کو خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ میں سے شہتیر تو نکال لے، تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں ذرہ نکالنے کے لیے صاف صاف نظر آنے لگے گا۔'' (لوقا، باب ۶، آیت ۴۲-۴۱)

ایک مقدس عیسائی نے حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر چلے جانے کے قصے کو نہایت

شاعرانہ رنگین بیانی سے نظم کیا ہے جس کا ترجمہ سرسید کے الفاظ میں یہ ہے کہ "اس نے آسمان کی طرف مراجعت کی اور اس کے پیچھے دس ہزار چنگوں کی سریلی آوازیں تھیں، جو زمرہ ہائے ملکوتی کا سماں باندھ رہی تھیں، زمین اور ہوا ان کی آواز سے گونج رہی تھی، تمام افلاک و بروج سے صدائے بازگشت آ رہی تھی، سیارے اپنے اپنے مقامات پر سننے کے لیے ٹھہر گئے تھے جب کہ یہ نورانی جلوس شادکامی کے طنطنہ کے ساتھ عالم بالا کو روانہ ہوا، انہوں نے یہ نغمہ گایا: اے لازوال دروازو! کھل جاؤ! اے آسمانو! اپنے دروازوں کو وا کرو اور اس بڑے نجات دہندہ کو جو اپنے کام کو اختتام پر پہنچا کر شان و شوکت کے ساتھ آتا ہے، اندر لے لو اور اب خدا تعالیٰ کی نظر عاطفت سے نیک لوگوں کے مکانوں میں قدم رنجہ فرمائے گا اور اپنی خوشی سے اپنے قاصدان اولی الاجنحۃ کو رحمت آسمانی کے پیغام دے کر متواتر وہاں بھیجا کرے گا۔" (خطبات احمدیہ، ص ۶۷۳-۶۷۱)

سرسید کی طرف سے اس جواب کی روشنی، معراج جسمانی مذہبی نقطۂ نظر سے اہل مذاہب کے لیے قابل فہم ہے اور واقعات معراج میں کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارہ میں وہ اپنے مذہبی اعتقاد و تصور کو برقرار رکھتے ہوئے یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ناممکن ہے یا عالم واقعات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے متعلق کچھ روایتیں تو وہ ہیں جو قابل اعتماد نہیں اور نہ ہی وہ مذہبی روایتیں سمجھی جا سکتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے رونق پائی اور مسلمانوں کو نمایاں فتوحات حاصل ہوتی گئیں اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی اور وہاں کے قدیم آتش کدے برباد ہو گئے اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ آ گیا، ان واقعات کو جو بعد میں پیش آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن سے منسوب کر دیا گیا، ان کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارہ میں اور بھی روایتیں کتب سیر میں مذکور ہیں، اگرچہ سرسید کے بقول

"ان کی صحت کے لیے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے مگر ان کے غلط ہونے کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں ہے" مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت آمنہ نے کسی کو عبدالمطلب کے پاس بھیجا اور آپ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی، عبدالمطلب فوراً وہاں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر کعبہ میں لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ عبدالمطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے طرز کے مطابق ہے اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے مگر جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے کہ:

> "ہم کو اس بات سے کہ عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی، وہ مسلمانوں کے طرز پر تھی، کچھ تعجب نہیں، کیوں کہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں میں سے خدا پرستی بالکل ختم نہیں ہوگئی تھی، اس بات کا ایک بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خاص خدا پرستوں کا طریقہ ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۲۱۸)

حضرت حلیمہ کی تربیت اور قرآن کی زبان:

شرفائے مکہ کا دستور تھا کہ آب و ہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے لہجہ اور زبان میں غیر زبان کا اثر نہ ہونے پائے، اپنے بچوں کو جب وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے، دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر کے باہر بھیج دیا کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حلیمہ سعدیہؓ کے سپرد کر دیا گیا، وہ اپنے گھر لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لا کر آپ کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلا جاتی تھیں، دو برس بعد آپؐ کا دودھ چھڑایا گیا اور حضرت حلیمہؓ آپؐ کو لے کر حضرت آمنہ کے پاس آئیں مگر حضرت آمنہ نے

اس خیال سے کہ مکہ کی (گرم) آب و ہوا آپ کو موافق نہ ہوگی، پھر حضرت حلیمہؓ کے سپرد کر دیا اور وہ ان کو اپنے ساتھ لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لا کر آپ کو ملا جاتی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپؐ کو اپنے پاس رکھ لیا، اس لیے حضرت حلیمہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلائی ماں اور ان کے خاوند حارث دودھ کے رشتہ کے باپ اور ان کی اولاد عبداللہ، انیسہ اور خزیمہ عرف عثمان دودھ شریک بھائی بہن ہوئے، عربوں میں قریش اور خصوصاً یہ شاخ جو بنی سعد کہلاتی تھی عرب میں زبان کی شستگی اور فصاحت کے لیے مشہور تھی اور اسی سبب سے جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت زبردست اور مؤثر ترین فصیح و بلیغ تھے، عرب فصاحت و بلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے اور جو شخص فصیح و بلیغ نہ ہوتا، اس کو نظر حقارت سے دیکھتے اور ذلیل سمجھتے، خواہ وہ کیسے ہی نامور اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو۔

مگر بنی سعد میں چار برس تک کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کو سر ولیم میور قرآن مجید کی فصاحت کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ''اس سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو جزیرہ نمائے عرب کی خوشنما زبان کے خالص ترین نمونہ کے مطابق بن گئی تھی .... جب ان کی فصاحت و بلاغت ان کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی تو ایک خالص زبان اور ایک دل فریب گفتگو سے فائدہ عظیم مرتب ہوئے'' (یعنی آپ قرآن مجید جیسی فصیح و بلیغ چیز پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے) مگر کیا قرآن مجید جیسا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنی سعد میں پرورش کا نتیجہ ہے؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اسی انداز کا ہوتا تھا جیسا کہ ہم قرآن مجید کی سورتوں میں دیکھتے ہیں؟ سر سید نے قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ایک بات سر ولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں جس میں یقین

کیا جاتا ہے کہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ محفوظ ہیں ، جیسے دعائیں وغیرہ ، تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز کلام (اپنی بلندی اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے باوصف) فصحائے عرب کے طرز کلام کے جیسا ہے لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے اور ہم دونوں میں بڑا فرق پاتے ہیں ، اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اول کلام انسانی ہے اور دوسرا کلام ربانی ۔'' (خطبات احمدیہ، ص ۲۱ ۷)

عہدِ طفولیت کے واقعات: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چھ برس کی ہوئی، حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیزوں سے ملانے کے لیے مدینہ منورہ لے گئیں، کچھ عرصہ تک وہاں ٹھہریں اور پھر مکۂ معظّمہ کو واپس ہوئیں مگر راستہ میں اہواز کے مقام پر وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پہنچے تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپؐ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی اور ہمیشہ آپ کے ساتھ شفقتِ پدری سے پیش آتے رہے، اس دوران میں اور دادا کے انتقال کے بعد بھی بارہ برس کی عمر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند واقعات کو سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں قابل اعتراض ٹھہرایا ہے، مثلاً مدینہ کی چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ ان کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، دودھ شریک بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا، سر ولیم میور نے جس مقصد سے یہ واقعات بیان کیے ہیں ان پر سر سید نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

''اگرچہ ان باتوں کی اور قسم کی اور باتوں کی جو سر ولیم میور نے بیان کی ہیں، کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگرچہ یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی

> جائیں، تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں جو کہ بچپن میں انسانی فطرت کے مطابق ہوا کرتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے، انہوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا کہ "اَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ" پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتیں۔" (ایضاً ص ۲۲۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آٹھویں برس آپ کے دادا عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرتؐ جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گئے، تو لوگوں نے آپ کو روتے دیکھا" لیکن بقول سر سید:

> "یہ ایک ایسی بات ہے جس سے سر ولیم میور کی خواہش کے برخلاف ہمیں کچھ تعجب نہیں، بلکہ اگر نہ روتے تو ہمیں نہایت تعجب ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کم عمر تھے اور ایسے موقعوں پر آنسوؤں کا نکلنا اور رنج کے وقت دل میں نرمی اور گداز کا ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں کی راہ آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم کی طرف سے انسان کے دل کی تسلی اور اس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ ہے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی فطرت کی پیروی کی تھی جو خدا نے انسان میں پیدا کی ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۲۲۷)

سر ولیم میور اور مولود ناموں کی روایات: بعض مولود ناموں میں (جن کے لکھنے والے بھی زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے ہیں) فکر و تخیل سے کام لے کر محض خوش گمانی سے شاعرانہ انداز میں جو کہانیاں لکھ دی گئی ہیں، سر ولیم میور نے ان کا بھی سہارا لے کر اسلام پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی ہے، چنانچہ سر سید احمد خاں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانۂ ولادت میں حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نامعلوم آواز کو سن کر ڈر جانا، یا ایک سفید مرغ کا اچانک نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کو اپنے اضطراب میں تسکین پانا یا حضرت آمنہ کے لیے ایک خوشگوار شربت کے پیالہ کا ایک نامعلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا، یا فرشتوں کی آواز آنی، یا بغیر اس کے کسی شخص کا دکھائی دینا، یا اس کے چلنے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی نظر سے چھپا لینے کے لیے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا، بہشت کے پرندوں کا چہچہانا، بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا، یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں جو غالباً سر ولیم میور نے کسی مولود نامہ سے اخذ کیے ہیں اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہو گا سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے خیالات ہیں جو انہوں نے اپنے مضامین کو آراستہ کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کی رونق بڑھانے کے لیے بیان کی ہیں، جیسا کہ اس قسم کے واقعات بیان کرنے میں شاعروں کا خصوصاً مشرقی شاعروں کا دستور ہے، حضرت عیسیٰؑ کی نسبت بھی گرم جوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اس قسم کے خیالات نظم ...... میں بیان کیے ہیں، چنانچہ ملٹن کی پریڈائز لاسٹ انہی خیالات سے بھری ہوئی ہے، اس لیے نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم اپنے یہاں کے اسی قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو مذہبی روایتوں کی حیثیت دے کر یہ فیصلہ کرے کہ وہ سب راویوں کی ایجاد ہیں:

> ''شاعروں نے اپنی محبت کے جوش میں اور عقیدت کے طور پر اپنے شاعرانہ انداز میں اور بھی واقعات بیان کیے ہیں، مثلاً'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا اور اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی، کلمہ پڑھا، تین نورانی فرشتے آسمان سے اترے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمرد کا لگن اور

تیسرے کے پاس رومال تھا، انہوں نے آنحضرتؐ کو سات مرتبہ غسل دیا اور آپؐ کو خیر البشر کا خطاب دیا'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے یہ واقعات شاعرانہ اظہار خیال کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن سر ولیم میور نے ان کو بھی مذہبی روایات کے طور پر بیان کیا ہے جو کہ نہایت ہی غلط بات ہے۔'' (خطبات، ص ۲۷-۲۶ ۷)

ایک بے جا تنقید: ''سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے کو بھی راویوں کی ایجاد قرار دیا ہے، جس کو وہ عجیب و غریب، بعید از قیاس اور قانون فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں'' اس اعتراض پر سر سید احمد خاں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں:

''یہ بات نہ معجزہ سے تعلق رکھتی ہے، نہ عجائبات سے، بلکہ اس کا تعلق فطرت کی نیرنگیوں سے ہے جس کی اور بھی نظیریں بتلائی جا سکتی ہیں، مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں تذکر و تانیث دونوں علامتیں ہوں، ایسے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کی طرف سے کہیں کہیں دوسرے طریق اپنانے میں کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں، اس لیے معجزہ یا عجائبات کا نام لیے بغیر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختون پیدا ہونا قابل فہم اور قرین قیاس ہے، اس کا ثبوت اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ختنہ کی رسم بڑی پابندی سے جاری تھی اور ضروری قرار پا گئی تھی اور عرب دور جاہلیت میں بھی اس کے ترک کرنے کو گناہ عظیم سمجھتے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کی رسم کا ہونا کسی ضعیف ترین روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا جس کے صریح

معنی یہ ہیں کہ پیدائشی طور پر آپ کے مختون ہونے کی روایت درست ہے، اس کو راویوں کی ایجاد کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

(خطبات، ص ۲۸ ۷)

مہرِ نبوت: مہر نبوت کے بارے میں سر ولیم میور کہتے ہیں کہ:

"صفیہ سے نقل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں لکھی ہوئی تھی۔"

لیکن سر سید کے خیال میں "تمام مستند حدیثیں بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک سیاہ غدود سا تھا اور اس پر بال تھے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز کی حرمت اور تعظیم کی جاتی تھی، اس لیے اس کو مہر نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا ہوگا، بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے تمام علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے، پس کیا ایک عیسائی عالم کے لیے یہ بات نازیبا نہیں کہ وہ مسلمانوں پر ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کے اتہام لگائے جس سے وہ خود انکار کرتے ہوں، شمائل ترمذی کے حاشیہ باجوری میں لکھا ہے کہ "یہ جو روایت ہے کہ اس پر پچھنے کے جیسے نشان تھے، یا عنز جانور کے گھٹنے کی مانند، یا غدود سبز یا سیاہ رنگ کا تھا اور اس پر محمدؐ رسول اللہ لکھا ہوا تھا، یا یہ لکھا ہوا تھا "اے منصور" (انک منصور) ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے جیسا کہ عسقلانی نے کہا ہے اور بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر محمد رسول اللہ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے، اس کو ہاتھ کی مہر اور اس پشت کے غدود میں جس کو خاتم نبوت کہتے تھے دھوکا ہو گیا ہے، کیوں کہ وہ عبارت ہاتھ کی مہر میں کندہ تھی، نہ کہ "پشت کے غدود پر" اس لیے باجوری اور عسقلانی کی تحقیق کے مطابق یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ جو روایتیں سر ولیم میور نے بیان کی ہیں علمائے اسلام نے ان کو رد کیا ہے، شرح السنہ میں ابی رمثہؓ سے منقول ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، ان کے

باپ نے اس چیز کو دیکھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر تھی اور کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں اس کا علاج کر دوں، کیوں کہ میں طبیب ہوں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم رفیق ہو اور اللہ طبیب ہے'' اس روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے وہ کیا چیز تھی؟ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اس زمانہ کے مسلمان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے، اس کو کیا سمجھتے تھے، پس سر ولیم میور نے جو اس کو عجائبات اسلام کے طور پر بیان کیا ہے یہ محض ایک بے جا امر ہے۔ (ایضاً ص ۲۳۰)

چند اور واقعات: سر ولیم میور نے اور روایتیں بھی درج کی ہیں جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی لیکن جیسا کہ سر سید احمد خاں نے وضاحت کی ہے کہ:

> ''اس طرح کی باتوں کو خود علمائے اسلام نے غیر صحیح اور نامعتبر قرار دیا ہے، سر ولیم میور ان کو مذہبی روایتیں کہہ کر بیان کرتے ہیں تو دراصل وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اسلام کی بے وقعتی ظاہر کریں۔''

لیکن ان کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ عام بے پڑھے لوگوں میں جو باتیں مشہور ہو جاتی ہیں، وہ مذہب نہیں بن جاتیں بلکہ بے سند ہونے کی وجہ سے وہ نامعتبر ٹھہرائی جایا کرتی ہیں۔

وہ یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کر دیا لیکن شرح السنہ میں بیان کی ہوئی یہ روایت اس طرح نہیں ہے جس طرح کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، شرح السنہ میں عرباض بن ساریہ سے منقول ہے کہ:

> ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں، میں دعا ہوں ابراہیمؑ کی، بشارت ہوں عیسیٰؑ کی اور اپنے ماں کا خواب ہوں (رویا امی) انہوں نے میرے پیدا ہونے کے زمانہ میں

دیکھا کہ ان سے ایک نور پیدا ہوا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔"

پس جن روایتوں میں حضرت آمنہ سے نور پیدا ہونے کا ذکر ہے ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ نے ایک ایسا خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا نہ تو تعجب انگیز ہے نہ خلاف قیاس ہے اور نہ ہی فطرت انسانی سے بعید۔"

(خطبات احمدیہ، ص ۲۳۲)

فرشتہ کے ذریعہ "احمد" نام کی تلقین: سر ولیم میور نے واقدی کا ایک بیان یہ نقل کیا ہے کہ "حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا"، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "حمد" کے مادے سے جو نام مشتق ہوتے ہیں وہ عرب میں رائج تھے مگر "احمد" نام عرب میں بہت کم ہوتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پانچ آدمی اور بھی گزرے ہیں جن کا نام "محمد" تھا، واقدی کے حوالہ سے وہ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے جنہوں نے یہود، نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سنا تھا کہ "عنقریب عرب میں ایک نبی اس نام کا ہونے والا ہے اور اکثر لوگ اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھا کرتے تھے اور ہر ایک امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخر الزماں ہونے کی عزت حاصل کرے گا" مگر سر سید کا خیال یہ ہے کہ:

"اگر حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے یہ کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا تو سر ولیم میور صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے؟ اگر توریت مقدس کی یہ آیت کہ "اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسماعیل رکھنا" (پیدائش باب ۱۶، آیت ۱۱) اور یہ آیت "اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارہ تیری بی بی کے بیشک ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام "اسحاق" رکھنا، (پیدائش باب ۱۷، آیت ۱۹) اور انجیل کی یہ

آیت ''اور اس کے (مریم کے) ایک بیٹا پیدا ہوگا اور تجھ کو (یوسف کو) چاہیے کہ اس کا نام عیسیٰ رکھے، کیوں کہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دے گا'') (متی باب ۱، آیت ۳۰) صحیح ہے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو وہ کس بنا پر اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ نظر آیا تھا اور اس نے اس لڑکے کا جو پیدا ہونے والا تھا احمد نام رکھنے کے لیے کہا۔

اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت یہ ہے کہ (بائبل کے) عہد عتیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے اور انجیل میں احمد کے نام سے ، اس لیے ان بشارتوں کے پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام بتا دیا جائے ، کیوں کہ یہ ایک ایسا نام تھا جس کو اہل عرب کبھی نہیں یا شاذ و نادر رکھتے تھے۔ (خطبات، ص ۳۴۷)

سر ولیم میور کے خیال میں ''انجیل یوحنا کے یونانی ترجمہ میں پیریکلی ٹوس تھا جس کے معنی تسلی دہندہ کے ہیں لیکن کسی جاہل یا متفنی راہب نے اس کو پیریکلیوٹوس کر دیا'' جس کے معنی ''احمد'' (تعریف کیا ہوا) ہیں ''مگر بقول سر سید انجیل کا صحیح لفظ پیریکلیوٹوس'' ہی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس کی عربی شکل فارقلیط پائی جاتی ہے ، (اصل یونانی نسخہ کی عدم موجودگی میں ظاہر ہے کہ عربوں کی روایت ہی قابل ترجیح ہوگی جو وہ فارقلیط کا لفظ استعمال کرتے تھے جو پیریکلیوٹوس کی عربی شکل ہے اور اس لفظ کے بارہ میں تاریخ کی یہ قدیم ترین شہادت بتلاتی ہے کہ یونانی نسخہ میں پریکلی ٹوس نہ تھا جس کا ترجمہ تسلی دہندہ کیا جاتا ہے)

سر ولیم میور کا یہ دعویٰ ''کہ عرب میں محمد نام کے اور لوگ بھی گزرے ہیں'' سر سید

کے نزدیک بے فائدہ ہے، اس لیے کہ علمائے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں اس نام کا اور کوئی نہیں ہوا، انہوں نے تو اس بات کے دریافت کرنے میں کامیاب کوشش کی کہ اس نام کے عرب میں اور لوگ بھی گزرے ہیں مگر:

> "یہ بات کسی طرح (بائبل کے) عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی" کیونکہ کسی لڑکے کے والدین نے اس کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام اس لڑکے کے نبی ہونے کے لالچ میں کیوں نہ رکھا ہو مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدائے تعالیٰ کو نبی آخرالزماں بنانا منظور تھا، ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے جب ہم ان بڑے بڑے کاموں پر غور کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے تھے اور وہ ایسے کام ہیں جو تمام جہان کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اور جب ہم اس روحانی کیف و سرور کو دیکھتے ہیں جو دین حق کا طفیل ہے اور جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں عام کیا تھا اور جو آئندہ نسلوں میں ورثہ کے طور پر آپ نے پیدا کیا اور جب ہم سچائی اور پاک بازی پر نظر ڈالتے ہیں جس کو آنحضرتؐ نے رائج کیا اور جو زمانہ کی گردشوں کے بعد بھی کامل اور بے عیب رہی ہیں اور ابدالآباد تک اصلی حالت پر اسی طرح رہیں گی تو ہم کو اس کا بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہدِ عتیق اور عہد جدید میں دی گئی تھی وہ وہی تھے جو عبداللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، صلی اللہ علیہ وسلم۔
>
> (خطبات احمدیہ، ص ۴۳۶)

اسپرنگر کی عجیب وغریب دریافت: مستشرقین نے ہر جگہ "عیب" کو دریافت

کیا ہے، چنانچہ حضرت آمنہ کا خواب میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا ان کے نزدیک صرع یعنی مرگی جیسے مرض کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے، جب کہ فرشتوں کو دیکھ کر خوف محسوس کرنا، سرسید کے نزدیک ''کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف اس واقعہ سے تو مزید اس بات کی تائید ہو جاتی ہے کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے خواب میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا'' سرسید فرماتے ہیں کہ:

> ''اس پر اسپرنگر صاحب کی عقل اور ایمان داری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کو ضعف دماغ اور صرع کی بیماری تھی جب کہ حضرت سارہؑ اور حضرت مریمؑ نے جو (بائبل کی تصریح کے مطابق) فرشتوں کو دیکھا تھا، اس کو صرع کی بیماری قرار نہیں دیتے۔'' (خطبات، ص ۲۳۶)

حضرت حلیمہؓ کے گھر میں برکت: حضرت حلیمہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں اپنے گھر پرورش کے لیے لے گئیں تو کئی طرح سے برکتیں ظاہر ہوئیں، مثلاً انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اب بچہ کو خوب سیر ہو کر دودھ پلا سکتی ہیں بلکہ اس قدر کہ وہ ان کے اپنے بچہ کے لیے بھی کافی ہو جائے گا، اونٹنی کا دودھ بھی بڑھ گیا، وہ بچہ کو لے کر چلیں تو سواری کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی اور مویشی بھی فربہ ہوتے چلے گئے اور کثرت سے دودھ دینے لگے، سر ولیم میور نے یہ اور اس طرح کے کئی واقعات غالباً تعجب انگیز سمجھ کر نقل کیے ہیں لیکن اس موقع پر سرسید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ ''سب باتیں ایسی ہیں جن کی سند بجز حلیمہؓ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے لیکن ایسے امور کا واقع ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے''، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ایسی باتوں کو عیسائی عالم بطور دور از قیاس باتوں کے بیان کرتے ہیں تو بلاشبہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ

لابان نے اس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھہر جا، کیوں کہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے'' (پیدائش باب ۳۰، آیت ۲۰) اور عیسائی عالم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوب نے کہا کہ میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا اور اب وہ کثیر التعداد ہو گیا ہے اور جب سے میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے، (پیدائش باب ۳۰، آیت ۳۰) اور اسی طرح پیدائش باب ۳۰، آیت ۳۶ سے ۴۲ تک کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی کو حضرت یعقوب کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ اگر خدا نے حلیمہؓ کے مویشی میں بھی برکت دی ہو تو اس کو دور از قیاس قرار دے کر تعجب انگیز طور پر بیان کیا جائے۔'' (خطبات، ص ۴۳۷)

حیات رسول ﷺ میں کسی مرض کی جستجو: سر ولیم میور اور کئی دوسرے مستشرقین کی دماغی صحت کا یہ حال ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز سیرت طیبہ، اعلیٰ کارناموں اور عظیم صفات کی اصل وجہ اور حقیقی سرچشمہ اس بیماری کو قرار دیتے ہیں جو صرع یعنی مرگی کے نام سے موسوم ہے اور اس طرح وہ دراصل اپنی سیاہ باطنی، اندھی عصبیت اور اپنی کوتاہ فہمی............یا بددیانتی کی آخری حد پر نظر آتے ہیں۔

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ ابن ہشام اور دیگر متاخرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حلیمہؓ کے شوہر کو یہ گمان ہوا کہ لڑکے کو ایک عارضہ (Fit) ہو گیا ہے، سر ولیم میور نے فٹ کا انگریزی لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی ہیں لغت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یک بارگی حملہ کے ہیں جس سے بدن کپکپانے لگے اور کبھی غشی طاری ہو جائے، اس سے موصوف نے غالباً صرع (مرگی) مراد لی ہے مگر سر سید فرماتے ہیں کہ:

''ہمارے پاس سیرت بن ہشام موجود ہے جو ڈاکٹر فرڈیننڈ وسن فینڈ کی نگرانی میں ۱۸۵۸ء میں گاٹجن میں چھپی ہے، اس کتاب سے ہم وہ عبارت نقل کرتے ہیں:

قالت وقال لی ابوہ یا حلیمة لقد خشیت ان یکون هذا الغلام قد اصیب فالحقیه باهله یعنی حلیمہ نے کہا کہ اس کے باپ (دودھ شریک باپ اور حلیمہؓ کے شوہر) نے کہا کہ اے حلیمہؓ! مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے، اس لیے اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے مگر جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آمنہ کے پاس لے کر آئیں تو حضرت آمنہ نے ان کو نہیں لیا اور حلیمہؓ سے کہا کہ اس کو واپس لے جاؤ اور فرمایا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے (یعنی تمہارا یہ خیال درست نہیں ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہؓ کے شوہر کو جو گمان ہو گیا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔''

سر ولیم میور نے ایک غلطی تو یہ کی ہے کہ اپنی کتاب کے صفحہ ۲۱ (حاشیہ) پر لفظ ''اصیب'' کو ''اسیب'' لکھا ہے، دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس سے وہ (Fit) یعنی مرگی جیسی بیماری مراد لیتے ہیں کہ ایک دو کے سوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھنے والے تمام عیسائی مصنّفین یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع (مرگی) کی بیماری لاحق تھی، بہت تلاش کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ خام خیالی عیسائیوں میں دو وجہ سے پیدا ہوئی، ایک تو ان کے مذہبی توہمات کی وجہ سے اور دوم عربی عبارت کے لاطینی میں غلط ترجمہ ہو جانے کی وجہ سے۔''

ڈاکٹر پوکاک نے تاریخ ابوالفداء کا لیٹن میں ترجمہ کیا جو ۱۷۲۲ء میں آکسفورڈ

میں شائع ہوا، اس میں فَالْحِقِيهِ کو "بِالْحَقِيَّةِ" بنا دیا گیا اور چونکہ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکا تھا، اس لیے ترجمہ میں اس کو تو چھوڑ دیا گیا اور "اصیب" جس کے معنی صرف بیماری کے ہیں، اس کے لیے لیٹن میں جو الفاظ درج ہوئے اس میں یہ ترجمہ کر دیا گیا کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے، اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع یا بیہوش کر دینے والی بیماری مراد لی ہے، حالاں کہ یہاں صحیح ترجمہ یہ تھا کہ "مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے، پس اس کو اس کے گھر والوں کے یہاں پہنچا دو"

عرب ان تمام بیماریوں کو جن کا سبب معلوم نہ ہوتا، خبیث روحوں اور شیطان کا اثر سمجھتے تھے، عیسائی مصنفوں نے اپنے وہمی ذہن سے یہ سمجھ لیا کہ یہ بیماری صرع تھی، حالانکہ عرب صرع ہی کو نہیں بلکہ ہر ایک پیچیدہ بیماری کو شیطان کا اثر سمجھتے تھے لیکن ایک عیسائی مؤرخ گبن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس بیماری سے متعلق لکھا ہے کہ "یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یونانیوں کا ایک نامعقول اتہام ہے" سر سید احمد خاں نے صرع کے بارے میں پہلے تو طبی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، چیمبرز ان سائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ صرع اس بیماری کو کہتے ہیں کہ جس میں سانس رک جانے اور اعصاب میں تشنج پیدا ہو جانے کی وجہ سے بے اختیار ہو کر شدت سے اعصاب پھڑ کنے لگیں اور کبھی سانس بالکل ہی بند ہو جائے، اس بیماری میں مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے، بسا اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے، اس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی، مردہ دلی اسے کاروبار سے معذور کر دیتی ہے، بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے، تمام جسم میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، ایسے مریض کے ذہن میں اپنی کمزوری کا یقین جم جاتا ہے اور اسے مشقت طلب کاموں سے نفرت ہو جاتی ہے، اس تفصیل کے بعد سر سید نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ:

"کوئی مورخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا کہ مذکورۂ بالا

اثرات میں سے ایک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا گیا تھا بلکہ اس کے برخلاف سب اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرست اور قوی تھے، خود سر ولیم میور کہتے ہیں کہ دو برس کی عمر میں حلیمہؓ نے ان کا دودھ چھڑایا اور ان کے گھر لے گئیں، آمنہ اپنے لڑکے کو تندرست اور قوی ہیکل دیکھ کر جو آپ سے دوگنی عمر والے لڑکے کے برابر معلوم ہوتی تھی، اس قدر خوش ہوئیں کہ ''حلیمہؓ سے کہا کہ اس کو پھر لے جا'' لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مضبوط، تندرست اور قوی تھے، بہت تیز چلا کرتے اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے، تمام عمر بھر ان کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں اور ان سب کو انہوں نے کمال صبر و استقلال سے برداشت کیا، انہوں نے خدائے واحد کی پرستش وعبادت کی تجدید ایسے طور پر کی جس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی، علم الٰہیات کو ایسے پختہ اور معقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر جہان سے معدوم ہے، انہوں نے قانون تمدن واخلاق کو ایسے کمال پر پہنچادیا جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا، ان کے ذریعہ انسانوں کی بہبود اور رفاہ کے لیے وہ ملکی و مالی، دینی و دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا جو اپنی نوعیت کا یکتا و بے نظیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرۂ عرب کو فتح کیا اور مختلف قبیلوں کو متحد کر کے ایک عظیم الشان مضبوط اور طاقتور قوم بنادیا، جس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بڑے حصہ کو معمولی عرصہ میں مفتوح ومسخر کرلیا، کیا یہ خیال عقل وانصاف کی رو سے درست ہوگا کہ ایسے نمایاں کارنامے ایک لاچار اور ناتواں، صرع کی

بیماری میں مبتلا شخص سے وجود میں آئے ہوں گے، ایسے نمایاں کارنامے
اسی شخص کے ذریعہ عمل میں آسکتے ہیں جس کی روحانی و جسمانی قوتیں
صحیح و سالم ہوں اور جس کو تائید ربانی حاصل ہو۔"

(خطبات احمدیہ، ص ۴۵-۲۳۰)

سرولیم میور کہتے ہیں کہ حلیمہؓ "پھر ایک مرتبہ بادل کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سر پر سایہ فگن دیکھ کر گھبرائیں اور انجام کار ان کو ان کے ماں کے پاس پہنچانے کے لیے روانہ ہوئیں" تعجب کی بات یہ ہے کہ بادل کو سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہؓ نے اور سرولیم کو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کا خیال آگیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اگر کبھی بادل کا ٹکڑا سایہ دار آگیا ہو تو یہ بات ناممکن نہیں، البتہ یہ خیال کہ آپ پر ہمیشہ بادل سایہ کیے رہتے تو اس کی کوئی سند نہیں ورنہ اکثر صحابہ اس کا ذکر کرتے اور مستند حدیثوں میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا۔

ایک مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی تھی سرولیم میور اسے بھی "صرع" کی بیماری کا اثر ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جس پر سر سید احمد خاں نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

"ہم سرولیم میور کی اس رائے کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
صرعی دوروں نے ان کے ذہن میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا اور ان
کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا، تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں
کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ بات
قرین قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر آدمی مصروع جانتا ہو اپنے صرعی
غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرے اور جو شخص
اپنی قوم کی بت پرستی کو مٹانے کے لیے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ اس کی

بیماری سے واقف ہوں لیکن اس کے باوجود اس کے عزیز و اقارب اور
عرب کے تمام بڑے بڑے لوگ اس کی رسالت کو دل سے تسلیم کر لیں
اور اپنے آبائی مذہب اور قدیم رسموں کو چھوڑ کر اس شخص کے قول و فعل پر
کامل ایمان لے آئیں۔" (خطبات، ص ۴۷۷)

اہل کفر کے لیے دعائے مغفرت: سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ "ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں، پیغمبر صاحب کے حکموں کی سختی اور شدت کی ایک عجیب مثال ہے" مگر سر سید فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور انبیائے سابقینؑ کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مر گئے ہوں، کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے بلکہ یہ بات زندہ آدمیوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لیے ایک نہایت کار آمد اور عمدہ ذریعہ ہے، مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے تو "رحم دل" عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے لیے جو اگرچہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں مگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں، کیسا نرم، فیاضانہ اور رحم دلی کا سلوک کیا گیا ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں بلکہ سر سید کے اپنے الفاظ میں:

"ہماری توقع کے خلاف "رحم دل" عیسائی مذہب میں غیر عیسائیوں
کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے، اس کا ایک نمونہ یہ
ہے کہ اتھینیسین خطبہ میں جو انگلستان کے تمام پرٹسٹنٹ گرجاؤں میں
متعین دنوں میں پڑھا جاتا ہے اور تمام اہل کلیسا کے اتفاق سے منظور ہوا
ہے، ان سب عقیدوں کو بیان کرنے کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر فرض ہے،

صاف طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ یہ عیسوی عقیدہ ہے جس پر عقیدہ رکھے بغیر کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا" تو جب کہ "رحم دل" عیسوی مذہب کے مطابق ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے اور اسی لیے کسی کی دعائے مغفرت بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے تو عیسوی مذہب کو اس بارہ میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے؟" (خطبات، ص ۷۴۹)

سامان خورد و نوش میں برکت: سر ولیم میور اپنی کتاب میں ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پر موجود نہ ہوتے تو تمام خاندان کے لوگ اپنے کفایت شعار کھانے سے (فارغ ہونے پر بھی) بھوکے ہی اٹھتے تھے لیکن جب پیغمبرؐ صاحب بھی کھانے میں شریک ہوتے تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا"

پھر سر ولیم میور اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ اس بات کو عروج پذیر نبی کی بڑائی اور عظمت خیال کیا جاتا لیکن سر ولیم میور نے اس موقع پر بھی اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی مذہبی روایات کو نظر انداز کر دیا ہے، چنانچہ سر سید احمد فرماتے ہیں کہ:

"ہم کو تعجب ہے کہ عیسائی ایسی روایتوں کو اعتراض کی نیت سے نقل کرتے ہیں (حالانکہ) ان کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ وہ متی باب ۱۴، آیت ۱۹، ۲۰ کے اس بیان کو مانتے ہیں کہ (حضرت مسیحؑ نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی اور ان کو توڑا اور اپنے حواریوں کو دیں اور حواریوں نے جماعت کو تقسیم کر دیں اور ان سب نے پیٹ بھر کے کھائیں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے، اٹھالیا۔"

آنحضرتؐ کے سفر شام سے نبوت کا تعلق : سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام کے متعلق ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ:

"جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام کو گئے تو بحیرہ راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور لوگوں کے درمیان اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ آپ کے سر پر ایک بادل سایہ کیے ہوئے چلتا تھا اور درختوں کی شاخیں آپ کے اوپر دھوپ روکنے کے لیے جھک جاتی تھیں اور بحیرہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیے اور مہر نبوت کو معلوم کرنے کے لیے آپ کے جسم کا معائنہ کیا۔"

شام کے اس سفر میں سر ولیم میور کا یہ خیال ہے کہ:

"زمانۂ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مقامات نے جن کو خیالی قصوں، عجیب و غریب بیانات اور دلکش روایتوں نے اور بھی مؤثر بنا دیا تھا اور گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں، آراستہ مذہبی نشانات و آثار اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کرنے والے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا اور پائیدار اثر ڈالا تھا۔"

سر سید نے سر ولیم میور کے جواب میں اول تو ترمذی کی یہ روایت پیش کی ہے کہ "ابو طالب نے محمد سردار دو عالم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو بکرؓ اور بلالؓ کے ہمراہ شام سے واپس بھیجا تھا" وہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے اور بلالؓ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بارہ سال کی تھی، اس لیے آپ کو ان دونوں حضرات کے ساتھ شام سے واپس بھیجنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا لیکن اگر اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تب

بھی سرسید کے نزدیک یہ بات ہرگز لائق تعجب نہیں ہے کہ بحیرہ راہب کو آپؐ کے بارہ میں نبی ہونے کا گمان ہوا ہو، کیوں کہ اس وقت یہود و نصاریٰ ایک مسیحا اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے، مگر یہ بات کہ بارہ سال کی عمر میں آپ نے محض ایک ہی سفر میں اور معمولی سے وقت میں بحیرہ راہب سے نبوت کا کامل سبق پڑھ لیا اور تقریباً تیس برس کے بعد اس کو اچانک لوگوں کے سامنے پیش فرمایا، یہ بات سر ولیم میور کے شرانگیز لیکن زرخیز ذہن کی پیداوار تو ہوسکتی ہے لیکن کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ اور پھر سر ولیم میور یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرگی زدہ شخص تھے، اس موقع پر سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ:

''ہم سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کرسکتا ہے اور کیا ایک مصروع شخص کے دل و دماغ میں غور و فکر کی اس قدر صلاحیت ممکن ہے، اگرچہ سر ولیم میور کا یہ بیان نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کرسکتے، کیونکہ اسی لڑکے نے ''جس کا دماغ صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامتوں کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا تھا'' بعد میں انہی چیزوں کی مخالفت کی، صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، ان کی پرستش سے منع کیا اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے، تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا۔

لیکن اس بات کو تسلیم کرکے کہ مذکورۂ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر درحقیقت اثر ڈالا تھا، ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر وہ آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا، صرف بارہ برس کی عمر میں وہ ایک دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گزری

تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے، گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامات تک وہ اس قدر عقل وفہم وذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں کو دیکھ کر انہی کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات پیش کر سکا، وہ لڑکا بلاشبہ مادرزاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی اور وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰ نے یہ کہہ کر بشارت دی تھی کہ ''سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لیے ضرور ہے، کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (یعنی احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ سلم) تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔''

(خطبات احمدیہ، ص ۲۵۷)
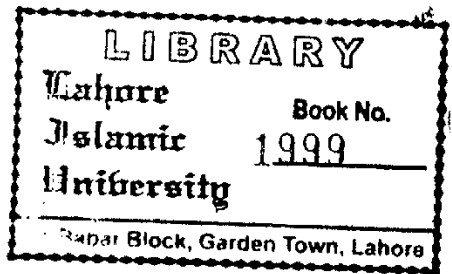
ISLAM
aur
MUSTASHRIQEEN

Vol- 3

Sayid Sabahuddin Abdur-Rahman

ISBN : 978-93-80104-93-5
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O. Box No. : 19
Shibli Road, Azamgarh - 276 001 (U.P.)
Email : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org